جلد ۱۱۰ ماہ جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۲ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

شملہ کانفرنس پر ساری دنیا کے امن پسند ملکوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں، اگرچہ ابھی اہم متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ نہیں ہوسکا، اور ایسے پیچیدہ مسائل کا تصفیہ اس قدر جلد ہو بھی نہیں سکتا تھا، مگر ایسی بنیادی باتوں پر دونوں کا اتفاق ہوگیا ہے جس سے آئندہ مصالحت کی راہ ہموار ہوگئی ہے، اس کانفرنس کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے، امید ہے کہ جلد ہی دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات قائم ہوجائیں گے، اور ڈاک و آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوجائے گا، اس کامیابی میں مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو دونوں کے تدبر کو دخل ہے، اور مسز اندرا گاندھی کی کشادہ دلی خصوصیت سے لائق تحسین ہے، اگر اسی جذبہ سے کام لیا جائے تو متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ بھی دشوار نہیں ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ دونوں ملکوں کی فلاح امن و صلح پر موقوف ہے، دونوں کو اس کا تجربہ ہوچکا ہے کہ جنگ سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں، پاکستان ہندوستان کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے بہت چھوٹا ملک ہے، تنہا اس میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں، اور دوسروں کے سہارے کا اس کو پورا تجربہ ہوچکا ہے، اس لئے اس کیلئے امن و صلح کے سوا سلامتی کی کوئی راہ نہیں ہے، ہندوستان سے جنگ کرنا اس کیلئے خودکشی ہوگی، ہندوستان اگرچہ پاکستان سے بڑا ملک ہے لیکن جنگ و دائمی کشمکش اور بے اعتمادی کی فضا میں وہ بھی امن و سکون سے نہیں رہ سکتا، اس لئے اس کے لئے بھی صلح و مفاہمت ہی کی راہ مفید ہے، ہندوستان اور پاکستان اگرچہ سیاسی حیثیت سے دو ملک ہوگئے، لیکن جغرافی حیثیت سے ان میں ایسی وحدت ہے کہ دونوں کا استحکام اور ترقی ان کے اتحاد و اتفاق ہی پر موقوف ہے، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ و کشمکش کا خمیازہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے، اس لئے اس مصالحت سے ان کو خصوصیت کے ساتھ زیادہ مسرت ہے۔

آج کل قوم پرستی، فرقہ پرستی اور سیکولرزم کا بیجا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم اور منشا سمجھنا مشکل ہے، جہاں کسی اقلیت نے اپنے کسی حق کا مطالبہ کیا خواہ وہ کتنا ہی جائز اور دستوری کیوں نہ ہو، اس کو

قومیت اور سیکولرزم کا مخالف اور فرقہ پرستی کا مجسم قرار دیا گیا، اردو زبان کا مسئلہ ہو یا پرسنل لا کا، تعلیم کا ہو یا مسلم یونیورسٹی کا، سب پر فرقہ پرستی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثریت کی مرضی کا نام قوم پروری ہے، اور اقلیت کے مطالبات کا فرقہ پرستی،

ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے ملک کے سارے باشندوں کو اس کا شہری اور ملکی حقوق میں برابر کا حصہ دار مانا ہے، اور اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کے تحفظ کی پوری ضمانت دی ہے، اگر کسی سبب سے اس پر عمل میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس کا مطالبہ اور اسکے لئے پرامن احتجاج کو فرقہ پرستی کس طرح کہا جا سکتا ہے، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ تو جمہوریت اور سیکولرزم کی جان ہے، اور اس کے لئے کوشش اسکی بہت بڑی خدمت اور تحفظ وہی معتبر مانا جائیگا جس کا خود اقلیتوں کو اعتراف ہو، ہندوستان میں صحیح معنوں میں سیکولرزم اسی لئے قائم نہیں ہو سکی کہ اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کیا گیا،

سیکولرزم کا مفہوم یوں تو بہت وسیع ہے لیکن زیر بحث معاملہ میں اس کا تعلق صرف حکومت اور ملکی معاملات سے ہے، سیکولر حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کوئی مذہب نہیں، اسکی نگاہ میں سارے مذاہب اور ان کے ماننے والے برابر اور ملکی حقوق میں یکساں ہیں اور وہ مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، سیکولر نقطۂ نظر کے معنی یہ ہیں کہ ملکی معاملات کو مذہبی نقطۂ نظر کے بجائے ملک کے مصالح اور مفاد کے لحاظ سے دیکھا جائے، اسمیں اقلیتوں کے مذہبی لسانی، و تہذیبی حقوق کہیں سے نہیں آتے کیونکہ خود سیکولر دستور نے انکے تحفظ کی ضمانت دی ہے، اسلئے انکا مطالبہ اور اس کیلئے آئینی احتجاج کسی حیثیت سے بھی سیکولرزم کے خلاف نہیں ورنہ پھر جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ میں فرق کیا رہجاتا ہے، قومی وحدت اور سیکولرزم کا دائرہ اتنا وسیع کر دینا کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے باہر نہ رہجائے، نہ صحیح ہے، اور نہ ملک کے لئے مفید، قوم پروری اور سیکولرزم کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک رنگ میں رنگ دیئے جائیں، ایسی وحدت و یکرنگی تو سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے، صحیح سیکولرزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ملک کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کو اپنی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے، وطنی حیثیت اور مشترک ملکی مفاد کے لحاظ سے بلاشبہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک قوم ہیں لیکن مذہبی، تہذیبی اور لسانی حیثیت سے ان میں اتنا اختلاف ہے کہ مسلمان تو مسلمان

سارے ہندوؤں کو بھی ایک قوم کہنا مشکل ہے، چنانچہ خود ہندوستان کے بہت سے مفکرین کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک قومی ملک نہیں بلکہ مختلف قوموں کا مجموعہ ہے، اسلئے ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش جمہوریت اور سیکولرزم کے بھی خلاف ہے، اور ملکی مفاد کے بھی، ملک کی بہی خواہی اسی میں ہے کہ ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش نہ کیجائے، بلکہ ہر فرقہ کو اس کی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع دیا جائے،

اس کا اعتراف ہے کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت اور اکثریت کے کچھ مسلمان بھی ہمنوا بن جاتے ہیں، مگر اُن کی کوئی حیثیت نہیں جیسے ہر زمانہ میں رہی ہے، اور حکومتیں اُن کی پرورش کرتی اور اُن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں، ان کا کام ہی حکومت سے خود فائدہ اٹھانا اور اس کو فائدہ پہنچانا ہے، غیر مذہبی معاملات تو الگ رہے، مذہبی معاملات میں بھی ایسے لوگ حکومت کے اشارے کے پابند ہوتے ہیں، اور قرآن مجید کے صریحی احکام کو بھی قابلِ ترمیم بلکہ مذہب اسلام کو نام نہاد ترقی کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں، یہ لوگ مسلمان کب ہیں، اور ان کو مسلمانوں کی ترجمانی کا کیا حق ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت انہی کو ان کا نمائندہ سمجھتی ہے،

اگر حکومت کا مقصد مسلمانوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ وہ واقعی اُن کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو اس کو قوم پروری، فرقہ واریت اور دستوری حقوق کے مطالبہ میں فرق کرنا چاہئے، مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگا کر ان کو خاموش تو کیا جا سکتا ہے لیکن مطمئن نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں اُن کے اصلی نمائندے اور ترجمان علماء اور دیندار مسلمان ہیں اور دوسرے مسائل میں مسلم عوام، اسلئے ان دونوں معاملات میں علماء اور مسلم عوام کی رائے معتبر ہے، نام نہاد مسلمانوں کی نہیں، ہندوستان کی حکومت جمہوری ہے اسمیں فیصلہ جمہور کی رائے سے ہوتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے معاملات میں بھی جمہور مسلمانوں کی رائے اصل ہے، اکّے دکّے اشخاص کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ احتجاج میں کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے حکومت کے لئے دشواری پیدا ہو بلکہ اپنا مطالبہ جمہوری طریقہ سے پیش کریں،

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

از
جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

۲- زندگی کی حیثیت

زندگی کی حیثیت

(۱) زندگی کا مالک انسان نہیں بلکہ اللہ ہے،

انّ اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم[۱]	بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی زندگیوں کو خرید لیا ہے،

(ب) زندگی فعل عبث نہیں، بلکہ ایک فرض و امانت ہے۔

افحسبتم انّما خلقنٰکم عبثًا وانّکم الینا لا ترجعون[۲]	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے،

(ج) زندگی ۔۔ خود مختار و آزاد نہیں، بلکہ اس کے لئے قوانین مقرر ہیں،

---

[۱] توبہ - ۱۱۱ [۲] مومنون - ۶

ایحسب الانسان ان یترک سُدیً[1] — کیا انسان کا خیال ہے کہ اس کو یونہی آزاد چھوڑ دیا جائے گا،

(۳) زندگی کے فرائض

فرائض کے دو حصے ہیں

فرائض کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) کائنات سے متعلق اور (۲) انسان سے متعلق،

کائنات سے متعلق فرائض — پہلے حصہ میں مثلاً

(۱) قوت وطاقت اور اختیار کو استعمال کر کے کائنات کی چیزوں کو مفید بنانا،

وَلقد مکّنّٰکم فی الارض و جعلنا لکم فیھا معائش[2]، — ہم نے تمھیں زمین میں قدرت و طاقت اور اختیار کے ساتھ بسایا اور تمھارے لئے اس میں زندگی کے سامان پیدا کئے،

وقل اعملوا فسیری اللّٰہ عملکم ورسولہٗ والمومنون[3] — آپ کہہ دیجئے کہ کام کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین کام کو دیکھیں گے

(ب) ذریعۂ معاش کو اس قدر وسعت دی کہ کوئی محروم نہ رہنے پائے،

وجعلنا لکم فیھا معایش و من لستم لہ برازقین[4] — اور ہم نے تمھارے لئے معیشت کا سامان مہیا کر دیا، اور ان کے لئے بھی جنھیں تم دینے والے نہیں ہو،

والارض وضعھا للانام[5] — اور زمین کو اللہ نے مخلوق کی نفع کے لئے

۱؎ القیامہ ۲؎ اعراف ع ۱ ۳؎ التوبہ ۴؎ حجر ع ۳ ۵؎ رحمٰن ع ۱

(ج) جدوجہد اور محنت سے کائنات کی چیزوں کو ترقی دینا،

وان لیس للانسان الا	انسان کو وہی ملتا ہے جس کی
ما سعی[1]	وہ سعی کرتا ہے،
نوف الیھم اعمالھم[2]	عمل کے نتائج ہم پورے پورے دیتے ہیں،

حالات کے لحاظ سے قوت و طاقت کے سامان بدلتے رہتے ہیں، مثلاً اس زمانہ کے فوجی اسلحہ میں بندوق رائفل مشین گن، میزائل، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں وغیرہ ہیں، اور غیر فوجی اسلحہ میں سائنس ٹیکنالوجی صنعت حرفت تجارت، صحافت، لٹریچر اور تمام علوم و فنون ہیں جن سے جدید تمدنی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے،

فرائض کی ادائگی میں اللہ کی مرکزیت اور اس کی ماتحتی مسلم ہونی چاہئے

کائنات سے متعلق فرائض کی ادائگی اور ہر جدوجہد عمل میں اللہ کی ذات کی مرکزیت اور اسکی ماتحتی مسلم ہونی چاہئے، ورنہ اُن کے بھیانک نتائج سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ رہے گی، جس کا مشاہدہ موجودہ مادی تہذیب میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے قرآن حکیم کی جن آیتوں میں نظام کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی، اس پر غور و فکر کی دعوت یا تسخیر کائنات کی خبر دی گئی ہے ان سب میں تقریباً کسی نہ کسی عنوان سے اللہ کا ذکر ضرور آگیا ہے، جس سے اس کی طرف اشارہ ہے، کہ کائناتی جدوجہد میں مرکزی نقطۂ نگاہ اللہ کی ماتحتی ہونی چاہئے، اس کے بعد عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی ہے، اور مزید ہدایتوں کی ضرورت نہیں،

انسان سے متعلق فرائض

دوسرے حصہ میں مثلاً:-

---

[1] النجم ع-۳- [2] ھود- ع-۲،

ہر فرد کو دوسرے سے اس طرح وابستہ سمجھنا کہ کسی ایک کا ناحق قتل گویا پوری نوع انسانی کو قتل کرنا اور کسی ایک کو ہلاکت سے بچا لینا گویا تمام نوع انسانی کو بچا لینا ہے قرآن حکیم میں ہے،

من قتل نفسًا	جس شخص نے کسی کو ناحق قتل کیا
بغیر نفس او فساد فی	تو گویا اُس نے تمام نوع انسان
الارض فکانما قتل الناس	کا خون کیا، اور جس نے کسی کی
جمیعا ومن احیاھا فکانما	زندگی بچا لی، تو گویا اُس نے نوع
احیا الناس جمیعا، [۱]	انسان کو زندگی دیدی،

(۳) ہر فرد کو دوسرے کی نگہداشت کا ذمہ دار سمجھنا، یہ نگہداشت جس طرح مادی وجسمانی ہوتی ہے، اسی طرح اخلاقی وروحانی، پھر جس کو جس درجہ کا قرب ہوگا، اسی کا لحاظ سے ذمہ داری میں تقدم حاصل ہوگا،

مادی وجسمانی فرائض کلام مجید میں مادی وجسمانی فرائض کے بارے میں ارشاد ہے،

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا	اللہ کی عبادت کرو کسی کو اس
بہ شیئا وبالوالدین احسانا	کے ساتھ شریک نہ کرو، ماں باپ
وبذی القربی والیتمٰی و	کے ساتھ قرابت داروں کے
والمساکین والجار ذی	ساتھ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ،
القربی والجار الجنب و	پڑوسیوں کے ساتھ خواہ قرابت
الصاحب بالجنب وابن	دار ہوں یا اجنبی ہوں، پاس

[۱] المائدہ ۔ ع ۔ ۵ ۔

السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ[1]	کے اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں یا تمھارے قبضہ میں ہوں احسان اور سلوک کے ساتھ پیش آؤ،

دوسری جگہ ہے،

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ	قرابتداروں کو اُن کا حق دو،
وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	اور مسکین و مسافر کو دو، اور
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا[2]	فضول خرچی نہ کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتحتوں کے بارے میں فرمایا،

هُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ	وہ تمھارے بھائی ہیں، اللہ نے ان
تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ	کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے جس
اَخَاهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ	کے ماتحت اللہ اُس کے بھائی کو
مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا	کرے تو چاہئے کہ جو خود کھائے
يَلْبَسُ وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ	وہ اپنے بھائی کو کھلائے، جو
مَا يَغْلِبُهٗ فَاِنْ كَلَّفَهٗ مَا	خود پہنے وہ اُس کو پہنائے اور
يَغْلِبُهٗ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ[3]	اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کے سپرد نہ کرے، اور اگر سپرد کرے تو خود اُس کی مدد کرے،

---

[1] النساء ع-۶، [2] بنی اسرائیل ع-۳، [3] بخاری کتاب الایمان،

عورتوں کے ساتھ خصوصیت سے حسنِ معاشرت کا حکم ہے،

وعاشروھن بالمعروف	عورتوں کے ساتھ معاشرت میں
فان کرھتموھن فعسیٰ	حسنِ سلوک کو ملحوظ رکھو، اگر تم
ان تکرھوا شیئًا ویجعل	ان کو ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے
اللہ فیہ خیرًا کثیرًا[۱]	تم ایک بات کو ناپسند کرو۔۔۔
	اور اللہ نے تمہارے لئے اس میں
	خیر کثیر رکھا ہو،

دوسری جگہ ہے:

لینفق ذو سعۃ من سعتہٖ	وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق
ومن قدر علیہ رزقہ	خرچ کرے اور جس کو کم روزی ملی ہے
فلینفق مما اتٰہ اللہ[۲]	تو وہ اللہ کے دیے ہوئے کے مطابق
	خرچ کرے،

آخری حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

فاتقوا اللہ فی النساء فانکم	عورتوں کے معاملہ میں تم اللہ سے
اخذ تموھن بامان اللہ[۳]	ڈرو، تم نے ان سے اللہ کے عہد کے
	ساتھ معاملہ کیا ہے،

عام انسانوں کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا،

---

۱ النساء - ع - ۳　۲ الطلاق - ع - ۱　۳ مسلم ومشکوٰۃ باب حجۃ الوداع،

من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته[۵۱]

جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگتا ہے، اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگتا ہے۔

دوسری جگہ ہے :۔

لا يومن عبد حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه[۵۲]

بندہ پورا مومن اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے،

اخلاقی وروحانی فرائض

اخلاقی وروحانی فرائض کے بارے میں ہے،

يا ايها الذين آمنوا قوا انفسكم واهليكم نارا[۵۳]

اے ایمان والو! اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ،

دوسری جگہ ہے،

وتعاونوا على البر والتقوى[۵۴]

نیکی اور تقوی کی چیزوں میں ایک دوسرے کی مدد کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته[۵۵]

غور سے سن لو تم سب نگراں (چرواہا) ہو اور سب سے اسکی رعیت کی نگرانی سے متعلق بازپرس ہوگی،

---

[۵۱] بخاری مسلم مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الاول [۵۲] ایضاً [۵۳] التحریم ع۔ [۵۴] المائدہ ع۔ ۱، [۵۵] بخاری کتاب النکاح، باب المرأۃ راعیۃ،

اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح ،

اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ، ۵۱

تم کمال نیکی نہیں حاصل کرسکتے ہو جب تک اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو ،

انصار صحابہ کی سب سے بڑی صفت ایثار و ترجیح بیان کی گئی ہے ، جس سے اس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے ،

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ۵۲

وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں ، اگرچہ اُن کو فاقہ ہو ،

دوسروں کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو نظر انداز کرنے کا حکم

دوسروں کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کے باوجود حسن سلوک کو برقرار رکھنا قرآن حکیم میں ہے ،

ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمسٰکین والمھٰجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم ۵۳

جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں ، وہ قرابت داروں اور مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ ان کو معاف اور درگذر کرتے رہیں ، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کردے ، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۔

---

۵۱ آل عمران - ۹ ۵۲ حشر - ۱ ۵۳ نور - ۳

اس آیت کا پسِ منظر یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جھوٹی تہمت
ئی جس میں حضرت ابوبکرؓ کے بعض رشتہ دار بھی ملوّث تھے، جن کی وہ مدد اور کفالت
ِتے تھے، حضرت صدیقہؓ کی براءت ثابت ہونے کے بعد طبعی طور پر حضرت ابوبکرؓ کو
ساس ہوا، انھوں نے ان عزیز کی امداد نہ کرنے کی قسم کھائی، اُن کو دیکھ کر بعض
سرے صحابہ نے بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا، اس پر یہ
یت نازل ہوئی، کہ دوسروں کا رویہ اپنی جگہ ہے لیکن تم اس سے اپنا رویہ متاثر
نے دو، بلکہ صرف اللہ سے رضا جوئی اور صلہ کی امید رکھو،

معاشرتی نظم کو برقرار رکھنے کے لئے چند چیزوں کی ضرورت ہے،	معاشرتی نظم کو برقرار رکھنے کے لئے بالعموم درج ذیل چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے،

۱۔ عزت و شرف کا ایسا معیار ہو، جو سب میں مشترک اور سب کے لئے مساوی ہو،
۲۔ حسب و نسب رنگ و نسل اور قوم و وطن کے بتوں کا خاتمہ
۳۔ میل جول و ملاقات میں عملاً مساوات،

تشکیل جدید میں ان چیزوں کی طرف جس قدر توجہ دی گئی ہے اس کا اندازہ
ل کی تفصیلات سے ہوگا،

عزت و شرف کا صحیح معیار ۱۔ عزت و شرف کے لئے حسب و نسب اور دولت و وجاہت
کے بجائے اخلاق و کردار کا معیار مقرر کیا گیا، جو اختیاری ہونے کے ساتھ سب
کے لئے قابلِ قبول ہے، قرآن حکیم میں ہے،

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم — اللہ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو تم میں
زیادہ متقی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لیس لاحد علیٰ احد فضل	کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت صرف
الا بدین وتقویٰ،[1]	دین اور تقویٰ کی بنا پر ہوتی ہے،

حسب ونسب وغیرہ کا خاتمہ (۲) حسب ونسب وغیرہ کے بتوں کا خاتمہ حد درجہ مشکل کام ہے چنانچہ ہر دور میں مختلف تدبیروں کے باوجود اس میں ناکامی ہوئی ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو و بیرونی زندگی میں ایسی تدبیریں اختیار کیں، جن سے ادنیٰ و اعلیٰ دونوں محسوس کرنے لگے کہ خود ساختہ بلندیوں اور پستیوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی، اس کے لئے پہلے ذہنی وفکری اصلاح کی گئی، پھران اضافتوں کے بے اثر ہونے کا اعلان کیا گیا،

قرآن حکیم میں ہے

وجعلناکم شعوبا وقبائل	اور ہم نے تمہاری ذاتیں اور قبیلے محض
لتعارفوا،	اس لئے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی
	پہچان ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لا فضل لعربی علی عجمی ولا	کسی عربی کو عجمی (غیر عربی) پر اور
عجمی علیٰ عربی،[3]	عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے،

رنگ اور زبان کے بارے میں ہے،

ومن آیاتہ خلق السمٰوٰت و	اور اللہ کی نشانیوں میں زمین و

---

[1] مشکوٰۃ فی شعب الایمان [2] الحجرات ع - ۲ - ...

الارض واختلاف السنتکم والوانکم[۱] — آسمان کی پیدائش اور زبان ورنگ کا اختلاف ہے،

مذکورہ امتیازات شادی بیاہ میں زیادہ نمایاں ہوتے اور اپنے اندر مختلف قسم کی پیچیدگیاں رکھتے ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے سب سے پہلے اپنے گھر میں ان بتوں کو توڑا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح ایک آزاد غلام زیدؓ بن حارثہ سے کیا اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے "عاصم" کا نکاح ایک دودھ فروش کی بیوہ لڑکی سے کیا، دونوں واقعات مشہور ہیں، گھر کی اصلاح کے بعد حضرت عمرؓ نے ولی کی مرضی کے خلاف غیر کفو میں نکاح کا حکم دیا، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوگا، موالی (آزاد شدہ غلاموں) میں سے ایک مالدار شخص نے قریشی کی بہن کا پیغام بھیجا، قریشی نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ

ان لنا حسباً و انہ لیس لھا بکفو، — ہم حسب نسب والے ہیں، وہ لڑکی کا کفو نہیں ہے،

اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی، تو آپ نے قریشی کو بلا کر کہا کہ وہ شخص مالدار بھی، اور پرہیزگار (متقی) بھی، اگر بہن راضی ہے تو اس کا نکاح کر دو، بھائی نے بہن سے پوچھا تو وہ راضی ہوگئی، اور نکاح کر دیا گیا[۲]،

فقہاء نے "کفو" پر طویل بحث کی ہے، جس کی موجودہ دور میں قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ بحث حالات کے ساتھ سمجھوتہ کا نتیجہ ہے، کوئی شرعی فیصلہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا، اور فقہاء کے درمیان اس میں کافی اختلاف ہوا،

---

[۲] ازالۃ الخفاء، مقصد دوم سیاست فاروق اعظم رضؓ،

کفارت میں حریت، نسب، پیشہ، مالی، عمر اور دین (اخلاق و کردار) کا اعتبار کیا جاتا ہے لیکن دین کے علاوہ حالات کے لحاظ سے سب میں اختلاف ہے، دین پر اتفاق اور سب میں اختلاف خود اس کی دلیل ہے، کہ شرعی حیثیت صرف دین کو حاصل ہے، اور بقیہ کی حیثیت محض ازدواجی زندگی خوشگوار بنانے کی ہے، اس زمانہ میں کفارت میں مذکورہ چیزوں کے اعتبار سے ازدواجی زندگی تلخ ہوتی، اور اسلامی زندگی پر حرف آتا ہے، اس لئے تشکیل جدید میں عہد نبوی کے مطابق دین کے ساتھ معاشرتی حیثیت (sTaTus) کا لحاظ کافی ہوگا اور اس میں تعلیم و معاش کو حالات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت ہوگی. اس سے ازدواجی زندگی خوشگوار بنانے میں مدد ملتی ہے،

میل جول اور آپس میں ساوات | (۳) میل جول اور ملاقات میں مساوات پر عمل درآمد کا اندازہ ان واقعات سے ہوگا، کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے سرداروں سے اسلام پر گفتگو فرمارہے تھے، اتنے میں ایک شکستہ حال نابینا صحابی (ابن ام مکتومؓ) تشریف لائے اور انھوں نے کچھ معلوم کرنا چاہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مداخلت ناگوار ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

عبس و تولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ	آپ چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیرلیا،
وما یدریک لعلہ یزکی او یذکر	اس بات سے کہ آپ کے پاس نابینا
فتنفعہ الذکریٰ اما من	آیا، آپ کو کیا معلوم کہ وہ اپنی درستی
استغنیٰ فانت لہ تصدیٰ	کرلیتا یا غور و فکر کرتا، اور آپ کی یہ
وما علیک الا یزکیٰ و اما	کا سمجھانا نفع دیتا، جو پروا نہیں کرتا
من جاءک یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت	اس کے پیچھے پڑتے ہیں، حالانکہ اس کے

عَنۡہُ تَلَهّٰی [1]	درست نہ ہونے کا الزام آپ پر نہیں ہے اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور ڈرتا ہے، اس سے آپ اعراض کرتے ہیں

مساوات کے لئے امتیاز کو مٹانا معاشرہ میں جب معمولی فساد ہو تو اصلاح کی معمولی تدبیروں سے کام چل جاتا ہے لیکن جب یہ فساد قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے، تو اعتدال پیدا کرنے کے لئے سخت اقدامات اور عملاً پست کو بلند اور بلند کو پست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام، ابوسفیان بن حرب اور قریش کے دوسرے رؤسا، حاضر ہوئے، اسی وقت صہیب بلالؓ اور دوسرے آزاد شدہ غلام بھی آگئے، حضرت عمرؓ نے ملاقات میں ان غلاموں کو سرداران قریش پر ترجیح دی، اس پر ابوسفیان نے کہا،

لم ار کالیوم قط یاذن لھولاء العبید ویترکنا علی بابہ لا یلتفت الینا،	ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا، ان غلاموں کو اجازت ملتی ہے، اور ہم دروازے پر کھڑے رہتے ہیں، ہماری طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی،

سہیل زیادہ سمجھدار تھے، انھوں نے کہا یہ سچ ہے لیکن ہم کو عمر کی نہیں بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہئے، اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا، ان میں سے جو اپنی شامت سے پیچھے رہ گئے، وہ آج بھی پیچھے رہنے کے مستحق ہیں، [2]

معاشرتی نظم میں خلل ڈالنے والی چیزوں سے تزکیہ معاشرتی نظم میں جو چیزیں رخنہ ڈالنے والی

---

[1] عبس ع ۱ - [2] اسد الغابہ ج ۲ تذکرہ سہیل بن عمرو،

تھیں، ان سے تزکیۂ نفس کا حکم دیا گیا، تزکیہ کے معنی کسی کو اس حد تک صاف ستھرا بنانا کہ وہ نشو و نما کے قابل بن سکے، مثلاً زمین کا تزکیہ گھاس پھوس صاف کرنا، اس کو برابر کرنا، کھاد ڈالنا، اور آبپاشی کر کے اس قابل بنانا کہ وہ تخم کو نشو و نما دے سکے، اسی طرح نفس کا تزکیہ فکری و عملی خرابیوں کو دور کر کے انسان کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق نشو و نما پا سکے، تزکیہ کی مشابہت بڑی حد تک علم طب سے ہے، جس طرح طب کا تعلق جسم کی بیماریوں اور ان کے علاج سے ہے، اسی طرح تزکیہ کا تعلق روح کی بیماریوں اور ان کے علاج سے ہے، اس کی ضرورت زندگی کے تمام شعبوں میں ہوتی ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم مقصد تزکیہ قرار دیا گیا، اور قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ویزکیکم یا ویزکیھم کا ذکر کیا گیا ہے، اس موقع پر صرف ان چیزوں کا بیان کرنا مقصود ہے جو معاشرتی تعلقات میں رخنہ ڈالنے والی ہیں اور تشکیل میں ان سے صفائی و ستھرائی کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں مثلاً

مذاق اڑانا، طعن و تشنیع کرنا اور غیبت وغیرہ کی ممانعت	کسی کا مذاق اڑانا، طعن و تشنیع کرنا، برے خطاب سے مخاطب کرنا، بدگمانی، عیب جوئی اور غیبت کرنا، دوسرے کے بھید تلاش کرنا وغیرہ،

یاایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم	اے ایمان والو! کوئی کسی کا مذاق
من قوم عسیٰ ان یکونوا	نہ اڑائے، ممکن ہے جن مردوں کا مذاق
خیراً منھم ولا نساء من	اڑایا جاتا ہو، وہ ان سے بہتر ہوں
نساء عسیٰ ان یکن	اسی طرح جن عورتوں کا مذاق اڑایا
خیراً منھن ولا تلمزوا	جاتا ہو، وہ ان سے بہتر ہوں، ایک
انفسکم ولا تنابزوا	دوسرے پر طعن و تشنیع نہ کرو، اور

بالالقاب[1]، (اور کسی کو بُرے القاب سے نہ پکارو،

دوسری جگہ ہے،

یاایھاالذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ واتقوا اللہ[2]،

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو بعض گمان گناہ ہوتے ہیں کسی کا عیب نہ تلاش کرو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو،

کسی کی ذلت پر خوشی کے اظہار اور عار دلانے اور چغلی کھانے کی ممانعت

کسی کی ذلت وحقارت پر خوشی ظاہر کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا تظھر الشماتۃ لاخیک فیرحمہ اللہ ویبتلیک[3]،

اپنے بھائی کی ذلت وحقارت پر خوشی نہ ظاہر کرو، (ورنہ) اس پر اللہ رحم کرے گا، اور تم کو اس میں مبتلا کر دے گا،

گناہ پر عار دلانا:۔

من عیّر اخاہ من ذنب		جس شخص نے کسی کو توبہ کئے ہوئے

---

[1] و [2] حجرات، ع ۲، [3] ترمذی و مشکوٰۃ باب حفظ اللسان، الفصل الثانی

لم یمت حتی یعملہ یعنی من ذنب تاب منہ[1] — گناہ پر عار دلائی تو موت آنے سے پہلے اس میں مبتلا ہوگا،

چغلی کھانا:-

مشاء بنمیم[2]، — اس کا کنا نا تو جوا دھر اُدھر چغلی لگاتا پھرتا ہے،

حدیث شریف میں ہے:-

المشاؤن بالنمیمۃ المفسدون بین الاحبۃ[3] — جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں وہ دوستوں کے درمیان فساد پھیلاتے ہیں،

عہد توڑنے دورخی پالیسی اختیار کرنے اور قطع رحم کی ممانعت

عہد و پیمان کرکے توڑنا،

ان العہد کان مسئولا[4]، — بیشک عہد کی بازپرس ہوگی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد توڑنے کو منافق کی نشانیوں میں قرار دیا ہے،

واذا وعد اخلف[5]، — جب وہ وعدہ کرتا ہے تو خلاف کرتا ہے،

دورخی پالیسی اختیار کرنا،

تجدون شر الناس یوم القیامۃ ذالوجہین الذی — قیامت کے دن دوزخا بدترین شخص ہوگا، کچھ لوگوں کے پاس ایک رُخ

---

[1] ترمذی و مشکوٰۃ باب حفظ اللسان الفصل الثانی، [2] قلم۔ [3] مسند احمد جلد ص ۴۵۹، [4] بنی اسرائیل [5] بخاری و مسلم،

یاتی ھٰؤلاء بوجه وھٰؤلاء	سے جاتا ہے، اور دوسرے کے پاس
بوجه. [۱]	دوسرے رُخ سے،

دوسری جگہ ہے،

من کان ذا وجھین فی	جو دنیا میں دو رُخا ہوگا، قیامت
الدنیا کان له یوم القیامة [۲] لسانان من نار	کے دن اس کی زبان آگ کی ہوگی

قطع رحمی کرنا:۔

قرآن حکیم نے قطع رحمی کرنے والوں کو فاسق قرار دیا ہے،

الذین ینقضون عهد الله	فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط
من بعد میثاقه ویقطعون	کرنے کے بعد توڑتے ہیں، اور اللہ نے
ما امر الله به ان یوصل و	جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اس کو
یفسدون فی الارض، [۳]	توڑتے ہیں، اور زمین میں فساد
	پھیلاتے ہیں،

فخر و غرور کرنے، حسد کرنے، اور بہتان لگانے کی ممانعت	فخر و غرور کا سب سے پہلے ظہور شیطان سے ہوا، جب اس نے آدم کے مقابلہ میں کہا،

انا خیر منه، [۴]	میں آدم سے بہتر ہوں،

اس سے دل پر مہر لگ جاتی ہے،

کذلک یطبع الله علی کل	اسی طرح اللہ مغرور اور سرکش کے دل
قلب متکبر جبار، [۵]	پر مہر کر دیتا ہے،

---

[۱] بخاری کتاب الادب، [۲] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی ذی الوجھین، [۳] البقرہ ع ۳،
[۴] الاعراف ع۔ ۲۔ [۵] المومن، ۴۔

اللہ کی محبت سے محرومی ہوتی ہے،

انّ اللہ لا یحب من کان مختالاً — بیشک اللہ اس سے محبت نہیں کرتا

فخوراً[1] — جو مغرور اور فخر کرنے والا ہو،

اخلاق کے دروازے بند کرتا ہے جو جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر غرور ہوگا (اس کا خاصہ ہے کہ) وہ جنت میں نہ داخل ہوگا[2]"

حسد بداخلاقیوں کا سرچشمہ اور نہایت خطرناک چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مسلمان کو اس سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی ہے:

ومن شر حاسد اذا حسد — پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ایاکم والحسد فان الحسد — تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں

یاکل الحسنات کما تاکل — کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح

النار الحطب[3]، — آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

بہتان لگانا (کسی کی طرف ایسی برائی منسوب کرنا جو اس میں نہ پائی جاتی ہو، اور اگر برائی پائی جاتی ہو تو وہ غیبت ہے)

---

[1] نساء ع-۶ [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر، [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحسد،

قرآن حکیم میں ہے،

ومن یکسب خطیئۃ اواثما — جو شخص خود کوئی خطا یا گناہ کرے
ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل — پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے
بھتانا واثما مبینا[1] — تو اس نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر پر لیا،

دوسری جگہ ہے :۔

والذین یوذون المومنین — جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں
والمومنت بغیر ما اکتسبوا فقد — کو بغیر کئے (تہمت لگا کر) تکلیف
احتملوا بھتانا واثما مبینا[2] — پہنچاتے ہیں، انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا،

غصہ کرنا بغض وکینہ رکھنا، اور فحش کلامی کرنا غصہ کرنا قرآن حکیم نے غصہ پی جانے والوں کو متقیوں میں شمار کیا ہے،

والکاظمین الغیظ[3] — وہ لوگ غصہ کو پی جانے والے ہیں

دوسری جگہ ہے،

واذا ما غضبوا ھم یغفرون[4] — اور جب اُن پر غصہ آتا ہے، تو معاف کر دیتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"پہلوان وہ نہیں ہے، جو دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ وہ ہے جو غصہ میں

---

[1] نساء ع۔ ۱۶۔ [2] احزاب ع۔ ۷، [3] آل عمران ع۔ ۱۴ [4] شوریٰ۔ ۱۴

اپنے کو قابو میں رکھے"[۵۱]

دوسری جگہ ہے،

"غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے، اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے اس لئے جس کو غصہ آجائے اس کو وضو کر لینا چاہئے"[۵۲]

بغض و کینہ رکھنا کسی کی دشمنی و ضرر رسانی کے جذبہ کو دل میں رکھنا، یہ حق العباد کی ادائگی میں اسی طرح رکاوٹ ڈالتا ہے جس طرح شرک حق اللہ کی ادائگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس سے برأت کے لئے دعا مانگنے کا حکم ہے،

ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا،[۵۳]	اے پروردگار! ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھیو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

ولا تباغضوا ولا تحاسدوا وکونوا اخوانا،[۵۴]	آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور بھائی بھائی بنکر رہو،

خود بینی و نمایش۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارہم بطرا ورئاء الناس[۵۵]	ان لوگوں کی طرح مت ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھانے نکلے،

دوسری جگہ ہے،

---

[۵۱] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [۵۲] ابوداؤد کتاب الادب باب من کظم غیظاً،
[۵۳] حشر ع۔۱، [۵۴] بخاری و مسلم وغیرہ [۵۵] الانفال، ع۔۶

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا،[۱]	اور ہم نے بہت سی بستیاں ہلاک کر دیں، جب وہ اپنی معیشت پر اترانے لگیں،

ایک اور جگہ ہے،

تذکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی،[۲]	تم اپنی پاکیزگی نہ جتایا کرو، پرہیزگاروں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے،

فحش گوئی خواہ شہوانی قوت سے ہو، یا غضبی قوت سے، دونوں کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے،

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج،[۳]	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ فسق و فجور کی، نہ جھگڑے کی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سباب المسلم فسوق و قتاله کفر،[۴]	مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق اور مسلمان سمجھ کر اس کو قتل کرنا کفر ہے،

دوسری جگہ ہے،

لیس المومن بالطعان و	مومن لعن طعن نہیں کرتا، بدزبانی

---

[۱] قصص - ع - ۶، [۲] النجم - ع - ۲، [۳] بقرہ - ع - ۲۵،
[۴] بخاری کتاب الادب،

ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی[۵] و فحش کلامی نہیں کرتا ہے،

ان کے علاوہ جس قسم کے طرزِ گفتگو اور طرزِ عمل سے بھی معاشرتی زندگی میں خلل واقع ہوتا ہے، ان سب سے سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے،

کھانے پینے لباس اور وضع قطع کے چند احکام تشکیل جدید میں معاشرتی نظم کا یہاں تک لحاظ کیا گیا ہے کہ کہ کھانے پینے، لباس اور وضع قطع کے بھی احکام و آداب مقرر کر دیئے گئے ہیں، تاکہ ان راہوں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا سدِ باب ہو سکے،

کھانے پینے کے بارے میں ہے،

۱۔ کھانا سیدھے ہاتھ سے کھایا جائے،

۲۔ کھانا کھاتے وقت ادب و احترام ملحوظ رہے،

۳۔ کھانا بیٹھ کر کھانا چاہئے، کھڑے ہو کر کھانا، یا اونچی جگہ پر بیٹھ کر، اور کھانا نیچے رکھ کر کھانا، اسلامی معاشرت کے خلاف ہے،

۴۔ اتنا کھائے کہ بدہضمی نہ ہو،

۵۔ حرام اور مشتبہ چیز نہ کھانا چاہئے،

اسی طرح لباس اور وضع قطع کے بارے میں ہے کہ

۱۔ کسی قوم کی پیروی یا ان کی مشابہت نہ ہو،

۲۔ مغرور و متکبر یا غیر ثقہ لوگوں کی وضع قطع نہ ہو،

۳۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس حرام ہے،

---

[۵] ترمذی ابواب البر والصلۃ،

۴۔ ایسا لباس نہ ہو جس سے ستر کی حفاظت نہ ہو سکے، یا شہوت برانگیختہ ہونے کا اندیشہ ہو،

۵۔ عورتوں کو خصوصیت سے لباس اور وضع قطع میں احتیاط کا حکم ہے،

فضول خرچی اور دکھاوے کی ممانعت	خرچ و اخراجات کے ہر معاملہ میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱۔ محل اور مقدار کسی لحاظ سے فضول خرچی نہ ہو،

۲۔ خرچ کرنے میں دکھاوا و نمائش یا غریبوں پر اپنی امارت و سیادت کا سکہ جمانا نہ ہو،

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے کتابوں میں مکمل بحث موجود ہے،

اسلام کا سیاسی نظام

مؤلفہ

مولانا محمد اسحٰق سندیلوی سابق استاذ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ ابواب میں جن میں نظریۂ خلافت مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی حقوق رعایا، بیت المال، عمّال حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ قریب قریب اسلامی دستور کے تمام اصولی اور اساسی پہلو آگئے ہیں، آخری باب سیاست کے غیر اسلامی نظریات سے متعلق ہے جس میں موجودہ سیاسی نظریے شخصیت، آمریت، جمہوریت پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے،

ضخامت: ۳۰۰ صفحے قیمت چھ روپے، "منیجر"

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ

اور

مورخین کا ایک تنقیدی جائزہ

از

جناب الطاف حسین خاں شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

عہدِ گذشتہ کے مورخین پر ایک ناقدانہ نظر ہندی قرونِ وسطیٰ کے مورخین نے اپنے عہد اور اس سے پہلے کی جو تاریخیں مرتب کی ہیں، ان میں قطع نظر دوسری کمزوریوں کے جن کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے، فاتح کی زبان استعمال کی ہے، مورخ بن کر واقعات نہیں لکھے، اگر مسلمان فوجوں اور دیسی راجاؤں سے جنگ کا ذکر آگیا ہے تو زیب داستان کے لئے ہندوؤں کا قتل عام اور ہندوؤں کی عام تباہی شامل کر دی ہے، بادشاہوں کا تذکرہ آگیا ہے تو ان کی شخصیت القاب و آداب میں گم ہوگئی ہے، اگر درباری ماحول کی نقش آرائی کی ہے تو حقیقت کم اور مبالغہ آمیزی زیادہ ہے، سماجی حالات کے تذکرے کے لئے مورخین کو موقع ہی نہیں ملا، کسی کی مدح سرائی کی ہے تو کسی کے خلاف جھوٹے افسانے گھڑے ہیں، غرض ساری داستانیں شاہی محلوں اور میدانِ جنگ تک محدود ملتی ہیں[1] حقیقت یہ ہے کہ ہندی قرونِ وسطیٰ کے مورخین نے تاریخ کو تاریخ سمجھ کر نہیں لکھا، بلکہ اپنے

---

[1] الفاروق جلد اول، ص ۹ - ۱۰،

ماحول اور گذرے ہوئے عہد کا تقاضا پورا کیا ہے جو آج ہمارے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ خطرناک بھی ہے[1]۔ ڈاکٹر سید محمود نے مرحوم نے صحیح فرمایا ہے،

مسلمان مورخوں نے مسلمانوں کے دور حکومت میں جو تاریخیں لکھی ہیں ان میں انکی فتح و کامرانی کا غرور اور غلبہ چھایا ہوا نظر آتا ہے اور انھوں نے واقعات قلمبند کرنے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور جس طرح ایرانی اہل قلم کے شعر و ادب میں غیر معمولی مبالغہ آرائی نظر آتی ہے اسی طرح جو تاریخیں ایرانی طرز پر لکھی گئیں انیں بھی مبالغے نظر آتے ہیں مثلاً دو چار ہندو مشرف باسلام ہوئے تو یہ مورخین لکھتے ہیں کہ تمام علاقے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اسی طرح مندروں کے انہدام کے اکا دکا واقعہ کو اسطرح پیش کرتے ہیں جس کے پڑھنے کے بعد یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مندر بالکل منہدم کر دئے گئے تھے، انگریزوں نے مسلمان مورخوں کی اس مبالغہ آرائی سے پورا فائدہ اٹھا کر اس دور حکومت کی جو تاریخیں قلمبند کیں انیں ہندوؤں کے اشتعال کو بڑھانے کیلئے پورا مواد فراہم کر دیا[2]۔

ان مورخین پر ایک نظر ڈالی جائے تو سلاطین دہلی کے دور میں ضیاالدین برنی، منہاج سراج، شمس سراج عفیف، فخر مدبر اور یحییٰ بن احمد سرہندی وغیرہ دکن کے مورخین میں محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، رفیع الدین شیرازی

---

[1] "مقالہ" وسطی ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت" مصنفہ ہربنس مکھیا مترجمہ امیر اللہ شاہین، عصری ادب، دہلی، جولائی ۱۹۷۰ء

[2] "پیش لفظ" ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام دار المصنفین ۱۹۶۰ء ص ۱۶ — ۱۷

علی بن عزیز اللہ طباطبائی، محمد ابراہیم دبیری، ملا عوب شیرازی اور ملا نظام الدین احمد شیرازی وغیرہ اور دور مغلیہ میں ابوالفضل علامی، نظام الدین بخشی، ملا عبدالقادر بدایونی ملا شریف معتمد خاں، مرزا کامگار حسینی، عبدالحمید لاہوری، محمد صالح کنبوہ، مرزا محمد طاہر آشنا، عاقل خاں رازی، مرزا مبارک واضح اور خافی خاں وغیرہم نے اسلامی ہندوستان کے مختلف ادوار پر تاریخیں لکھی ہیں ان میں بادشاہوں کی زندگی کے واقعات، دربار ی ماحول کی نقش آرائی، فتوحات کے حالات، جنگوں کی ہماہمی اور سیاسی کشمکش کے علاوہ عوامی زندگی کا ایک بھی گوشہ روشن نہیں ہوتا، علم وفن، معاشرت، تمدن، اقتصادی حالت تعمیر وغیرہ کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہوتے ہیں، حقیقت میں ان تاریخی کتابوں کو فتح نامے کہنا زیادہ مناسب ہوگا بیسویں صدی کے مورخین ان تاریخوں کے متعلق بڑی سخت رائے رکھتے ہیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں،

"ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ واقعات میں صرف جنگ وجدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں اس لئے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ہوتی ہے[1]،،

مولانا سید عبدالحئی فرماتے ہیں،

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سینکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ

---

[1] مقالات شبلی جلد چہارم ص ۵۹

ونیا کے صحیح معیار پر نہیں اتری جس کتاب کو اٹھاکر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ
بزم ہزم کو کوئی افسانہ ہے قرنا وکوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا
تو چنگ ورباب کے ذکر سے اس کو آپ خالی نہ پائیں گے،،[1]

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ نے ایک موقع پر فرمایا ہے،

"آجکل قوموں کی تاریخ کی نقش آرائی میں خون ہی کا رنگ درکار نہیں بلکہ اس زمانے کے تمدن، اقتصاد، تعمیر، معاشرت، علم وفن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی ضرورت پڑتی ہے جس سے قوموں کی پوری تصویر کھڑی ہو جائے لیکن اس زمانہ کے پرانے مورخوں نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخیں لکھیں اس لئے جو مسائل انکے نقطۂ نظر سے اہم تھے وہ ہمارے لئے غیر اہم ہیں اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے تھے انکو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو نظر انداز کر دیا یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے،[2]

ہندوستانی مورخین نے معاشرہ کے سماجی حالات لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ البیرونی اپنی تصانیف کے ذریعہ مورخین کی نظریں وسیع کر چکا تھا۔ ابوالفضل بیہقی اور ابن خلدون تاریخ کے فن کو اتنی ترقی دے چکے تھے کہ موجودہ دور کے مورخین بھی اسپر کوئی قابل لحاظ اضافہ نہ کر سکے، ایشیا، شمالی افریقہ اور اسپین وغیرہ عربی مورخین پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی بڑی تعداد تاریخیں لکھنے میں مصروف نظر آتی ہے جسکا سلسلہ ساتویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک قائم رہا،[3]

---

[1] یادایام ص ۵۸، [2] معارف، اپریل ۱۹۴۵ء

[3] تفصیل کیلئے دیکھئے، قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات" عبدالرحمن خان دہلی ۱۹۵۰ء جلد اول دوم،

یورپ کے مورخین بھی کارل مارکس سے پہلے اپنی تاریخوں میں حکمرانوں، فوجی سرداروں، اور وزیروں کے حالات اور کارنامے سپردِ قلم کیا کرتے تھے[۱]، ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ سے پہلے تاریخ نام کا کوئی فن ہی نظر نہیں آتا، اگر کچھ ملتا بھی ہے تو کتھاؤں کی شکل میں اپنے ہیرو کی پرستش نظر آتی ہے[۲]، ہماری بھارت ورش کی مصنف سنکھمشیت پرشوی راج راسو لکھتے ہیں،

> فی الواقع اس دیس میں تاریخ کو موجودہ معنی میں کبھی نہیں لیا گیا، تاریخی شخصیات کو تخیل کا پیکر بنا دینا ہمارا شیوہ رہا ہے بعض میں الوہیت کی خصوصیات شامل کرکے درا، الوہار بنا دیا گیا جیسے رام، بُدھ، کرشن اور بعض کو بڑی ہی رنگین و رومان پرور بنا کر کتھاؤں کا ہیرو بنا دیا گیا ہے جیسے آدین بکرما دیت اور نعال،[۳]

ابتدائی مسلمان مورخین کو ہندوستان میں ان ہی حالات کا سامنا ہوا، ان کو اس ملک میں علم تاریخ کا کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا جن کی تقلید کرتے اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جن کی بنا پر علم تاریخ ہندوستان میں اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکا اور ہم شدید غلط فہمیوں کے شکار ہوتے رہے یہ اسباب حسب ذیل ہیں:

(۱) دہلی سلطنت کی بنیاد رکھتے وقت مسلمانوں کا علمی انحطاط شروع ہو چکا تھا،[۴]

---

[۱] خطبۂ صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی ۱۹۶۴ء، معارف فروری ۱۹۶۴ء ص ۷۵ دیکھئے۔ [۲] ہندوؤں کی تاریخ نویسی، مصنفہ اکبر شاہ خاں عبرت (نجیب آباد) جون ۱۹۱۶ء، ص ۳[۳] معارف اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۲۴۷ [۴] ابتدائی سلاطین دہلی کے جاہ و جلال کو پیش کرنے کے لیے مغلوں کی طرح کوئی ابو الفضل (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳ پر)

(۲) ابتدائی ہندو علماء مسلمان مورخین کی کوئی مدد نہ کر سکے،

(۳) ہندی قرونِ وسطیٰ کے درباری نظام نے تاریخ کو شدید نقصان پہونچایا،

(۴) مورخین اور بادشاہوں کے تعلقات تاریخ نویسی پر اثر انداز ہوئے،

(۵) مسلمان مورخین نے محض اسلئے کہ انکے عصر حکمرانوں کی شہرت دوسرے اسلامی ملکوں میں بحیثیت مجاہد اسلام ہو، ہندوؤں کے خلاف جوش وخروش کا اظہار کرنا اپنا شیوہ بنا لیا،

(۶) غیر ملکی مسلمان مورخین نے ہندی نژاد مسلم عوام کے جذبات کا صحیح تصور قائم نہیں کیا اور انکے خلاف غلط رویہ اختیار کیا، اس عہد کے فارسی ماخذوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔[۱]

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ حاشیہ) نظام الدین بخشی اور عبد الحمید لاہوری پیدا نہ ہوا جس کی وجہ سے سیکڑوں سال کی تاریخ موجودہ مورخین کے لئے ایک مصیبت بن گئی اگر صوفیائے کرام اور شعراء عظام کی مدح شناسی حال نہ ہوتی تو شاید آج ہم اندھوں کی طرح ہاتھ پیر چلاتے،

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ Religious Bias in Modern Indian History writing by Dr. M. Yaseen. Kashmir University Radiance No. 15. 1970.

نیز دیکھئے اسی مصنف کا اردو مقالہ "ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ"

الجمعیت (ہفت روزہ) دہلی،

۵ رجون ۱۹۷۰ء

ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ اور انگریز مورخین

سلاطین دہلی اور مغلیہ عہد کے مورخین نے جو بھی کچھ لکھا ہے اس میں اپنے عہد کے ماحول سے چشم پوشی عوام کے حالات سے گریز اور بادشاہوں کی مدح سرائی اور اس قبیل کی دوسری خامیاں نظر آرہی ہیں، لیکن حقیقت میں ہماری تاریخ کو انگریز مورخین نے نہ صرف نقصان پہونچایا ہے بلکہ خطرناک بنا دیا ہے۔[1]

۱۸۵۷ء میں جب ہندو مسلمان عوام اور ملک کے کمزور حکمرانوں نے برطانوی استبداد کے خلاف آزادی کی جنگ کی تو انگریز مدبروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہندوستانی عوام مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دست وگریباں نہ ہوئے تو ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی چنانچہ اسی کو بنیاد بنا کر انگریز مورخوں، سیاست دانوں اور عالموں (مستشرقین) نے ایک منصوبہ کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔[2]

پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:-

> ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب کرانے کے لئے منظم کوششیں شروع کر دیں، سیاست، سماج زبان اور ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جہاں یہ زہر نہ پھیلایا گیا ہو، سرہنری ایلیٹ نے (جس کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدیں گذشتہ پچہتر سال سے ہماری ساری چھوٹی بڑی تاریخوں کا ماخذ رہی ہیں) حکومت کو لکھا کہ اگر اس کی مرتب

---

[1] امیر خسرو اور ہندوستان، ڈاکٹر تاراچند، ص ۶۰۵

[2] نیشنل آرکائیوز دہلی میں ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ایک خط محفوظ ہے جس سے اس منصوبے کی تصدیق ہوئی۔

کی ہوئی تاریخ ہند شائع کر دی گئی تو ہندوستان میں ساری قومی تحریکیں
خود بخود سرد پڑ جائیں گی، چنانچہ ہندو مسلم اختلاف کو تا حد طوفان پہنچانے کے
لئے یہ کتاب شائع کر دی گئی ہے۔[1]

جیمس مل پہلا انگریز مورخ ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے، ہندو دور، مسلم دور، اور دور جدید، اس نے ہندو مسلم تہذیب کی کش مکش پر جس قدر زور دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ واریت کی چنگاریوں کو ہوا دی جا رہی ہے، اس کی بہت سی مثالیں ان انگریز مورخین کی پیش کی جا سکتی ہیں جنھوں نے قرون وسطیٰ کے ہندوستان کو "بحر طوفان خیز" بنا دیا تھا اور مسلم تہذیب و ہندو تہذیب کو باہم ٹکرانا اپنا مشغلہ بنا لیا تھا،

ایم ہمنت راؤ ایم، اے (عثمانیہ) فرماتے ہیں:-

"تاریخ کے اس دور کی اہمیت کو سمجھنے اور اس عہد کی نسبت رائے قائم کرنے میں موجودہ زمانے کے مورخین نے عام طور پر غلطی کی ہے اس غلط فہمی کی بنا پر لوگ اس عہد کو یا تو دور ابتری یا دور استبداد خیال کرنے لگے اور تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں یہ غلط تصور رسا گیا کہ مسلم راج کا خیال گویا ہند و ہندوستان کی تباہی و بربادی تھی اور مسلمانوں کے آتے ہی قتل و غارتگری لوٹ مار و تاراجیت کا وہ دور شروع ہوا جس نے ہندو تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو اکھیڑ دیا۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کو منہدم کر دیا اور ان کی شائستگی کا خاتمہ کر دیا، اس غلط فہمی کا اہم سبب

---

[1] مقدمہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۳۲

یہ تھا کہ تاریخ مرتب کرنے والوں نے اس دور میں ہندو مسلمان معاشروں مذہبوں اور شائستگیوں کے درمیان جو پوشیدہ و غیر دانستہ ملاپ و امتزاج ہو رہا تھا اسے یا تو غیر اہم خیال کیا یا عمداً نظر انداز کر دیا اور تاریخ کے اس پہلو کے تحقیق کی بہت کم کوشش کی گئی ورنہ بہت جلد اصلی حالات روشنی میں آتے اور غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا۔[۱]

جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انھیں ہماری تاریخ عیسائیوں کی مذہبی موشگافیوں سے پاک ملی اعصر آ ہندؤں کی قیمتی دولت جو ہم مشرقیوں کا اہم اثاثہ ہے۔ ان نوواردوں نے نہ اس کی قدر کی اور نہ ایماندارانہ طور پر اس سے کام لینا چاہا حالانکہ مشرق کے ان ہی علوم سے یورپ کو تاریخ نویسی کا ایک نیا انداز ملا ہے۔[۲]

انگریز مورخین نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے ہماری تاریخ کے صرف اُس رُخ کو دیکھا جس میں مسلمان مورخین کے انفرادی جذبات تھے اُن میں مسلمان سپاہی صرف ہندؤں ہی سے جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جنگیں زیادہ تر مسلمانوں ہی سے ہوئی ہیں کاش ان مورخین نے مسلمان سلاطین کے عدل و انصاف کے واقعات کو پیش نظر رکھا ہوتا مسلمان امراء کی مسلم و غیر مسلم فنکاروں کی سرپرستی دکھائی ہوتی، خانقاہوں میں ہندو مسلم عوام کے اجتماع پر نظر ڈالی ہوتی اور اُن مسلمان درویشوں کی آنکھوں کی طرف دیکھا ہوتا جو ہر وقت بیکس عوام کیلئے رویا کرتی تھیں انکے

---

[۱] مقالہ "ازمنہ وسطیٰ میں ہندؤں اور مسلمانوں کی عمرانی اور مذہبی زندگی کے چند پہلو" سیاست حیدرآباد، جولائی اکتوبر ۱۹۴۳ء ص ۳۶۵-۳۶۶

[۲] تفصیل کیلئے دیکھیے: خطبہ صدارت مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی ۱۹۶۴ء، معارف فروری ۱۹۶۶ء

قدموں کی طرف نظر کی جوتی جو ناداروں کی فریاد رسی کے لئے دریاروں کی طرف اٹھا کرتے تھے،

انگریز مورخین نے ہمارے اتحاد قومی کو نقصان پہونچانے کے لئے ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ وہ اسلامی عہد میں مسلمان حکمرانوں کے ظلم وستم کے شکار رہے ہیں، انکی عبادت گاہوں کو نقصان پہونچایا گیا ہے اور ان کے مذہب کی توہین کی گئی ہے لیکن اگر غائر نظر سے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب تضاد نظر آتا ہے ایک طرف انگریز مورخین کے یہ بیانات ہیں دوسری طرف اس ایک ہزار سال کی طویل مدت میں حکمراں قوم اپنی تعداد ایک چوتھائی سے زیادہ نہ بڑھا سکی ان کے پایہ تخت کے گرد تک ہندوؤں کی آبادی کی اکثریت رہی جو اپنی مذہبی رسوم بخوبی انجام دیتی تھی[۵] جہاں تک معاشی خوشحالی کا سوال ہے ایک مشہور مسلمان مورخ ضیاء الدین برنی اس بات کی سخت شکایت کرتا ہے کہ اس کے عہد میں ہندوؤں کو اتنی مراعات کیوں حاصل ہیں[۲] صوفیائے کرام کے تذکروں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ بازاروں میں سور کا گوشت بکتا ہے[۳] اور مسجدوں میں مسلمان قتل کئے جاتے ہیں[۴] مسلمان بادشاہ بے بس نظر آتے ہیں،

ہندوؤں کی عبادت گاہوں کا مسئلہ محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت طے ہو چکا تھا کہ شریعت اسلامی میں ان کو کیا مقام دیا جائے اور صلح ہو جانے کے بعد انکی عبادتگاہوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، جلد اول، ص ۲۰۷

[۲] فتاویٰ جہانداری کلاو وٹوگراف شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) ص ۱۲۰ الف

[۳] لطائف قدوسی، ص ۳۱

[۴] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ص ۶۹

"غور کیجئے کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے ۹۲ھ میں جب بودھوں کے بلادے پر سندھ پر قدم رکھا تو پہلے ہی دن ان عربوں نے ہندوؤں کی حیثیت شرعی کو متعین کر لیا اور ان کو وہی حیثیت دی جو ان سے پہلے صحابہ نے اہل فارس کو قرار دی تھی یعنی شبہہ اہل کتاب جس کے معنی یہ ہیں کہ دو باتوں کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور میں انکے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ یہاں کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتشکدوں کی ہے جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے اسی طرح مصالحت ہو جائے تو یہ مندر بھی توڑے نہیں جائیں گے چنانچہ سندھ اور ملتان میں چوتھی صدی تک اسلامی حکومتوں کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے حالات لکھے اور اکثر عرب سیاحوں نے ان کی کیفیت بیان کی ہے[۱]"

اسلام نے دنیا کی اقوام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے[۲]،

(۱) مسلمان (۲) اہل کتاب (۳) شبہہ اہل کتاب (۴) کفار

اسی تقسیم کی رو سے ہندوستانی مسلمان حکمرانوں اور فقہاء نے ہندوؤں کو شبہہ اہل کتاب قرار دیا ہے (حضرت مظہر جانجاناںؒ نے ہندوؤں کو اہل کتاب قرار دیا ہے) اور ان پر اہل کتاب کی طرح جزیہ مقرر کیا، فیصلہ کے تحت علماء نے مندروں کو توڑنا اسلام کے منافی قرار دیا ہے، سکندر لودی کے عہد میں بتخانوں کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں ملک العلماء میاں عبداللہ اجودھنی نے بادشاہ کو لکھا تھا،

---

[۱] مقالات سلیمان (حصہ تاریخی) جلد اول، ص ۳۸۵، ۳۸۶

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۹۲، ۱۹۳

"بت خانہ قدیم را ویران ساختن جائز نیست"[1]

درویشوں کی مجالس میں تو بتخانوں کا تذکرہ احترام سے کیا جاتا تھا اور بتخانوں میں صوفیائے کرام کا نام عزت سے لیا جاتا تھا[2]،

اس عہد کے متعدد شعراء نے بتخانوں کا ذکر بڑے ذوق شوق سے کیا ہے،

(۱) خسروؔ فرماتے ہیں ؎[3]

بسی بتخانہ دیدا از سنگ سا زش   ز طرز سیم و زر بستہ طرا زش

(۲) ہمایوں کے عہد کا شاعر ہجری مغلوں کے ابتدائی دور میں مندروں کی کثرت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے،[4]

ہر طرف بتخانہ ہا پر از بتان دلربا   کز لطافت ہر یکے رشک بتان آزر است

(۳) عہد اکبری کا شاعر نوعی خبوشانی (متوفی ۱۰۱۹ھ) مندروں اور برہمنوں

---

[1] تاریخ داؤدی، مصنفہ عبد اللہ علی گڈھ ۱۹۶۹ء ص ۲۹ نیز دیکھئے: طبقات اکبری ص ۳۳۶
مسلمانوں نے تو دنیا کا سب سے بڑا بتخانہ کعبہ بھی تاخت و تاراج نہیں کیا صرف بتوں سے عمارت کو خالی کرا لیا گیا اور اسکی حرمت، عظمت اور بزرگی قائم و دائم رکھی ؎

یہ ہیں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

[2] دُرر نظامی، مصنفہ مولانا علی محمود بن جاندار، مترجمہ یسین علی نظامی، دہلی ۱۹۲۳ء ص ۱۷۱
پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے دوران گفتگو ایک مرتبہ فرمایا کہ دُرر نظامی موضوع ہے لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسکو مستند قرار دیا ہے، دیکھئے مقالہ ملفوظات کی تاریخی اہمیت اندروشنی ص ۲ (ادارہ ادبیات دلی ۱۹۶۵ء)
حالاتِ شیخ علی شاہ ابن شیخ محمود جاندار کے لئے دیکھئے گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۸۹

[3] مفتاح العلوم علیگڈھ اڈیشن ۱۹۵۵ء ص ۳۲ نیز دیکھئے خزائن الفتوح علیگڈھ اڈیشن ص ۱۴

کے متعلق لکھتا ہے،

تو کی من و در یوزۂ بتخانۂ معشوق ۔۔۔ افواہ حقیقت بدل برہماں ریخت[1]

(۴) ادیس بیگ فطرت کاشانی کہتا ہے،

من از آں ہندو پسر خود ترک ایماں میکنم

کافری زاہد ببیں در حلقۂ زنار کیست

وابستہ ام بصحبت شکر لباں ہند

طوطی صفت گرفتہ ز ہندوستاں روم[2]

دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی بہت سی حکومتیں قائم ہوئیں ان کے زیر سایہ عیسائی، یہودی، زردشتی، بدھ اور ہندو مختلف مذاہب کے لوگ امن و سکون کے ساتھ رہے کسی قوم کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا ہندوستان کے چھ سو سالہ (۱۲۰۶ء تا ۱۸۵۷ء) دور حکومت میں بھی اس پر عمل رہا،

(۵) مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں،

"میں دنیا کے مورخوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ ہزار سال سے زیادہ طویل مدت جس میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں لیکن کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اسلئے قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کر دے"[3]

---

[1] معارف جون ۱۹۶۹ء،

[2] معارف اپریل ۱۹۶۳ء ص ۲۷۳

[3] معارف [illegible] ص ۱۴، ۱۴، ۱۵،

(۲) پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں،

"مغلوں کی پوری تاریخ میں کوئی جلیانوالہ باغ نہیں ملتا، انکے یہاں کوئی مانچسٹر نہ تھا جس کی خاطر وہ ڈھاکہ کی ململ بنانے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالتے، ان کے یہاں کعبہ تھا لیکن انھوں نے قشقہ لگانے میں تامل نہ کیا،،[1]

[1] علی گڈھ میگزین، اکبر نمبر ۱۹۵۰ء نیز دیکھئے" اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بیجا شکایت" مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف اگست تا دسمبر ۱۹۴۳ء،

بزم تیموریہ حصہ اول

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، عالمگیر ظفر شاہ آخری مغل بادشاہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان سبکے درباروں کے متوسل امراء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ، اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا جسکو ارباب ذوق نے بہت پسند کیا اور اپنی کتابوں اور مضامین میں اس دور کے مستند ترین ماخذ کی حیثیت سے اس کے حوالے دئے اور ناقدین نے مصنف کی محنت و جانفشانی کی داد دی، اب نظر ثانی کے بعد اس میں اس کثرت سے اضافے ہوئے اور اس کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ قدر دانوں اور مستفیدین کی آسانی کیلئے اس کو دو جلدوں میں کر دیا گیا، تاکہ بانی سلطنت تیموریہ سے لیکر ظفر شاہ تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، اس جلد میں جو زیر طبع ہے تین متقدم الذکر مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امراء شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے،

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحۃً بعض متفقہ اسلامی احکام میں تبدیلی کی ہے؟

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین

حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت نہ صرف اسلام اور عرب بلکہ پوری نوع انسانیت کیلئے باعث فخر ہے، ان کی عبقریت کی شہادت جہاں اُنکے دوستوں اور محبین نے دی ہے وہیں ان کے دشمنوں اور مخالفین نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے وہ صرف ایک جلیل المرتبت صحابی رسولؐ، ماہر سیاستدان اور فاتح اعظم ہی نہ تھے بلکہ امامت و اجتہاد کے بلند منصب پر بھی فائز تھے، مسائل فقہیہ میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات، ان کی نکتہ سنجی، دقیقہ رسی اور دقت فکر کے ٹھوس واقعات بکثرت ہیں، اس کی بنا پر آج کے بعض نام نہاد محققین شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے بہت سے مسائل میں نص قطعی سے انحراف کیا ہے یا اس پر "مصلحت" اور رائے کو ترجیح دی ہے،[لہ] اور فقہ فاروقی پر جن لوگوں کی گہری اور وسیع نظر نہیں ہے انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت عمرؓ کے علاوہ بھی ہر شخص کو نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں مصلحت کو ترجیح دینا جائز ہے خواہ وہ نص کتنا ہی قطعی الثبوت

لہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں،

اور قطعی الدلالۃ کیوں نہ ہو،

یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ اجتہاد کے معاملہ میں معصوم عن الخطا نہیں تھے لیکن انھوں نے کسی مصلحت اور رائے کی خاطر نص قطعی کو کبھی ترک یا مسخ نہیں کیا بلکہ ان کے زمانہ میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کو حل کرنے کے لئے نصوص کے ما لہا و ما علیہ کو سمجھنے کی امکانی کوشش کی اور شریعت کی روح اور نص کے منشا کو پیش نظر رکھکر مسئلہ کا حل نکالا، اس سلسلہ میں ان سے بعض لغزشیں بھی ہوئیں مگر جیسے ہی وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہوئے بلا کسی پس و پیش کے انھوں نے اس سے رجوع کر لیا، یہاں ہمارا مقصد حضرت عمرؓ کے تمام اجتہادات کا استقصا نہیں ہے اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے ذیل میں صرف چند ایسے مسائل پیش کئے جاتے ہیں جنھیں مخالفین اپنے دعوے کے ثبوت میں بار بار پیش کرتے ہیں،

مؤلفۃ قلوب کا مسئلہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدوی قبائل کے بعض بڑے سرداروں مثلاً زبرقان بن بدر، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس وغیرہ کو ان کی تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ کے مال میں سے ایک خاص حصہ دیا کرتے تھے، حالانکہ یہ لوگ خود دولت مند تھے، حضور اکرمؐ کا یہ عمل اس آیت کے مطابق تھا جس میں مولفۃ قلوب کو بھی مصارف زکوٰۃ میں شمار کیا گیا ہے،

(حاشیہ صفحہ ۴۲)

لہ مترجم:- علامہ شبلی الفاروق جلد دوم میں لکھتے ہیں:- "فقہ کے جس قدر مسائل حضرت عمرؓ سے بروایات صحیح منقول ہیں ان کی تعداد کئی ہزار تک پہونچتی ہے ان میں سے تقریباً ہزار مسئلے ایسے ہیں جو فقہ کے مقدم اور اہم مسائل ہیں، اور ان تمام مسائل میں ائمہ اربعہ نے ان کی تقلید کی ہے........ مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں یہ مسائل منقول ہیں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کی مدد سے فقہ فاروقی پر ایک مستقل رسالہ لکھکر ازالۃ الخفا میں شامل کر دیا ہے" (ص ۲۱۷)

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ	زکوٰۃ حق ہے مفلسوں کا محتاجوں کا، زکوٰۃ کے کام
وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ	پر جانے والوں کا، جن کا دل پرچانا منظور ہے
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي	انکا، گردن چھڑانے والوں کا اور قرضداروں کا
سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً	اللہ کے راستہ میں اور مسافروں کا، یہ اللہ کی طرف
مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (توبہ)	سے ٹھہرایا ہوا ہے، اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکیم

عہد صدیقی میں ان قبائل کے لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے زکوٰۃ میں سے اپنے اس حق کا مطالبہ کیا، انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں عمال زکوٰۃ کے نام حکم نامہ جاری کردیا پھر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ سے ملے تو انھوں نے غور و فکر کے بعد فرمایا،

> اللہ جل شانہٗ نے اسلام کو تمام دنیا میں سربلند اور غالب کردیا ہے اب جسکا دل چاہے اپنے سینہ کو نور ایمان سے معمور کرے اور جو چاہے ضلالت کفر میں بھٹکتا رہے، آیت ربانی فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر کی یہی تفسیر ہے، البتہ اگر تمھارا شمار فقراء اور مساکین میں ہے یا تم میں کوئی ایسا وصف ہے جسکی بناپر تم مال زکوٰۃ کے مستحق ہو تو یقیناً ہم تمھیں دیں گے، لیکن تالیف قلب کیلئے اب کچھ نہ دیا جائے گا،

یہ سن کر وہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں واپس آئے اور بڑی ناگواری سے کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا کہ عمرؓ؟ فرمایا ھو ان شاء اللہ، اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے اتفاق کرکے اس کو برقرار رکھا،

مذکورۂ بالا واقعہ صحاح ستہ سے اسی طرح ثابت ہے، آج کے بعض اہل قلم اور

محققین اس واقعہ کی بنا پر حضرت عمرؓ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے اس لئے نص قرآنی کو باطل قرار دیا کہ تغیر پذیر حالات میں اب زکوٰۃ کا یہ مصرف باقی نہیں رہا، بلاشبہہ کسی شخص کو بھی حکم ربانی کے بدلنے یا اس سے روگردانی کرنے کی اجازت نہیں لیکن حضرت عمرؓ کا مذکورہ عمل اس ذیل میں نہیں آتا، اللہ جل شانہ نے اپنے ارشاد میں زکوٰۃ کا مستحق اشخاص یا افراد کو قرار نہیں دیا بلکہ صفات کو اس کا معیار بنایا ہے، مثلاً فقر، مسکینی زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا کام اور تالیف قلب " المؤلفة قلوبھم" میں در اصل تالیف القلوب استحقاق زکوٰۃ کی شرط ہے نہ کہ زبرقان وغیرہ اشخاص جنھوں نے مال زکوٰۃ میں سے ملنے والے حصہ کو اپنا لازمی حق سمجھ لیا تھا، خواہ حکومت کو ان کی تالیف قلب کی ضرورت ہو یا نہ ہو، اور ان کے دل اسلام سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں، حضرت عمرؓ نے اپنی دور اندیشی اور دانشمندی سے اس کو سمجھ لیا کہ اسوقت جب کہ قیصر و کسریٰ اسلامی پایہ تخت کے زیر نگیں ہو چکے ہیں کسی فرقہ یا افراد کی تالیف قلب کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہی آیندہ جب کبھی اس کی ضرورت پیش آئے گی تو پھر زکوٰۃ کا یہ مصرف استعمال میں لایا جائے گا اسلئے یہ معاملہ تمام تر خلیفۂ وقت کی صوابدید پر منحصر ہے اسی لئے جب زبرقان اور اقرع وغیرہ نے صدیق اکبرؓ سے حضرت عمرؓ کی شکایت کی کہ وہ مال زکوٰۃ سے مولفہ قلوب کے مصرف کو ختم کر دینا چاہتے ہیں تو انھوں نے عمر فاروقؓ کی رائے کو لوث اور نص کے اصلی مقصد کے مطابق ہونے کی بنا پر پسند کیا اور انکے فیصلہ کو برقرار رکھا،

اس وضاحت کے بعد کوئی منصف مزاج شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت عمرؓ نے مصلحت کی وجہ سے نص کو باطل اور کالعدم کر دیا، بلکہ واقعۃً انھوں نے نص پر پوری دیانت داری کے ساتھ عمل کیا،

اس سلسلہ کے دو اور واقعات نقل کرنا بے محل نہ ہوگا، ایک کا تعلق قحط سالی میں حد سرقہ ساقط کرنے سے ہے اور دوسرے کا حاطب بن بلتعہ کے اونٹ چرانے والے غلاموں پر چوری کی حد نہ جاری کرنے سے ہے، صحاح میں ان دونوں واقعات کی تفصیل موجود ہے، پہلے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک سال ایسا بھیانک قحط پڑا کہ وہ اپنی عدیم المثال خشک سالی کی وجہ سے تاریخ اسلام میں "عام الرمادۃ" کے نام سے مشہور ہوگیا، اسی زمانہ میں ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس فریاد لے کر آیا کہ ایک شخص نے اسکا اونٹ چرا کر ذبح کر دیا، حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ کیا تم اپنے اس اونٹ کے بدلے دو موٹی تندرست اور حاملہ اونٹنیاں لینا پسند کروگے؟ کیونکہ ہم قحط سالی میں حد سرقہ جاری نہ کریں گے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بنی عامر بن لوی کے چار افراد نے کسی شخص کا ایک اونٹ پکڑ کر ذبح کر دیا، جب یہ معاملہ بارگاہ فاروقی میں پیش ہوا تو حسن اتفاق سے بنی عامر کے بھائی حاطب بن بلتعہ بھی موجود تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا "حاطب فوراً اٹھو! اور مذبوحہ اونٹ کے مالک کو اس کے اونٹ کے بدلے دو اونٹ خرید کر دو" حاطب نے فوراً اس کی تعمیل کی، پھر حضرت عمرؓ نے چاروں ملزمان کو کوڑے لگوا کر نکال دیا۔

ان دونوں واقعات میں فی الواقع حضرت عمرؓ نے کسی حد شرعی کو باطل قرار نہیں کیا بلکہ فرمان نبوی "ادرؤا الحدود بالشبہات" سے فائدہ اٹھایا ہے، پہلی صورت میں بھیانک قحط نے اونٹ ذبح کرنے پر مجبور کیا تھا مجرموں نے اپنے رشتۂ جاں کو باقی رکھنے کیلئے ایسا کیا تھا، دوسرے موقع پر حاطب کے غلاموں نے بھوک سے نڈھال ہونے کے سبب یہ حرکت کی تھی کیونکہ یہ بات ثابت شدہ تھی کہ حضرت

حاطبؓ بہت بخیل تھے اسی لئے حضرت عمرؓ نے حاطبؓ کو حکم دیا کہ وہ اونٹ کے مالک کو اس کے معاوضہ میں دو اونٹنیاں خرید کر دیں اور غلاموں کو کوڑے کی سزا دی تاکہ آیندہ دوسرے لوگ اس واقعہ کو حجت بنا کر لوٹ کھسوٹ کی جرأت نہ کر سکیں، اگر ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ حد شرعی نافذ کرتے تو درحقیقت قانون اسلامی کے مسلم اصول "ادرؤا الحدود بالشبہات" کے صریحی خلاف ہوتا،

سوادِ عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا موقف

عہد فاروقی میں اسلام کو جیسی عظیم اور وسیع فتوحات حاصل ہوئیں اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی انہی کے عہد میں عراق، فارس، شام، مصر اور لیبیا وغیرہ کی سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرایا، ان فتوحات نے خلیفۂ وقت کیلئے اراضی مفتوحہ کی تقسیم کا ایک بڑا مسئلہ پیدا کر دیا، مجاہدین کا خیال تھا کہ دوسرے مال غنیمت کیطرح ان زمینوں کا چار خمس بھی ان میں تقسیم ہونا چاہیے، لیکن حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو قومی مصالح کے پیش نظر محفوظ رکھا جائے اور ان کے مالکوں کے قبضہ میں چھوڑ کر ان پر خراج مقرر کر دیا جائے اور اس کی آمدنی کو امور عامہ مثلاً سرحدوں کی حفاظت، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور فوجیوں کی تنخواہ میں صرف کیا جائے،

مخالف جماعت صحابہ جس میں عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام اور بلال بن رباحؓ پیش پیش تھے کی دلیل یہ تھی کہ مفتوحہ زمینیں بھی منقولہ جائداد کی طرح غنیمت ہی کا مال ہے اور اس کی نظیر میں خیبر کی زمین کو پیش کرتے تھے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین میں تقسیم کر دیا تھا[۱]، حضرت عمرؓ کی دلیل یہ تھی کہ یہ مفتوحہ اراضی بنو نظیر اور بنو قریظہ کی

---

[۱] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو۔

طرح "اراضی فئے" کی قبیل سے ہیں اور اس کی تائید میں سورہ حشر کی ان آیات سے استدلال کیا تھا،

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین و ابن السبیل کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم،	اللہ بستیوں والوں سے اپنے رسول کو جو کچھ ہاتھ لگادے وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کیلئے، اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے، تاکہ (مال) تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا رہے،

اس کے بعد کی آیات ہیں،

للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون	یہ مال ان مفلس مہاجرین کیلئے ہے جن کو ان کے گھروں اور دوسرے اموال سے زبردستی بے دخل کرکے نکال دیا گیا ہے یہ لوگ اللہ کی رضامندی اور اسکے فضل کے طلبگار ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول کی مدد کرنے آئے ہیں یہی لوگ صحیح معنی میں م

لہ مترجم:۔ دراصل غنیمت اور فئے کو لوگوں نے ایک ہی سمجھا اسلئے مغالطہ میں پڑ گئے، ائمہ مجتہدین میں امام شافعی بھی انہی لوگوں کے ہمراہ ہیں انکے نزدیک مفتوحہ زمینیں بھی مجاہدین میں تقسیم کردینی چاہئیں، امام شافعی اور انکے ہم خیالوں نے بھی ارض خیبر سے استدلال کیا ہے، لیکن انھوں نے یہ بات غالباً ملحوظ نہیں رکھی کہ خیبر کے بعد اور مقامات بھی تو فتح ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے قبل تمام عرب پر قبضہ ہو چکا تھا لیکن حضور نے اسکا کوئی حصہ بھی تقسیم

اس کے بعد فرمایا۔

والذین تبوؤ الدار والایمان
من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم
ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ
مما اوتوا ویؤثرون علیٰ انفسھم
ولو کان بھم خصاصۃ ومن یوق
شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون

اور (یہ مال ان لوگوں کیلئے ہے) جنھوں نے
ایمان لاکر ان مہاجرین سے پہلے اس گھر
(دار الہجرت) کو آباد کر رکھا ہے جو لوگ
ہجرت کر کے انکے یہاں آتے ہیں، انھیں
یہ محبوب رکھتے ہیں اور انھیں جو کچھ دیا جائے
انکے لئے اپنے دل میں کوئی غرض محسوس
نہیں کرتے، یہ لوگ اگر خود فاقہ مست ہوں
تو بھی ان مہاجرین کو اپنے اوپر مقدم رکھتے
اور جو لوگ اپنی طبیعت کے لالچ سے محفوظ
رکھے گئے وہی درحقیقت فلاح یافتہ ہونگے،

پھر ارشاد ہے:

والذین جاؤ من بعدھم
یقولون ربنا اغفر لنا و
لاخواننا الذین سبقونا بالایمان
ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین
آمنوا ربنا انک رؤف رحیم،

اور (یہ مال ان لوگوں کیلئے ہے) جو ان کے
بعد یہ کہتے ہوئے آئے کہ اے پروردگار
ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی
بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں ہمارے
دلوں میں ایمان لانے والوں کیلئے کوئی
بیر نہ رکھ اے پروردگار تو بڑا شفیق و
رحیم ہے،

ان آیات کو پیش کر کے حضرت عمر فاروق رض نے دوسری جماعت کے لوگوں سے فرمایا کہ،

فکانت ھذہ عامۃ لمن جاء	یہ سب آیندہ آنے والوں کیلئے ہے
من بعدھم فقد صار ھذا الفیٔ	اس بنا پر یہ مالک لوگوں کا حق ٹھہرے
بین ھٰؤلاء جمیعاً فکیف نقسمہ	پھر میں اسکو موجودہ لوگوں میں کیسے تقسیم
لھٰؤلاء وندع من یخلف بعدھم	کردوں اور انلوگوں کو محروم کردوں
	جو آیندہ آئیں گے،

"انھوں نے یہ بھی فرمایا،

اللہ تعالی نے تمھارے بعد آنے والے لوگوں کو بھی اس فے میں شریک قرار دے دیا ہے اب اگر میں اسے تقسیم کر دیتا ہوں تو تمھارے بعد آنے والوں کیلئے کچھ بھی باقی نہ بچے گا، اور اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کے ایک چرواہے کو بھی اس فے میں سے اس کا حصہ پہونچ جایا کرے گا جب کہ اس کا خون اس کے چہرہ ہی میں ہوگا،،

مخالفین نے جن کے سرخیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض تھے، فاروق اعظم رض سے کہا کہ ملاقے اللہ جل شانہ نے ہماری تلواروں کے بل پر ہمیں عطا کئے ہیں ان کو کیا آپ ان لوگوں ئے روک رکھیں گے جو نہ اسوقت موجود تھے اور نہ جنگ میں شریک ہوئے، آپ ان کو آیندہ ل در نسل کے لئے روک رکھنا چاہتے ہیں جو موجود بھی نہیں، حضرت عمر رض نے یہ سن کر فرمایا یہ میری رائے ہے" لوگوں نے کہا پھر آپ باقاعدہ مشورہ کیجئے" چنانچہ حضرت فاروق ظم رض نے مہاجرین والانصار کے اکابر و اشراف کو جمع کر کے فرمایا

میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر کے پکے

معاملات کی جو ذمہ داری ہے اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں، کیونکہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں، آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہوگا، بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق، میں نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہرحال وہی رائے قبول کریں جو میں نے اختیار کی ہے آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے پس خدا کی قسم اگر میں نے کوئی بات ایسی کہی جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباع حق کے کچھ اور نہیں ہے۔

یہ سن کر ان لوگوں نے کہا "امیرالمؤمنین! آپ فرمایئے ہم سنیں گے اور غور کریں گے "

آپ نے فرمایا:-

آپ نے ان لوگوں کی باتیں سن لی ہیں جنکا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں، میں ظلم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اگر میں نے کوئی ایسی چیز جو ان لوگوں کا حق تھی ان کو نہ دی ہو اور دوسروں کو دے دی ہو تو میں بڑا ہی بدبخت ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی زمین کے بعد اب کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے جو فتح ہو، اللہ نے ان کے اموال، زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطور غنیمت عطا کر دئے ہیں، ان لوگوں کو غنیمت میں جو مال ملا تھا اسے تو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے، اور ایک خمس نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے بلکہ اب بھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں ، میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور خود ان پر فی کس جزیہ عائد کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں اسطرح یہ جزیہ اور

خراج مسلمانوں کے لئے مستقل فے کا کام کریگا جس کی آمدنی میں فوجی لوگ، افراد اور آیندہ نسلیں حصہ دار ہوں گی، دیکھئے ان سرحدوں کی حفاظت کیلئے کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں، یہ بڑے بڑے شہر جیسے شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر، ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظایف دیتے رہنا ناگزیر ہے، اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائیگا،،

یہ مدلل اور دلنشین تقریر سن کر حضرت عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، ابن عمرؓ اور دوسرے کبار انصارؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور بیک زبان کہا،

"آپ ہی کی رائے صحیح ہے، آپ نے جو فرمایا وہ خوب ہے اور جو رائے قائم کی ہے وہ بہت موزوں ہے،،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ نے نصوص شرعیہ کی گہرائی تک پہنچکر جو رائے مصلحت سے زیادہ قریب سمجھی اسی کو اختیار کیا، اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے ان کی پوری تائید کی، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عمر فاروقؓ نے کسی نص قطعی کو ترک کیا بلکہ ایک مجتہد کی طرح ظاہر نص اور اسکی روح کی رعایت کرتے ہوئے اپنے خیال کو مرجح قرار دیا ہے،

تمتع حج اور متعہ کی تحریم بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی، لیکن پھر بعد میں بتدریج اس کو حرام قرار دے دیا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور صحابہ کے بھرے مجمع میں اس بات کا اعلان کیا کہ تحریم متعہ خود ان کا کوئی ذاتی اجتہاد

نہیں ہے بلکہ یہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی کے فرمان کا عملی نفاذ ہے۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ جب خلیفہ ہوئے تو ایک تقریر میں فرمایا،

اِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں
اذن لنا فی المتعۃ ثلاثاً ثم حرمھا	تین بار متعہ کی اجازت مرحمت فرمائی پھر اسے حرام قرار دے دیا،

انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر خدا کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا،

ما بال رجال الذین ینکحون ھذہ	آخر وہ لوگ کیوں نہیں باز آتے جو رسول
المتعۃ بعد نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	اکرمؐ کی ممانعت کے باوجود متعہ کرتے اور
علیہ وسلم عنھا ۔	غیر مناسب کام کرتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں تحریم متعہ پر شدت کے ساتھ عمل کرایا تو یہ انکا کوئی شخصی اجتہاد یا عمل نہ تھا بلکہ نص کے عین مطابق اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے فرمان کا عملی نفاذ تھا۔

تمتع حج یہ ہے کہ اثنائے ایام حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور اس کے ارکان کی ادائیگی کے بعد احرام کھول دے پھر یوم عرفہ کو حج کا احرام باندھ لے، ان دونوں احراموں کے درمیانی وقفہ میں اس کے لئے ہر کام جائز اور حلال رہتا ہے، حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ بعض لوگ اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر اپنی بیویوں سے اختلاط کرنے میں مضائقہ نہ تصور کریں گے، اس لئے انھوں نے اس پر پابندی عائد کرنی چاہی لیکن جب ان سے کہا گیا کہ رسول اکرمؐ نے اسے جائز قرار دیا ہے تو حضرت عمرؓ مطمئن ہو گئے اور

اپنے خیال سے رجوع کر لیا،

یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ جب عمر فاروقؓ کے نزدیک نص کی صحت ثابت ہو جاتی تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے یا اپنے فیصلہ سے باز آجاتے تھے، حالانکہ خلیفہ وقت کو شرعاً پوری آزادی حاصل ہے کہ اگر وہ مباحات میں بھی امت کا حد سے تجاوز اور شر کو خیر کے پہلو پر غالب دیکھے تو قومی مصالح کے پیش نظر مباحات پر بھی پابندی عائد کر سکتا ہے کیونکہ اسلامی قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ "درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح"

طلاق ثلاثہ کا مسئلہ اس مسئلہ میں بنائے اختلاف حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی وہ روایت ہے جسے امام احمد، مسلم اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے،

کان الطلاق علی عہد رسول اللہ	عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے
صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکرو	دو برس تک تین طلاق ایک شمار کی جاتی
سنتین من خلافۃ عمر طلاق	تھی،
الثلاث واحدۃ،	

پھر جب اس معاملہ میں لوگوں نے حد سے تجاوز اختیار کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا،

قد استعجلوا فی امر قد کانت	جس معاملہ میں (یعنی طلاق) لوگوں کو
لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم	صبر سے کام لینا چاہئے تھا اس میں عجلت
فامضاہ علیھم،	کرنے لگے ہیں، کاش ہم اسکو نافذ کر سکتے
	چنانچہ انھوں نے اسے نافذ ہی کر دیا۔

یہاں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ کتب حدیث میں بعض ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جو مذکورہ بالا حدیث (مروی عن عبد اللہ ابن عباس) کے خلاف ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا

ہوتا ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت اسی مسلک پر عامل تھی، کتاب اللہ کی جن آیات میں مطلق طلاق کا ذکر آیا ہے، وہ ایک لفظ اور اس کی تکرار کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتیں، بلکہ ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس میں طلاق ثلاثہ بتکرار الفاظ اور بیک مجلس مراد ہے، رسول اکرم، صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی عہد میں اسی پر عمل تھا کہ تین طلاقیں ایک نشست میں دینے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ پہلی بار یا پہلے لفظ ہی سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اب دوسری دو طلاقیں محض تاکید کا حکم رکھتی ہیں،

لیکن بعد میں جب لوگ اس میں بے احتیاطی کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا کہ اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہونگی اسے نص سے روگردانی نہیں کہہ سکتے بلکہ حضرت عمرؓ نے مصلحت وحسن وتدبیر کے تقاضے سے ایک احتمال کو دوسرے احتمال پر ترجیح دی تھی،

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جونپوری عثمانی

از

مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدرس مرکز علوم مدرسہ قرآنیہ
شہر جونپور

(۲)

شعر و سخن | دیوان محمد رشید کو شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا جس پر انکا دیوان شاہد ہے،

ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

گرد شو گرد کہ تا گرد نہ گردی در راہ   کے بدانی کہ دریں راہ سوارے باشد

اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے متعلق کتنا عمدہ شعر کہا ہے،

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماولی   شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگ است

غزل کا نمونہ

ہر نگاہ او دعاے دیگر است   ہر پیچ زلفش بلائے دیگر است

من بیکدم سیر عالم می کنم   روح را دستے و پائے دیگر است

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی   کے بمیرم جاں بجائے دیگر است

از دل شمسی دمے تمکین مجوے   ہر دمش چوں ہوو ہائے دیگر است[1]

تصنیف و تالیف | دیوان صاحب، درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف میں بھی اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے،

[1] دیوان شمسی قلمی

سرعت تالیف میں آپ کے معصروں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ نے بعض ایسی اہم کتابیں لکھیں جو گیارہویں صدی کی علمی یادگار بن گئیں۔ ان کے ہر تذکرہ نگار نے انکے دوسرے کمالات کے ساتھ تصنیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اکثر کتابوں کا تعارف کرایا ہے مگر افسوس کہ ان کتابوں میں دو کے سوا ابتک کوئی کتاب بھی طبع نہ ہو سکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے،

تلاش و جستجو سے دیوان صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے،

(۱) رشیدیہ عربی:۔ اسکے متعلق صاحب نزہتہ الخواطر رقمطراز ہیں،

ومن مصنفاتہ الرشیدیہ فی فن المناظرۃ وہی اشہر مصنفاتہ تلقاہا العلماء بالقبول تعلیقا و تدریسا۔[1]	آپ کی تصانیف میں رشیدیہ بہت مشہور ہے علماء نے اسکی جانب خاص توجہ کی ہے اور اس پر حواشی و شروح لکھے ہیں اور درس میں داخل کر لیا ہے۔

رشیدیہ دیوان صاحب کی حیات ہی میں بہت مشہور ہو گئی تھی اور اسی زمانہ میں ملا محمود کے ایک شاگرد ملا عبدالباقی جونپوری نے اس پر کچھ اعتراضات کئے تھے اسکے جواب میں دیوان صاحب کے ایک شاگرد نے رد الباقیہ نامی ایک کتاب لکھی تھی جسمیں ملا عبدالباقی کے اعتراضات کے جواب کیا تھا رشیدیہ کے مغلقات کو بھی خوبی سے حل کیا ہے یہ رشیدیہ کی بہترین شرح ہے اُس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتبخانہ میں موجود ہے،

حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۱۳۳ھ نے بھی رشیدیہ کی ایک مختصر شرح لکھی ہے اسکے علاوہ اور علماء نے بھی شروح و حواشی سے اس کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کر دیا ہے، اس

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۵

باب کو دیوان صاحب نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں تصنیف کیا تھا جس کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے،

۲۔ تذکرۃ النحو:۔ یہ مبادیات نحو میں مختصر سا رسالہ ہے اُسے دیوان صاحب نے اپنے چھلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لئے لکھا تھا۔ یہ رسالہ آجکل خلاصہ کے نام سے نحومیر کے آخر میں شائع ہوا ہے، تقریباً دو صفحہ میں دیوان صاحب نے نحو کے جملہ عوامل کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کر دیا ہے،

۳۔ ترجمہ معینیہ :۔ یہ تذکرۃ النحو کی چار ورقی شرح ہے جو اپنے صاحبزادے معین الدین کے لئے لکھی تھی یہ شرح عصر وعشا کے درمیانی قلیل وقفہ میں تحریر کی تھی۔

۴۔ ہدایۃ النحو:۔ یہ بھی فن نحو میں ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ خانقاہ رشیدیہ میں نہیں ہے،

۵۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ (عربی)

۶۔ شرح اسرار المخلوقات (عربی) صاحب تجلی نور: اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔ شرحی بعربی بغایت مستحسن وخوب، عربی میں نہایت عمدہ اور بہتر شرح ہے،

۷۔ زاد السالکین:۔ فن تصوف میں مختصر سا مگر جامع رسالہ ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سلیس فارسی زبان میں قریب الفہم بنا کر پیش کیا گیا ہے،

۸۔ مقصود الطالبین۔ اوراد و اذکار میں مختصر سا رسالہ ہے،

۹۔ حاشیہ شرح مختصر عضدی (عربی) ۱۰۔ حاشیہ کافیہ ابن حاجب، ۱۱۔ دیوان شمسی

۱۲۔ مکتوبات۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹ و نزہۃ الخواطر ج ۵ تجلی نور ص ۲، وسمات الاخیار ص ۴۵

ان کتابوں میں صرف رشیدیہ۔ تذکرۃ النحو۔ مکتوبات طبع ہو سکی ہیں بقیہ کتب میں چند تو خانقاہ میں ابتک موجود ہیں اور اکثر معدوم ہو چکی ہیں صرف کتابوں میں انکا ذکر ملتا ہے۔

وفات | آپ کو شعبان کی آخری تاریخوں سے بخار آنا شروع ہوا علاج معالجہ کے باوجود حالت دن بدن بگڑتی گئی نقاہت و ضعف میں اضافہ ہوتا رہا لیکن معمولات میں فرق نہیں آنے پایا، نماز باجماعت معمول کے مطابق ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ یوم پنجشنبہ کو کمزوری بے حد بڑھ گئی اور تیمم کر کے پلنگ ہی پر نماز پڑھی رات کو حالت زیادہ خراب ہو گئی لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے تیمم کیا اور تہجد میں مشغول ہو گئے اس سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق ذکر بالجہر میں مشغول ہو گئے، آواز اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کیلئے تحریمہ باندھنا چاہا تو لوگوں نے بتایا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے فرمایا کہ میاں ہو گیا ہے اور لیٹ گئے صبح صادق کے قریب اٹھے تیمم کیا لیکن اس بار شدت ضعف سے تیمم کرنے میں بھی دشواری پیش آئی مگر کسی طرح تیمم کر کے فوراً لیٹ گئے، لوگ نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور آپ بھی تحریمہ باندھ کر نماز میں مصروف ہو گئے دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ نویں رمضان ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کر گئی،

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دیوانے نے موت پائی ہے

آپ کے تلمیذ خاص و خلیفہ اجل شیخ محمد ماہ دیوگامی اعظم گڈھی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشید آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گنجینۂ علم و فن اور مخزن رشد و ہدایت کو سپرد خاک کر دیا گیا،[۵]

---

[۵] سماتت الاخیار ص ۱۱، تجلی نور ص ۲، ج ۱ و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲، ۳ تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ تحریمہ کے وقت وفات ہوئی،

اخلاق وسیرت مزاج میں حد درجہ قناعت و استغنا تھا امراء و سلاطین کے دربار میں جانا قطعاً پسند نہ کرتے تھے چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو شاہجہاں نے ان سے کہا کہ اپنا قائم مقام تجویز کر لو انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا شاہجہاں نے ایک شخص حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپئے زاد راہ کے لئے اور ایک عریضہ دیوان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا دوسرا خط حاکم جونپور مرزا اکرم خاں کے نام روانہ کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے میرے پاس دہلی بھیجدو لیکن زبردستی نہ کرنا دیوان صاحب نے شاہجہاں کی پیش کش کو قبول نہیں کیا بعد میں دو ہزار روپئے بطور نذرانہ پیش کئے مگر اسے بھی قبول نہیں فرمایا۔[1]

سنت نبوی کو حتی الوسع ترک نہ فرماتے۔[2] جملہ امراض میں شہد اور کدو بھی استعمال فرماتے اور شفایاب ہوتے ایک مرتبہ بخار آیا ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی تو آپ نے کدو بھی اور شہد منگا کر استعمال کیا اور بخار زائل ہو گیا، ملا محمود نے تعجب کے لہجے میں فرمایا "کہ دوائے گرم در تپ صفراوی چگونہ مفید شد" دیوان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "شمارا بر قول حکما راعتماد است و مرا بر قول خدا و رسول"[3]

وضو، نماز اور مصلی کی پاکی میں حد درجہ اہتمام تھا جب تک دریا کا پانی ملتا کنوئیں کے پانی سے وضو اور غسل نہیں کرتے تھے۔[4]

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ،

---

[1] گنج ارشدی ق ۱و: ۲۰۲ و نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ و سمات الاخیار ص: تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۹

[2] تجلی نور ص ۷۲ ج ۱۔

[3] سمات الاخیار۔ گنج ارشدی ق: ۱۴۰ [4] گنج ارشدی ق ۱۳۶

تا کسے بجمعیت خاطر با حتیاط وضو کند نماز او ہم بجمعیت میسر آید و چوں در وضو
احتیاط نمی کند در نماز تفرقہ خاطر آید[1]

ماء مستعمل اگر کپڑے میں لگ جاتا تو اسے دھوتے اور فرماتے کہ ہر چند موافق
فتویٰ آب آن طاہر است اما تقویٰ شستن را می خواہد[2]

علمی کمالات کے ساتھ بڑے شجاع و دلیر تھے، تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے، ایک مرتبہ سیر کو نکلے آپ کے شاگرد شیخ عبد الشکور منیری بھی ہمراہ تھے، راستے میں نواب شاہ نواز خان قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، آپ اس کے قریب پہنچے تو ایسے مقام پر بیٹھ گئے جو تیر کی آماجگاہ اور شیخ عبد الشکور منیری سے فرمایا کتاب لاؤ کچھ پڑھ پڑھا لیا جائے اور درس شروع کر دیا اثنائے درس میں ایک تیر بالکل چہرے کے پاس سے گذر گیا مگر تقریر میں کسی طرح کا انتشار نہ پیدا ہوا، نواب آپکی اس جرارت و شجاعت پر متحیر ہو گیا،[3]

زہد و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ پختہ تعمیر پسند نہ تھی اگر کسی کو مضبوط عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ یہ کیا بے خبری ہے کہ شیٔ فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے خانقاہ کا چھپر بہت معمولی تھا ایک دفعہ کثرت بارش کی وجہ سے اس قدر پانی ٹپکا کہ گدی میں پانی بھر گیا، ایک صاحب نے کہا کہ عمدہ قسم کا چھپر بنا دیا جائے تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا

چھپر برائے منع آب ساختند برائے منع آفتاب است چرا کہ ایام بارش چہار ماہ
است اول و آخر کم بار دو در میان ہم شب و روز باستیعاب بارش نمی شود اگر
کسے حساب نماید پانزدہ شانزدہ روز خواہد بود ویں کار عاقل نیست کہ برائے
اینقدر ایام خانہ سازد و آفتاب تمام روز می باشد خانہ برائے آنست،[4]

---

[1] گنج ارشدی ۱۴۰، [2] تجلی نور ج۱ ص ۱۱، [3] گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۳۱ [4] گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۵

پالکی کے مقابلہ میں گھوڑے کی سواری پسند تھی اکثر پیدل چلتے تھے اور بہت تیز چنانچہ نماز فجر کے بعد جونپور سے چلتے اور رسنڈ واڈیہہ میں جو جونپور سے ۴۳ میل کے فاصلہ پر ہے ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرتے،[1]

وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ کفن تن عامہ نہ دیا جائے اور نہ ایصال ثواب کے لئے گوشت وغیرہ دعوت کی صورت میں پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ سوگ منایا جائے، نہ قبر کو پختہ بنایا جائے[2]

اولاد سبد آنیاض نے دیوان صاحب کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے ۹ نو بچے پیدا ہوئے جن میں ۳ تین لڑکیاں اور ۲ دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے[3]

۴ چار لڑکے زندہ رہے اور اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، سب سے بڑے شیخ محمد حمید تھے اور سب سے چھوٹے شیخ غلام قطب الدین درمیان میں شیخ محمد ارشد و شیخ غلام معین الدین تھے، ان چاروں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں،

(۱) شیخ محمد حمید یہ ۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے دیوان صاحب نے تاریخی نام ابو عضد محمد حمید تجویز فرمایا۔ اوائل عمر میں شاہی فوج میں داخل ہوئے، اور فن سپہ گری کے جوہر دکھائے لیکن آخر میں ملازمت ترک کرکے درس و تدریس و افادۂ خلق میں مشغول ہو گئے چند کتب کے علاوہ جملہ کتابیں دیوان صاحب ہی سے پڑھی تھیں اور اجازت و خلافت بھی دیوان صاحب سے حاصل تھی، ان کی ذکاوت و خطانت اور مہارت علم پر خود دیوان صاحب کو پورا اعتماد تھا ایک دفعہ ایک تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحب شیخ پورہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے تھے

[1] گنج ارشدی و سمات الاخیار [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۰ [3] گنج رشیدی [4] گنج ارشدی [5] اور ص ۱۵،

میں شیخ محمد حمید بھی تھے، قاضی الہ آباد شیخ محمد آصف دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک تصنیف (حاشیہ تفسیر بیضاوی) ملاحظہ کیلئے پیش کی، دیوان صاحب نے شیخ حمید کو دیدیا، قاضی کو یہ بات گراں گذری کہ خود نہیں دیکھا اور صاحبزادے کو دے دیا وہ کیا دیکھیں گے، اور شیخ محمد حمید کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ چند مقامات پر کچھ اشکال ہیں، اگر آپ رفع فرمادیں تو نوازش ہوگی اور چند سخت اشکالات پیش کر دئے، شیخ محمد حمید نے سنتے ہی مدلل تشفی بخش جواب دیا، قاضی صاحب اس حاضر دماغی اور تبحر علمی پر حیرت زدہ ہوئے،[1]

سرعت تحریر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے ایک دفعہ ایک طالب علم نے درخواست کی کہ مجھے حسامی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی، آپ نے اسی رات کو پوری حسامی لکھکر اس طالب علم کے حوالہ کر دی،[2]

دیوان صاحب کے مرض الموت میں امامت آپ ہی کے سپرد تھی، دیوان صاحب کی وفات کے بعد شہر کے علماء و مشایخ نے دستار جانشینی آپ کے سر پر باندھ کر آپ کو دیوان صاحب کی جگہ پر بیٹھانا چاہا جسکے آپ مستحق بھی تھے لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور مجلس کے اختتام پر فرمایا،

عزیزان خواستند کہ درمیان برادران منازعت پیدا نمایند الحمد اللہ کہ نشد[3]،

اپنے جد امجد شیخ محمد مصطفیٰ کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں بحالت مسافرت ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ کو بعمر ۴۹ سال رحلت کی، نعش جونپور لاکر رشید آباد میں دیوان صاحب کے جوار میں دفن کی گئی،[4]

(۲) ۔ شیخ محمد ارشد:۔ ان کی ولادت ۱۰۴۱ھ میں ہوئی، دیوان صاحب نے ابی الکشف

---

[1] گنج ارشدی ج ۱ و ۱۶۱، [2] ایضاً ورق ۱۶، [3] ایضاً ورق ۱۶، [4] ایضاً ورق ۱۶،

محمد ارشد سے تاریخ پیدائش نکالی اور بدر الحق لقب عنایت فرمایا اکثر کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور چند اساتذ الملک سے، بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل کر لیا اور دیوان صاحب نے خرقۂ خلافت سے مشرف فرمایا،[1] روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر تک درس و تدریس میں رہتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کرکے پھر افادۂ طلبہ میں منہمک ہو جاتے، اس مشغولیت کے باوجود نماز تہجد اور اشراق و چاشت کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، ریاضت شاقہ کے برداشت کرنے میں بالکل دیوان صاحب کے مثیل تھے[2] سنت نبوی پر شدت کے ساتھ عمل تھا، بیماروں کی تیمارداری اور جنازوں میں شرکت کا خاص اہتمام تھا، توکل اتنا تھا کہ اگر کبھی فاقہ کی نوبت آ جاتی تو بھی خوشی کا اظہار فرماتے، دیوان صاحب کو آپ کے زہد و تقویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ پورنیہ کے سفر میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستور ہے کہ جب دوست دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے آپ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونگے تو کیا ہدیہ پیش کریں گے، دیوان صاحب یہ سنکر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ ارشد پیش کر دونگا،

تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ محمد ارشد کا مقام دیوان صاحب کے بعد سب سے بلند ہے، آپ کو ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو بخار آنا شروع ہوا خاندانی طبیب گلشن مرادیہ کا علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، متعلقین نے دوسرے اطباء کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا، بخار بدستور قائم رہا اور ضعف و نقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، دوران مرض میں ایک دن مفتی محمد جمیل صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے اور حال دریافت کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے،

۱۔ گنج ارشدی ص ۱۰۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۰۔ ۳۔ گنج ارشدی ص ۱۱ و سمات الاخیار

دل بشکی آب پری پکری نمی دانم چه شد — درد سرباقی بجا او سرنمی دانم چه شد
ای که میگوی چرا آشفته خاطر گشته — دل بزلفش بسته ام دیگر نمی دانم چه شد

غرض مرض بڑھتا گیا نقل و حرکت کی طاقت سلب ہو گئی ۲۴ جمادی الآخر کو عصر کی نماز شروع کی تو کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ارکان پورے طور سے ادا نہ ہو سکے یہ حالت دیکھ کر آپ کے جانشین اور خلیفہ شیخ غلام محمد رشید بن محب الدین بن ارشد رونے لگے اور عرض کی کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجائے وہ دنیا میں باقی نہیں رہتا، ایسا ہی ہوا، ۲۴ جمادی الآخر ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمۂ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہو گئے،
پسماندگان میں تین[۳] صاحب زادے اور ایک صاحبزادی اور تقریباً ۲۴ خلفاء اور بے شمار تلامیذ وارادتمند چھوڑے[۱]،

۳- شیخ غلام معین الدین :- ان کی پیدائش ۲۴ شوال ۱۰۶۳ھ کو ہوئی ان کے اور شیخ ارشد کے درمیان میں دیوان صاحب کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر بچپنے ہی میں سب کے سب فوت ہو گئے،

دیوان صاحب نے آپ کا تاریخی نام ابوالواعظ رکھا،[۲] دیوان صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی ان کی اکثر معروضات کو دیوان صاحب کے دربار میں قبولیت حاصل تھی،[۳] انھوں نے ابتدائی کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور متوسطات کو شیخ ارشد سے ۲۹ رمضان ۱۰۸۰ھ کو جمعہ کے دن دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۰۸۳ھ کو ان کی وفات سے چند ماہ پہلے خلعت خلافت سے مشرف ہوئے،[۴]
غلام معین الدین نے درس و تدریس کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا لیکن اصلاح

---

[۱] سمات الاخیار ص ۸۵، [۲] گنج ارشدی ورق ۲۱ [۳] گنج ارشدی ۶ او ۲۱، [۴] ایضاً ۲۰،

باطن و تزکیۂ نفس سے کبھی غافل نہیں ہوئے، تقوی، طہارت، عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، آپ فرماتے تھے کہ

مرادر سیاگری از مجلس شرمندگی می آید اما وقتی کہ کمالات قطب الاقطاب
ذات پیر دستگیر مذکور می شود شرمسار می گردم کہ ازاں بزرگان نسبت دارم و ہیچ
وصف حضرات ایشان در خود نمی بینم [۱]

شاہ عالم کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اثنائے راہ میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ صحیح
کو وفات پائی، تابوت جونپور لایا گیا اور اپنے آبائی قبرستان رشید آباد میں شیخ ارشد کے پائیں دفن
ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۳ سال ۱۱ ماہ ۲ دن تھی، آپ کے چھوٹے بھائی غلام قطب الدین نے
یہ تاریخ وفات لکھی،

حریف نفس را دولت قرین بس شہید زہد را قصر بریں بس
فنا فی اللہ چوں گشتی رسالت معین الدیں ترا ایزد معیں بس [۲]

۲۔ شیخ غلام قطب الدین:- ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے،
اپنی تاریخ پیدائش آپ نے خود بیان کی ہے،

[۳]
روز آدینہ یازدہم ربیع الثانی

۱۰۸۰ھ میں دیوان صاحب سے بیعت اور مشرف بخلافت ہوئے [۴]، ایک دن شیخ ارشد
اہل تصوف کا لباس زیب تن کئے ہوئے مجلس میں بیٹھے تھے، ملا محمد نصیب خلیفہ شیخ محمد ارشد
نے عرض کیا کہ آپ درویش ہیں یا سپاہی، برجستہ جواب دیا کہ،

[۱] گنج ارشدی و ۲۱ . [۲] گنج ارشدی ۲۱، سمات الاخیار [۳] گنج ارشدی ۲۰۲
[۴] ایضاً و ۲۲

نہ پاہی نہ درویش من طالب علم ام	میں پاہی ہوں نہ ولی بلکہ ایک طالب العلم ہوں

شیخ ارشد یہ جواب سنکر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سچ کہا۔[۱]

صبح دو گھنٹہ تلاوت کے بعد ذکر واذکار میں مشغول ہو جاتے اس سے فراغت کے بعد مطالعہ کتب میں لگ جاتے فارسی اور ہندی کے اشعار بہت عمدہ کہتے تھے تاریخ نویسی میں کمال حاصل تھا، جراُت وشجاعت میں یکتا ے روزگار تھے،

گنج رشیدی ملفوظات قطب الاقطاب (دیوان صاحب) اکثر مطالعہ میں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ

از مطالعہ این خود را در مجلس قطب	اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو
الاقطاب می پایم،[۲]	دیوانصاحب کی مجلس میں پاتا ہوں،

اسی برس کی عمر میں جمادی الاولی ۱۱۴۳ھ کو چہار شنبہ کے دن رحلت فرمائی، شیخ غلام محمد رشید جانشین شیخ ارشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔[۳]

دیوان صاحب کے خلفاء ومجازین:۔ آپ کے خلفاء کی تعداد تقریباً چالیس[۴] ہے ان میں مشاہیر کے نام یہ ہیں،

(۱) شیخ محمد ارشد:۔ انکا مفصل ترجمہ گذر چکا ہے،

(۲) شیخ میر سید قیام الدین:۔ یہ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے لیکن گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی اسی لئے گورکھپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے،

(۳) شیخ میر سید جعفر پٹنوی:۔ دیوان صاحب کے خلفاء میں آپکا مقام بہت بلند ہے،

---

[۱] گنج ارشدی ۲۲ [۲] گنج ارشدی ۳۲ و سماة الاخیار [۳] سماة الاخیار بحوالہ گنج فیاضی قلمی، گنج ارشدی ۳۲۵

دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے حضرت کے طفیل بخش دیگے آپکا دور

شیخ میر قیام الدین کا مفصل حال سمات الاخیار میں مذکور ہے ،

(۴) شیخ نصرت جمال عرف ملتانی شاہ جامع گنج رشیدی المتوفی ۱۰۹۰ھ

(۵) شیخ نور الدین مداری المتوفی ۱۰۹۳ھ آپ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہیں

(۶) شیخ عبد الشکور منیری المتوفی ۱۰۹۰ھ آپکو بھی دیوان صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے ،

(۷) شیخ محمد ماہ دیوگامی دیوان صاحب کے خاص شاگرد میں آپ ہی دیوان صاحب کی

نماز جنازہ پڑھائی تھی ،

(۸) شیخ آیت اللہ المتوفی ۱۱۰۰ھ

(۹) شیخ محی الدین متوکل جونپوری

(۱۰) قاضی محمد مودود جونپوری تلک عشرۃ کاملہ ،

ہندوستان کی عربی شاعری
میں
عجمیت پر ایک نظر

از جناب مولانا عبد الجبار صاحب استاد مفتاح العلوم مئو

(۲)

حسنا عرسول اللّٰہ یجئو لربہ　　شفیعاً و فتاحاً لباب المواھب

یہ شعر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ مصرعۂ اول میں یجئو کا صلہ لغتِ عرب کے خلاف ہے، بالکل صحیح ہے، مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو صحیح بنانے کی جو توجیہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہے کہ اصل کلام "یدعو لربہ" تھا مگر تصحیف کی وجہ سے اس کی جگہ "یجئو لربہ" تحریر ہو گیا، ہرگز صحیح نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ یجئو کا صلہ لام عربی زبان میں نہیں اور یدعو کا صلہ لام آتا ہے اس لئے یجئو کی جگہ یدعو کر دیا جائے تو کلام صحیح ہو جائے گا، حالانکہ عربی زبان میں جب یدعو فعل دعا کرنے اور مانگنے کے معنی میں آتا ہے تو جس ذات سے مانگا جائے گا اور دعا کی جائے گی وہ بے صلہ ہو گا اور جس شخص کے لئے دعا کیجائے گی اس کا صلہ لام آئیگا جیسا کہ "قالوا ادع لنا ربك" سے ظاہر ہے، لغتِ عرب کی رو سے ڈاکٹر صاحب کی توجیہ کا یہ مطلب ہوا

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے لئے کسی شفیع اور مفتاح لابواب المواہب سے دعا کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذلک اس لئے ایسی توجیہ ایک عالم ربانی کے کلام کی کیسے صحیح ہوگی،

میرے نزدیک شعر میں کوئی تصحیف نہیں ہے اور شعر کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ "یبخع" چونکہ یخشع کے معنی کو متضمن ہے اور یخشع کا صلہ لام آتا ہے اس وجہ سے یہاں لام آیا، اسطرح کی توجیہ شراح کرتے رہتے ہیں،

عندی علوم لا یکاد یحیطها سماء و لا بر و بحر و ساحل

یہ شعر بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس پر یہ اعتراض ہے کہ یحیط کے بعد "ب" نہ لانا محاورہ عرب کے خلاف ہے "ڈاکٹر صاحب" کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے مگر متقدمین شعراء کے کلام میں بھی صلہ کی اسطرح فروگذاشت ہوئی ہے مگر ان کے شراح نے یہ نہیں فرمایا کہ شاعر نے عرب کے محاورہ کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ یہ توجیہ کی ہے کہ یہ منصوب بنزع الخافض ہے یعنی یہاں پر حرف جر تھا مگر ہٹا دیا گیا اس لئے اسم کو منصوب رکھا گیا اس توجیہ کے مطابق یحیطها اصل میں یحیط بها تھا مگر "ب" کو دور کر دینے کی وجہ سے یحیط کے بعد ہا منصوب ہو گیا،

مروان بن الحکم کے عہد کا ایک شاعر ہے جس کو حبیب بن اوس طائی نے باب الحماسہ میں درج کیا ہے

وسائله بالغیب عنی وسائل ومن یسئل الصعلوک این مذهبه

کتنی عورتیں اور کتنے مرد مجھکو پس پشت پوچھتے ہیں آخر مجھ محتاج مفلس کو کون پوچھتا ہے کہ اس کا راستہ کہاں ہے،

عربی محاورہ یہ ہے کہ جس کو پوچھا جائیگا اس پر عن کا صلہ ضرور

داخل ہوگا جیسا کہ پہلا مصرعہ اور یسئلونک عن الساعۃ میں عن مسئول عنہ پر داخل ہے
اسی قاعدہ سے دوسرے مصرعہ میں من یسئل عن الصعلوک تقاعن نکال دینے سے الصعلوک
منصوب بنزع الخافض ہوگیا،

جاہلی شاعر عنترہ کے قول ؎ ولقد ابیت علی الطوی واظلہ کی توجیہہ کرتے ہوئے
صاحب اقرب الموارد لکھتے ہیں ای اظل علیہ فحذف حرف الجر فحاجز فمن
قول لولا الاسی لقضانی ای لقضی علی،

جب عرب شعراء کے کلام میں اس قسم کی توجیہات کی گئی ہیں تو ہندوستانی
شعراء کے کلام کو کیوں اس سے محروم رکھا جائے،

؎ لاح دار العمل وحال الحول   دار کاس المدام راس للحول

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں " دار" اور "کاس" مؤنث سماعی ہیں اس لئے ان فاعلوں
کے فعل عربی قواعد کے مطابق لاحت اور دارت ہونا چاہیے"
اس اعتراض کو پڑھ کر اس لئے تعجب ہوا کہ فعل کے مذکر و مؤنث لانے کا قاعدہ
نحو میر اور نحو کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں مثال کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مؤنث سماعی
مظہر فعل کا فاعل واقع ہو جیسا کہ اس شعر میں ہے تو فعل کو مذکر اور مؤنث لانا دونوں
صحیح ہے" نحو میر میں ہے " بدانکہ چوں فاعل مؤنث حقیقی باشد یا ضمیر مؤنث علامت تانیث
در فعل لازم باشد چوں قامت ہند و ہند قامت، و در مظہر مؤنث غیر حقیقی و در مظہر جمع
تکسیر دو وجہ روا باشد چوں طلع الشمس وطلعت الشمس و قال الرجال، و
قالت الرجال،،
پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ عربی زبان میں دو ساکن حروف متصل نہیں ہوا کرتے

علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، کیا وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل نہیں ہوتے جبکہ کلمہ کے آخری حرف سے پہلے حرف ساکن ہو، جیسے غفور، شکور، حلیم، حساب، کتاب، یعلمون، کافرون وغیرہ سینکڑوں ایسے کلمات ہیں جنہیں وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل ہوتے ہیں اور تلاوت قرآن کریم کے وقت تمام علماء و قراء اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، غیر وقف میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے جیسے وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں ضاد کے بعد الف اور لام اوّل دونوں ساکن ہیں اور ایسے بہت سے کلمات قرآن کریم میں موجود ہیں "

ڈاکٹر صاحب نے یہی اعتراض باقر آگاہ کے اس شعر پر کیا ہے،

ہ وصریت نحوی کالنسیم تلطفا نفتفت من طرب! فاح ذکاء

ذکاء عربی زبان میں مؤنث ہے اس لئے فاح ذکاء کی جگہ فاحت ذکاء چاہیے،

ہ مازار طرفی غمض بعد بعدکم والاخیال سرور دار فی خلدی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں خیال سرور فارسی کا اثر ہے عربی میں خیال محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے،،

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ "خیال" عربی میں محبوبہ کی اس تصویر ہی کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے لیکن شیخ احمد تھانیسری کے علاوہ غیر عجمی محقق علماء نے خیال کو اس معنی میں استعمال کیا ہے جس کو ڈاکٹر صاحب فارسی کا اثر کہتے ہیں، علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اپنی کتاب تفسیر روح المعانی میں قرآن کریم کے حروف مقطعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "والذی یغلب علی الظن ان تحقیق ذالک علم مستور وسر محجوب عجزت العلماء کما قال ابن عباس عن ادراکہ وقصرت خیول الخیال عن لحاقہ[1]

---

[1] روح المعانی،

علامہ ابن الہمام خط سترہ کی بحث میں لکھتے ہیں: "والسنۃ اولی بالاتباع مع انہ یظہر فی الجملۃ اذا المقصود جمع الخاطر بربط الخیال بہ کیلا ینتشر[۱]"۔

سترہ کی بحث میں علامہ ابن عابدین شامی ناقلاعن الحلیۃ لکھتے ہیں: ویظہر ان الاولی اتخاذ ہا فی ہذا الحال وان لم یکرہ الترک لمقصود آخر وہو کف بصرہ عما ورائہا وجمع خاطرہ وربط الخیال بہا کذا فی رد المختار[۲]۔

لغت کی کتاب سے بھی اس استعمال کی تائید ہوتی ہے،

الخیال ما تشبہ لک فی الیقظۃ والحلم من صورۃ والظن، والوہم، وشخص الرجل و، طیفہ و، طلعۃ

ان محقق علماء اور کتب لغت کی شہادت کے بعد اس محاورہ کو فارسی کا اثر کہنا صحیح نہیں، آخر میں ایک جاہلی شاعر حارث ابن عباد کا شعر پیش کیا جاتا ہے جس نے لفظ خیال کو اپنے شعر میں استعمال کیا ہے ؎

قربا مربط النعامۃ منی ۔۔۔ لقحت حرب وائل عن خیال

کیا اس شعر میں خیال کے وہی معنی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں؟ یا وہم و خیال مراد ہے،

؎ جفتنی فذہبتی فغضت بغیظۃ ۔۔۔ فذہبت بشجن بین جنبی یشقق

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی، اور مجھے دھکے دئے پھر سخت غیظ وغضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم واندوہ دیکر نکال دیا جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا ہے" یہ ترجمہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

---

[۱] فتح الملہم ج ۲ صفحہ ۱۰۳ ، [۲] ملاحظہ ہو فی مرنات الطرب من اغانی العرب فی قصیدۃ حارث العباد "

غظت کو واحد مؤنث غائب کا صیغہ غاظ یغیظ سے قرار دیتے ہیں، حالانکہ فنی صرف کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ غاظ سے واحد مؤنث غاظت ہوگا جیسے باع سے باعت لطف یہ ہے کہ غظت سے شعر کا وزن بھی درست نہیں ہوتا، شاعر کے نزدیک واحد مؤنث غائب کا صیغہ نہیں ہے ورنہ وہ غاظت کہتا اور شعر کا وزن بھی درست ہو جاتا،

حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک غظتُ ربعتُ کے وزن پر غاظ واحد متکلم کا صیغہ ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب دوسرے مصرعہ میں ذبتُ کو ذبّ یذبّ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بھی واحد متکلم کا صیغہ ذبتُ ہے، ذَابَ یذُوبُ سے قُلتُ کے وزن پر،

ڈاکٹر صاحب کی تجویز سے شعر لفظاً تو درست ہو جاتا ہے اور اس کے وزن میں انکسار نہیں پیدا ہوتا مگر معناً بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، فطری بات ہے کہ جو دھکہ کھاتا ہے اس کو غم و غصہ ہوتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میرے ساتھ محبوبہ نے ناروا سلوک کیا اور مجھے دھکا دیا تو مجھے غصہ آیا اور گویا غم سے آگ لگ گئی اور میں پگھل گیا اور غم میرے پہلو میں موجزن رہا، اس لئے یقیناً شعر میں غظتُ واحد متکلم کا صیغہ ہے، عربی قواعد سے کسی طرح واحد مؤنث غائب کا نہیں ہو سکتا لیکن غظت کا استعمال یہاں پر عربی زبان کے محاورہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ غاظ یغیظ دوسرے کو غصہ دلانے کیلئے عربی زبان میں بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے "یغیظ بہم الکفار" خود غصہ ہونے کے لئے اغتاظ باب افتعال سے مستعمل ہے اور تغیظ باب تفعل سے،

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

لمحہ بہ لمحہ رنگ تغیر بشر میں ہے
عمر رواں کے ساتھ ہر انساں سفر میں ہے

آسودگیٔ زیست کب اسکی نظر میں ہے
انساں ہنوز کشمکشِ خیر و شر میں ہے

تحریک اور جمود کے فرق آشنا ہیں ہم
منزل رسی میں کب ہے جو لذت سفر میں ہے

جب چشمِ التفات اٹھی تھی مرے لئے
وہ حسنِ اتفاق ابھی تک نظر میں ہے

مانگے کی چیز ہیں نکہت و نور و دلکشی
اپنا بھی کوئی حسن نمودِ سحر میں ہے

کیونکر بیاں ہو اشکِ محبت کی آب و تاب
وہ بات رنگِ گل میں نہ آبِ گہر میں ہے

دامن سے خار الجھے ہیں وہ بھی کبھی کبھی
پھولوں نے جو سلوک کیا ہو نظر میں ہے

اب اسکے بعد کوئی تغیر نہ انقلاب
یہ پہلوئے سکوں بھی غمِ معتبر میں ہے

میرا خدا شفیق، مرا ناخدا رفیق
یہ اور بات ہے مری کشتی بھنور میں ہے

مجکو مجالِ عرضِ تمنا تو ہے عروج
لیکن مآلِ عرضِ تمنا نظر میں ہے

غزل

از جناب سید رفیع الدین صاحب سالک رحمانی

مزاجِ نکہتِ گل آج برہم ہے مگر کیوں ہے
تلاطم خیز موجِ قلبِ شبنم ہے مگر کیوں ہے

ہزاروں سال سے فطرت ہے مصروفِ خود آرائی
پراگندہ ابھی تک زلفِ عالم ہے مگر کیوں ہے

جو احساسِ دل کی تھی وجہ فزوں شغلِ دل مگر کیوں تھی
ترے نالوں میں اب تاثیرِ غم کم ہے مگر کیوں ہے

حیات افروز اک پیغام ہم لائے تھے دنیا میں
ہماری زندگی اب شورِ ماتم ہے مگر کیوں ہے

شکستِ جام و مینا سے ہے میخانہ میں ہنگامہ
شکستہ سازِ دل تقدیرِ آدم ہے مگر کیوں ہے

یہ رازِ آفرینش راز بن کر رہ نہیں پایا
شعورِ آدمیت پھر بھی مبہم ہے مگر کیوں ہے

ہم اہلِ دل ہیں عالم کے حقائق ہم پہ روشن ہیں
فریبِ خود نگاہی پھر بھی پیہم ہے مگر کیوں ہے

ہمیں ترکِ تعلق سے تمہارے کچھ نہیں شکوہ
کہ اب اس شہر میں جنسِ وفا کم ہے مگر کیوں ہے

وہ دھڑکن جس سے تھی احساس میں افسونگری سالکؔ
وہ دھڑکن زندگی کی آج مدھم ہو مگر کیوں ہے

غزل

از جناب ساحلؔ ناگپوری

میں اپنی محبت کا چھیڑوں اگر افسانہ
سن لے جو کوئی ساحل ہو جائے وہ دیوانہ

پینے کا ہمارے ہے انداز جداگانہ
مخمور تو ہیں لیکن بادہ ہے نہ پیمانہ

اسرارِ حقیقت ہیں جو میری زباں پر ہو
کہنے کے لئے کہہ لے دنیا مجھے دیوانہ

ویرانے کی وسعت کو اربابِ خرد جانیں
میں نے تو یہ دیکھا ہے ذرّے میں ہے ویرانہ

محسوس یہ ہوتا ہے تو دور نہیں مجھ سے
معلوم یہ ہوتا ہے میں تجھ سے ہوں بیگانہ

ہم سوختہ جاں واقفِ آدابِ محبت ہیں
پھرتا ہے نگاہوں میں جلتا ہوا پروانہ

میں کون ہوں اے ساحلؔ یہ راز نہیں کھلتا
دیوانوں میں دیوانہ فرزانوں میں فرزانہ

مطبوعات جدیدہ

آپ بیتی یا یادِ ایام :- چار حصّے از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ تقطیع چھوٹی ضخامت بالترتیب، ۱۲۴، ۱۸۰، ۳۰۲، ۲۰۲،۴ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عـــہ ر

پتہ کتب خانہ یحیوی مظاہر العلوم سہارنپور،

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی ذات بابرکات اس دور میں شریعت وطریقت کی شمع فروزاں اور ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا روحانی فیض آپ ہی کی ذات سے جاری ہے، اور گنگوہ، نانوتہ تھانہ بھون اور رائے پور کی خانقاہوں کا جلوہ سہارنپور میں یکجا نظر آتا ہے،

ع انچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

بزرگوں کے حالات وملفوظات وہ صحیفۂ ہدایت ہیں جنکی رہنمائی ہمیشہ قائم رہتی ہے اس لئے حضرت شیخ کے متوسلین کی دیرینہ تمنا تھی کہ آپ اپنے حالات قلمبند فرمادیتے مگر آپکے مشاغل میں اتنی فرصت کہاں تھی اتفاق سے آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں دو مرتبہ علی گڈھ میں کسی قدر طویل قیام کا اتفاق ہوا، اس زمانہ میں ہر قسم کے علمی وتعلیمی کاموں کی ممانعت

تھی اس لئے متوسلین کی درخواست پر اپنے حالات املا کرا دئے جنکو مزید ترمیم و اضافہ کے بعد کتب خانہ یحیوی نے چار حصوں میں شائع کیا ہے اس میں بچپن سے لیکر اب تک کے حالات آ گئے ہیں،

حضرت شیخ کی پوری زندگی درس و تدریس تالیف و تصنیف، ارشاد و ہدایت اور تجدید و اصلاح خصوصاً حدیث نبوی کے درس و تالیف میں گذری اس لئے آپ بیتی کا ہر ورق بصیرت افروز جہاد کی و معرفت کا درس اور مذہبی علمی اور تعلیمی معلومات کا خزانہ ہے اس ضمن میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی بھی تاریخ آ گئی ہے،

حضرت شیخ کا تعلق ایسے دودمان عالی اور تصوف کے ایسے سلسلۃ الذہب سے ہے جو علم و عمل اور شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھا جس میں ہر زمانہ میں بڑے بڑے علما و مشائخ اور اہل اللہ پیدا ہوتے رہے انھیں کے دامن میں حضرت شیخ کی نشو و نما ہوئی اور زندگی کے ہر حصہ میں ان سے گہرا رابطہ رہا ہے، اس لئے آپ بیتی کے ضمن میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد یحییٰ، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس شاہ عبد الرحیم اور شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری اور اس دور کے دوسرے بزرگوں کے جستہ جستہ سبق آموز حالات آ گئے ہیں، اسطرح یہ کتاب اس دور کے بزرگوں کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جس سے اس زمانہ کا پورا علمی مذہبی اور روحانی ماحول سامنے آ جاتا ہے اسکو پڑھکر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، یہ اس کتاب کا نمایاں پہلو ہے اور وہ بھی مذہبی علمی تعلیمی اور اخلاقی و روحانی فوائد اور گوناگوں مفید معلومات پر مشتمل ہے اسکا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے اس میں ان سب کے طالبین کے ذوق کا پورا سامان موجود ہے، یہ کوئی مرتب تصنیف نہیں بلکہ ارتجالاً املا کرائی

گئی ہے اس لئے انداز بیان سادہ اور بے تکلف مگر شگفتہ اور دل آویز ہے۔ جا بجا لطائف و ظرافت کی چاشنی حضرت کی جمالی شان کا مظہر ہے۔

صحبتے با اولیاء: مرتبہ مولانا محمد تقی الدین صاحب ندوی مظاہری

تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۵ روپے

پتہ (۱) کتب خانہ یحیوی مظاہر العلوم سہارنپور (۲) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ کتاب حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یوں تو حضرت کا چشمۂ فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے مگر رمضان المبارک میں جو نزول برکات اور اہل اللہ کے ذوق و شوق کا خاص مہینہ ہے اس میں اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، حضرت پورے مہینہ کا اعتکاف فرماتے ہیں اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے استفادہ کیلئے طالبین کا ہجوم ہو جاتا ہے اور سہارنپور کی نو تعمیر جامع مسجد درسگاہ صفہ اور یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم کا مظہر بن جاتی ہے اس زمانہ کے ملفوظات خصوصیت کے ساتھ قلمبند کرنے کے لائق ہوتے ہیں جس کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی خوش قسمتی سے مولانا تقی الدین کو جو حضرت کے شاگرد بھی ہیں اور مرید با اختصاص بھی، اسطرف گذشتہ دو تین سال رمضان میں حضرت کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی انھوں نے اس زمانہ کے ملفوظات و ارشادات قلم بند کر لئے۔ اب اس گنج گرانمایہ کو مجلس معارف ترکیسر سورت نے صحبتے با اولیاء کے نام سے شائع کیا ہے یہ ملفوظات اصلاح نفس کا نسخہ احسان و تصوف کا عطر اور سلوک و معرفت کا درس ہیں۔ شروع میں مرتب کے قلم سے کتاب کا تعارف اور مولانا علی میاں کے قلم سے ایک موثر اور دلنشین مقدمہ اور حضرت شیخ کے معمولات کا نقشہ ہے جو بجائے خود سلوک و طریقت کے سبق کی حیثیت رکھتا ہے، دونوں کتابیں اپنے فوائد کے لحاظ سے مسلمانوں خصوصاً سالکین طریقت کے

مطالعہ کے لائق ہیں۔

ہندوستانی مسلمان پر ایک نظر:۔ مؤلفہ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع بڑی ضخامت صفحات ۲۳۲، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۳؍ پتہ ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا علی میاں کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے اور نئے نئے رنگ میں جلوہ دکھاتا ہے، ہندوستانی مسلمان انکی تازہ تصنیف ہے اس میں ان کی مذہبی و معاشرتی زندگی آداب و تہذیب رسم و رواج اور عادات و خصائل کا نقشہ دکھایا ہے کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں پیدائش سے لیکر بلوغ تک، دوسرے میں بلوغ سے موت تک کے رسوم تیسرے میں تہذیب و معاشرت کا نقشہ چوتھے میں مذہبی تہواروں، پانچویں میں عبادات و فرائض کا ذکر چھٹے میں بعض مذہبی و ملی خصوصیات پر تبصرہ ہے جس سے اسکا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، مصنف کا مقصد صاف ستھرے دیندار گھرانوں کی اسلامی معاشرت کا نقشہ دکھانا ہے اس مقصد میں یہ کتاب پوری طرح کامیاب ہے اس سے اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے کہیں کہیں بعض غیر اسلامی رسوم بھی نقد و تبصرہ کے بغیر نقل کر دی ہیں، مصنف کی دوسری علمی تصانیف کے مقابلہ میں یہ کتاب اگرچہ ہلکی پھلکی ہے لیکن افادہ عام کے لحاظ سے انسے زیادہ مفید ہے اور علمی کتابوں کی محنت و کاوش کا بار ہلکا کرنے کیلئے اس قسم کی تحمیض مصنف کے لئے ضروری ہے، "م"

جلد ۱۱۰ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یوں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں مگر ان میں تین زیادہ اہم ہیں، ابتدائی تعلیم، اردو زبان، اور مسلم یونیورسٹی، ان تینوں کے بارہ میں حکومت کی پالیسی صحیح نہیں ہے، ابتدائی تعلیم کا نصاب تمام تر اکثریت کے مذہب اور کلچر کا ترجمان ہے جو مسلمانوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہے، ان کے احتجاج اور حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے باوجود نہیں بدلا گیا، اور مسلمان بچے اسکو پڑھنے پر مجبور ہیں، مسلمانوں نے اسلامی مکاتیب قائم کرکے اس کی تلافی کی کوشش کی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ حکومت کے نظام تعلیم کے متوازی نظام قائم نہیں کر سکتے جس سے ان کو بڑا تعلیمی نقصان پہنچ رہا ہے مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کا کام تھا، ایک سیکولر حکومت کا فرض کیا ہے۔

اردو کی حق تلفی کا اعتراف فرقہ پرست پارٹیوں کے علاوہ اکثریت کے بھی ہر طبقہ کو ہے، اور اسکی حمایت میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اس لیے اب مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، مرکزی حکومت نے اردو بورڈ قائم کیا ہے، اور دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے بھی ایک کرور کی رقم منظور کی ہے، اردو کے مسائل کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو مختلف ریاستوں کا دورہ کرکے ان مسائل کا جائزہ لے رہی ہے، اتر پردیش کی حکومت نے اردو اکیڈمی قائم کی ہے، اور اردو کی تعلیم کیلئے وقتاً فوقتاً احکام جاری کرتی رہتی ہے، اور اس کی نگرانی کے لیے ایک افسر بھی مقرر کیا ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترقی کی جو واقعی شکل ہے، اس کو نہ مرکزی حکومت اختیار کرتی ہے اور نہ صوبائی حکومتیں اصل مسئلہ اردو کی قانونی حیثیت کا ہے، جب تک یہ متعین نہ ہوگی، ساری تدبیریں بیکار ہیں، حکومت کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اردو کے معاملہ میں اس کے پورے عملہ کی ذہنیت

خراب ہے، اور اس سے کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوتا، اس لیے اردو کے بارہ میں اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی،

دوسرے اردو کی تعلیم کا جو فارمولا بھی بنایا جاتا ہے اس میں بھی بہانہ جوئی اور اردو کا راستہ روکنے کی پوری گنجایش رہتی ہے، چنانچہ سہ لسانی فارمولا اس لیے بنایا گیا تھا کہ علاقائی زبانوں کی تعلیم کی گنجایش نکل سکے لیکن اترپردیش کی حکومت نے اس میں سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ بند کر دیا، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا اصول سب کے نزدیک مسلم ہے لیکن دس اور چالیس فی صدی طلبہ کی قید نے اردو کی تعلیم عملاً ناممکن بنا دی ہے، جہاں یہ تعداد پوری بھی ہو جاتی ہے، وہاں بھی مختلف بہانوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاتا، ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی یہی حال ہے، بلکہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اسکول کے منتظمین اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے ہیں، مگر افسران بالا اس میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ ان ساری مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، خاص طور سے اترپردیش اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے یا کم سے کم آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی اور اہم سرکاری کاموں میں اردو کا استعمال ضروری قرار دیا جائے، اس کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے، اب آخری امید گجرال کمیٹی سے ہے، دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے،

مسلم یونیورسٹی ایکٹ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ جمہوری نقطۂ نظر سے بھی قابل ترمیم ہے، اس سے اس کا اقلیتی کردار ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ اسکی آزادی بھی سلب ہو گئی، وائس چانسلر کو مختار کل بنا دیا گیا ہے، اور اس کا انتخاب حکومت کریگی، کورٹ اگزکیٹو کونسل اکیڈمک کونسل سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی کثرت ہے، کورٹ کی حیثیت جو سب سے بڑی اور با اختیار مجلس تھی

اب صرف مشیر کی رہ گئی ہے، یونین کی موجودگی میں طلبہ کی کونسل کا قیام ایک مستقل فتنہ ہے، غرض اب مسلم یونیورسٹی وزارت تعلیم کا ایک ماتحت شعبہ بن گئی ہے اسلیے اب یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں رہا بلکہ آزادی اور جمہوریت کے تحفظ کا بن گیا ہے، اسی لیے کانگریس کے علاوہ ساری پارٹیاں اس کی مخالفت میں شریک ہیں، مسلمانوں میں ان کے علاوہ جن کے اغراض حکومت سے وابستہ ہیں، کوئی بھی اسکا حامی نہیں، جنکی حیثیت حکومت کے کارندوں سے زیادہ نہیں ہے، وہ حقیقۃً حکومت کے بھی مخلص نہیں، ان کا مقصد صرف اظہار وفاداری ہے، وہ اپنے غلط مشوروں سے حکومت کو بھی مشکل میں پھنسا دیتے ہیں، ان کا کردار یہ ہے کہ ایک طرف وہ مسلمانوں کے ترجمان بنتے ہیں، مگر پھر حکومت کا منشا دیکھکر اس کے ہمنوا بنجاتے ہیں، چنانچہ اس طبقہ کے مسلمان وزراسے لیکر پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران تک برابر اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کا یقین دلاتے رہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائیگا بلکہ وزیراعظم کو اس کے لیے میمورنڈم بھی پیش کیا، مگر جب اس کے خلاف ایکٹ بن گیا تو اس کے پرزور وکیل بن گئے، ایسے لوگوں کی کیا وقعت ہوسکتی ہے، حقیقۃً وہ حکومت کے اعتبار کے بھی قابل نہیں، مگر اس کو کام ان ہی سے لینا ہے،

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اگر دب بھی جائے تو اس کا زخم مسلمانوں کے دلوں سے مندمل نہ ہوگا اور ناسور بنکر رستا رہے گا، جو نہ ملک کے لیے مفید ہے اور نہ خود مسلمانوں کیلیے، دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ حکومت اس کو اپنے وقار کا سوال نہ بنائے اور اس میں ایسی ترمیم کردے کہ کم سے کم یونیورسٹی کی آزادی باقی رہے، جب دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کا ایکٹ بنے گا تو اتنی ترمیم بہرحال کرنا پڑے گی، اگر پہلے سے یہ ترمیم کردیجائے تو مسلمانوں کی بھی دلجوئی ہوجائے گی، جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے جو ترمیمیں پیش کی ہیں وہ بہت مناسب ہیں، اس سے حکومت کو سچے قوم پرور مسلمانوں کے جذبات کا بھی اندازہ ہوگا۔

مقالات

بعض شبہات اور اُن کا جواب

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مسلمانوں کے اعمال و کردار اور اُن کے زوال و پستی اور ان کے مقابلہ میں مغربی قوموں کی ترقی کو دیکھکر اکثر دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ دور کے مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کی ضروریات کی کفالت سے قاصر ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو پوری مسلمان قوم پر کیوں زوال طاری ہے، اور وہ ہر شعبۂ زندگی میں انحطاط میں کیوں مبتلا ہے، اور مغربی قوموں کی ترقی روز افزوں ہو، اس لیے ان کا نظام حیات ہی قابل تقلید ہے،

بظاہر یہ خیال باوزن ہے لیکن صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے، ہر نظام حیات کا ایک مقصد اور نصب العین ہوتا ہے، اسی کے مطابق اس کی ترتیب عمل میں آتی ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے سارے یا کم از کم اہم اجزا پر عمل ضروری ہے، ورنہ اس سے مطلوب نتائج برآمد نہ ہوں گے، اس کی مثال مشین کی جیسی ہے، جس کے سارے پرزے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور مشین اسی وقت کام دے سکتی ہے جب یہ سب پرزے اپنی جگہ پر ٹھیک چل رہے ہوں،

ورنہ پوری مشین معطل ہو جائے گی، اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عمل اسلامی تعلیمات پر کہاں تک ہے، دوسرا بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مغربی تہذیب سراسر خیر ہے؟ اور وہی انسانی تہذیب و ترقی کا اصلی معیار ہے، اور اس کے سارے عناصر قابل تقلید ہیں،

اسلام مستقل ایک نظام حیات ہے، وہ دنیا کے کسی نظام کا مقلد نہیں، اس کے ظہور کے وقت دنیا میں دو بڑی پرشوکت اور متمدن سلطنتیں ایران و روم کی موجود تھیں، جن کی حکومت مشرق و مغرب کے بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور وہ مادی حیثیت سے ایک اعلیٰ تمدن کی مالک تھیں، اس زمانہ میں ان کی وہی حیثیت تھی، جو آج مغربی قوموں اور ان کی تہذیب کی ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی کی تقلید نہیں کی، اور اپنا مستقل نظام حیات بنایا، جو ان نظاموں سے نہ صرف مختلف بلکہ ان کی ضد اور ان کے لیے پیام موت تھا، اسکے عقائد، تصورات، زندگی کا نصب العین، نظام معاشرت ہر چیز ان نظاموں سے مختلف تھی، اس نے ہر قسم کے شرک کی مخالفت کی، اور ملت اسلامیہ کی بنیاد شرک اور اوہام پرستی کے بجائے توحید، غیر اللہ سے بے خوفی، نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر اسلامی اتحاد، انسانی غلامی اور طبقاتی تقسیم کے بجائے آزادی اور عدل و مساوات، نسلی برتری کے بجائے عمل صالح پر رکھی، اس طرح اس نے اس دور کے سارے بتوں کو توڑ دیا،

اس نے قومی سربلندی اور مادی ترقی کے بجائے خداشناسی، معرفت حق، رذائل اخلاق کے ترک اور فضائل اخلاق سے آراستگی، نیکی اور بھلائی کی تبلیغ اور بدی اور برائی کے ترک کو اس نظام حیات کا مقصد قرار دیا، کلام پاک کی آیات ان احکام و ہدایات سے معمور ہیں، مسلمانوں کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے:

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (حج)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو وہ نمازیں پڑھیں گے زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دینگے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

دوسری آیت میں ہے :-

کُنتُمْ خیر اُمّۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے ہو، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

یہ وصف کسی آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ ان کا نصب العین دنیاوی اور مادی ترقی ہے، لیکن اسلام نے ان میں جو روح پیدا کر دی تھی اور جو نظام حیات بنایا تھا، اس پر عمل کا لازمی نتیجہ دنیاوی شوکت و عظمت ہے، خود قرآن مجید کا وعدہ ہے " انتم الاعلون ان کنتم مومنین" اگر تم سچے مسلمان ہو تو تم کو ہر طرح کی سربلندی حاصل ہوگی۔

دوسری آیت میں ہے

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (نور)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین کی حکومت ضرور دیگا، جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں کو دی تھی اور جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے جما کر رہیگا اور خوف کے بعد ان کو امن سے بدل دیگا۔

یعنی دین و دنیا دونوں کی بھلائی ایمان اور عمل صالح پر منحصر ہے، جب تک مسلمانوں میں یہ وصف رہا، خدا کا وعدہ پورا ہوا۔ اسلام نے ان میں ایسی روح اور خدا کی راہ میں جانبازی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ انھوں نے اس دور کی سب سے بڑی ایران اور روم کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ان کے ملک کے وارث بنے۔

یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کا لازمی نتیجہ ہے، اسلام دین و دنیا کا جامع ہے۔ اس کی دعا ہی یہ ہے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ"۔ حدیث میں ہے کہ "دنیا کا کام اس انہماک سے کرو کہ تم کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور دین کا کام اس انہماک سے کرو کہ کل ہی مرجانا ہے"۔ اسلام محکومیت کے لیے آیا ہی نہیں، اس لیے اس میں محکومی کی زندگی کے قوانین ہی نہیں ہیں، اس کا مقصد دنیا میں خدائی قانون کا نفاذ ہے، چنانچہ جیسے ہی اس میں طاقت آئی، اس نے حکومت الٰہیہ کی بنیاد رکھ دی، اس لیے اس نے مذہبی تعلیمات کے ساتھ ان اصول و قوانین کی تعلیم بھی دی ہے جن پر قوموں اور ملتوں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کا دارومدار ہے، چنانچہ کلام مجید میں جس طرح عقائد و عبادات وغیرہ کی تعلیم ہے، اسی طرح اسلامی نصب العین پر اعتقاد جازم، اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد و توکل، اس کے سوا ہر طاقت سے بے خوفی، اسلامی وحدت و اخوت، عدل و مساوات، انفاق فی سبیل اللہ، جہاد یعنی دین و ملت کی راہ میں ہر قسم کی جد و جہد اور جانی و مالی قربانی، مادی طاقت کے حصول اور ان ساری چیزوں کی تعلیم اور ان پر عمل کی تاکید ہے، جو اسلام اور ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں، یہ اصول مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ دنیا میں کامیاب و سربلند ہوگی، فرق یہ ہے کہ

قرآن مجید نے ان اصولوں کو مذہبی زبان میں ادا کیا ہے، مسلمانوں کا مقصد دین و دنیا دونوں کی سربلندی ہے، اور دوسری قوموں کا مقصد صرف مادی ترقی اور قومی سربلندی،

آج ان میں سے کس اصول پر مسلمانوں کا عمل ہے، بیشک کلمہ گو کی حیثیت سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں لیکن اسلام پر ان کا وہ ایمان نہیں جو ان کو خدا کے سوا دنیا کی ہر طاقت سے بے خوف کر دے، ملی مفاد کے بجائے ذاتی اغراض ہیں، سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے راحت طلبی اور تن آسانی ہے، وہ اسکی راہ میں ادنیٰ زحمت بھی برداشت نہیں کر سکتے، ملی وحدت کے بجائے اختلاف اور گروہ بندی اور نسل و وطن کی پرستش ہے، تفریحی اور لایعنی مشاغل میں ہزاروں روپے برباد کر دیتے ہیں، اور قوم و ملت کی راہ میں حقیر رقم صرف کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، بڑی بڑی شخصیتیں ذاتی جاہ و اقتدار کیلئے بڑے سے بڑے ملی مفاد کو قربان کر دیتی ہیں، جس کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، ایسی حالت میں جب دنیاوی ترقی کے اسلامی اصولوں پر بھی ان کا عمل نہیں ہے، وہ کس طرح دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی، عریانی و عیش پرستی، جنسی بے راہ روی اور شراب اور جوا نہیں بلکہ انکی قومی وحدت، ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح، اس کے لیے ایثار و قربانی، اپنے مقصد کے حصول کے لیے جانبازی، علوم و اکتشافات کی راہ میں جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی ہے، انھوں نے مادی ترقی اور قومی سربلندی کو زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے، اور اس کی راہ میں

کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتیں، اس لیے اس مقصد میں وہ کامیاب ہیں، مسلمانوں میں یہ وصف بھی نہیں، وہ اپنے مذہب و ملت کے لیے ان کی عشر عشیر قربانی نہیں کرسکتے، جتنی مغربی قومیں دنیاوی ترقی کے لیے کرتی ہیں، اسی لیے وہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں،

وہ مغربی تہذیب کے اندھے مقلد ہیں، ان کو مغربی قوموں کی خوبیوں کی تقلید کی توفیق نہیں ہوتی، صرف ان کے ظواہر اور ان کے عیوب کے نقال ہیں، چنانچہ ان میں مغرب زدہ تو بکثرت ملیں گے، لیکن ان کے جیسے جانباز، مغربی علوم کے ماہر، سائنسی علوم و اکتشافات کے محقق و موجد مشکل سے نکلیں گے،

اسلام کا اصل مقصد دین و دنیا دونوں میں مسلمانوں کی فلاح تھی، لیکن مغربی قوموں کی طرح انھوں نے بھی حکومت اور مادی ترقی کو نصب العین بنا لیا ہے، اور انہی کے خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے اس سے تہی دامن ہیں، اس لیے اس سے بھی محروم ہیں، حکومت و سلطنت، علوم و فنون، سائنس کے ایجادات و اختراعات خیر بھی ہیں اور شر بھی، اس کا دار و مدار نقطۂ نظر کی صحت اور عدم صحت پر ہے، صحیح اور متوازن انسانی ترقی کے لیے، اخلاقی نقطۂ نظر، عارفانہ بصیرت، اعلیٰ انسانی اقدار کا احترام اور مادیت و روحانیت میں توازن ضروری ہے، ورنہ یہ ساری چیزیں انسانیت کے لیے وبال بنجاتی ہیں، جس کا مشاہدہ موجودہ تہذیب و ترقی میں کیا جا سکتا ہے، اگر ایک طرف سائنس کی ایجادات نے انسانیت کی خدمت کی ہے تو دوسری طرف اس کو ہلاکت کے دہانہ پر بھی پہنچا دیا ہے، روحانیت کے فقدان اور اخلاقی قیود

سے آزادی نے مغربی قوموں کو حیوانیت میں غرق کر دیا ہے جس پر وہ تحریکیں شاہد ہیں، جن کا انسانی شرافت کے لیے تصور میں لانا بھی ناگوار ہے، جہاں تک مغربی قوموں کی خوبیوں، ان کے کردار و قوت عمل، علوم و اکتشافات حکومت کے اداروں کی تنظیموں کا تعلق ہے، یقیناً قابل تقلید ہیں، اس کے بغیر آج کسی قوم کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، لیکن خیر و شر کے امتیاز کے بغیر ہر شعبہ زندگی میں ان کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے ملی خودکشی ہے، دوسری قوموں کی اچھی اور مفید چیزوں سے استفادہ ان کی خصوصیت رہی ہے، خود رسول اکرمؐ نے بعض غزوات میں ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کو اختیار فرمایا اور لباس میں ان کی بعض چیزیں پسند فرمائیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکومت کے اداروں کی تنظیم میں ایرانیوں اور رومیوں کے نظام سے فائدہ اٹھایا، دوسری قوموں کے علوم کی تحصیل مسلمانوں نے بنی امیہ ہی کے زمانہ سے شروع کر دی تھی، اور بنی عباس اور بنی امیۂ اندلس کے زمانہ میں سارے علوم و فنون کے امام بن گئے اور ان کو اوج کمال تک پہنچا دیا، انکی مختلف شاخوں میں نئے نئے تجربات و اکتشافات کئے، ہر فن پر سیکڑوں کتابیں لکھیں اور ان فنون کی روشنی یورپ میں پھیلائی، انھی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا ہے، ہمارا مقصد ان کی علمی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں دوسری قوموں کی مفید چیزوں سے استفادہ کیا ہے، اس زمانہ میں اس کی اور بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ بعض پہلوؤں سے مذہب کی بھی پوری خدمت نہیں ہو سکتی، مگر انھوں نے دوسری قوموں کی جو چیزیں بھی اختیار کیں، اس کی روح میں

بہ نہیں گئے، بلکہ اس کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے دین و ملت کی خدمت کا کام لیا، وہ منطق و فلسفہ پڑھتے تھے، مگر بسم اللہ سے شروع کرتے تھے، اور اس سے مذہبی عقائد کے اثبات کا کام لیتے تھے، اور جہاں فلسفہ؛ مذہب سے متصادم ہوتا اسکا دلائل سے رد کرتے تھے، المانسٹر کی پیشانی پر حواشی لکھتے تھے، ہیئت یعنی افلاک کے نظام میں ان کو خدا کی عظمت و کبریائی نظر آتی تھی، تہذیب ٭ معاشرت میں بھی ان کا طریقہ یہی تھا۔ آج بھی مسلمانوں کا عمل یہی ہونا چاہئے، ان کا منصب و مقام دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ ان کی رہنمائی ہے۔

لیکن مغربی تہذیب کا سیلاب اتنا پُرزور ہے اور اس میں نفس کی تسکین کا اتنا سامان ہے کہ ساری قومیں اس میں بہی چلی جا رہی ہیں، اور اپنے عقائد، اعمال، افکار و تصورات، نظام معاشرت ہر چیز کو اسی قالب میں ڈھال دینا چاہتی ہیں، مغربی تہذیب ہی، تہذیب و شائستگی کا معیار بن گئی ہے، دوسری قوموں کو اس میں اس لیے دشواری نہیں ہوتی کہ انھوں نے مذہب سے آزادی حاصل کر لی ہے، یا اس کو دنیاوی حالات کا تابع بنا دیا ہے یا عبادت گاہوں میں محدود کر دیا ہے، اور وہ بھی صرف چند رسوم تک محدود ہے، زندگی کے معاملات و مسائل سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے، بعض مذاہب محض معاشرتی نظام ہیں، ان کے کوئی بنیادی عقائد نہیں جن کا ماننا ضروری ہو، ان میں بڑی وسعت ہے اور وہ ہر قالب میں ڈھل سکتے ہیں، اس لیے ان کو نیا قالب اختیار کرنے میں دقت نہیں ہوتی، اس کے مقابلہ میں اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، جس سے زندگی کا کوئی پہلو بھی باہر نہیں ہے، وہ دین توحید ہے، اس لیے اپنے

پیرووں کی پوری زندگی میں ایسی وحدت و یکرنگی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسری قوموں میں ممتاز نظر آئیں اور فوج کی طرح اسلامی قوانین کے ایسے پابند ہوں کہ حزب اللہ معلوم ہوں اور دوسری قومیں ان سے سبق حاصل کریں،

لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور وہ ساری دنیا کے لیے آیا ہے، اور مختلف ملکوں اور قوموں کے جغرافی وطبعی حالات اور تہذیب و تمدن میں بڑا اختلاف ہے، جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑنا ضروری ہے، پھر ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کی نظیر اسلامی قوانین میں موجود نہیں ہوتی، اس لیے اسلام نے بنیادی وحدت کے ساتھ فروعات میں کثرت کی پوری گنجائش رکھی ہے، عقائد و عبادات وہ بنیادی عناصر ہیں جن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں، لیکن معاملات اور معاشرات میں تبدیلی کی گنجایش ہے مگر انمیں بھی اُن چیزوں میں جن پر ملت اسلامیہ کے تشخص اور انفرادیت کا دار و مدار ہے اور جن کے متعلق کلام مجید اور احادیث نبویؐ میں صریح احکام ہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس سے اس کی انفرادیت اور اس کا ملی وجود ختم ہو جائے گا اور وہ دوسری قوموں میں ضم ہو جائے گی، لیکن معاملات و معاشرات کے دوسرے پہلوؤں میں خود شریعت نے زمانہ کے حالات کی رعایت رکھی ہے، مثلاً جن احکام کی علت بیان کر دی گئی ہے جب وہ علت باقی نہ رہے گی تو حکم بھی باقی نہ رہے گا، اس سے بہت سے مسائل میں تبدیلی ہو جائے گی، اسی طریقہ سے مصالح عامہ اور عرف و عادت کا بھی اعتبار کیا ہے۔ ان کے لحاظ سے بھی بعض احکام بدل جائیں گے، اور اس پر ہر زمانہ کے علماء و مجتہدین کا عمل رہا ہے، بعض مسائل کا حل خود مذاہب فقہ میں سے کسی نہ کسی

مذہب میں نکل آئے گا، معاشرات میں تو معاملات سے بھی زیادہ وسعت ہے، مسلمانوں نے ہر زمانہ میں دوسری قوموں کی ان تہذیبی چیزوں کو جو کسی صریح اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہیں، اختیار کیا ہے، اور ان کو اسلامی مزاج کے مطابق بنا لیا، چنانچہ ایرانیوں کی قریب قریب پوری تہذیب اختیار کر لی لیکن اس پر اسلام کی ایسی گہری چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تہذیب کہلانے لگی، آج بھی مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں اسلام کے بنیادی عناصر میں وحدت کے ساتھ تہذیبی کثرت کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے، ان سب کا کلچر تو ایک ہے لیکن تہذیبی نقش و نگار جدا جدا ہیں،

شریعت کا منشا سختی اور تنگی نہیں بلکہ امت اسلامیہ کی دینی و دنیوی فلاح کے ساتھ اس کی مصلحت اور سہولت ہے، جس سے بھی یہ چیزیں حاصل ہوں، وہ شریعت کے دائرے سے باہر نہیں، لیکن شریعت میں مصلحت اور سہولت کا معیار، خواہش نفس، تعیش، زمانہ کا مذاق و رجحان نہیں ہے کہ ایک چیز نفس کی خواہش کے مطابق ہے، یا زمانہ میں چل پڑی ہے، اور اس کو قبول عام حاصل ہے، یا تہذیب جدید میں پسندیدہ ہے، اس لیے اسلامی قانون کو بھی اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے، اگر یہ معیار مان لیا جائے تو شریعت کا کوئی حکم اپنی جگہ پر باقی نہ رہے گا، اور محرمات کو بھی جائز کرنا پڑے گا بلکہ صحیح معیار یہ ہے کہ اس کے بغیر حقیقۃً مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی یا معاشرتی حیثیت سے نقصان پہنچنے یا دشواری میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو، ایسے مسائل کا حل سب کے نزدیک ضروری ہے، لیکن یہ محض اٹکل پچو نہ ہوگا، بلکہ اس کے لیے شریعت نے اصول کلیہ بنا دیے ہیں، ان کی روشنی میں ان کا حل نکالا جا سکتا ہے، اور ہر زمانہ کے علماء و مجتہدین ان کا حل نکالتے رہے ہیں،

آج بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن اس کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو اسلام کے مزاج شناس ہیں، کتاب وسنت، عمل صحابہؓ ان کے اور ائمہ ومجتہدین کے فتاویٰ اور اجتہادات پر ان کی پوری نظر اور اس میں بصیرت حاصل ہے، ہر شخص اس کا مجاز نہیں ہے، دنیاوی قوانین میں بھی ان کے ماہرین ہی کی رائے معتبر مانی جاتی ہے، اور ان ہی کی رائے ومشورے سے قانون بنتے اور ان میں ترمیم ہوتی ہے، بلکہ دنیا کے سارے معاملات میں ماہرین ہی کی رائے معتبر مانی جاتی ہے، اس لیے جدید مسائل کے حل میں بھی قانون شریعت کے ماہرین ہی کی رائے معتبر ہوگی،

لیکن اس دور کے مجتہدین کا مقصد مسائل کا اسلامی حل نہیں ہے، بلکہ اسلامی قوانین کو کھینچ تان کر جدید مسائل کے مطابق بنانا ہے، اس لیے وہ عربی جاننے تک کی ضرورت نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک ہر شخص کو اجتہاد کا حق ہے، اس آزادی رائے کا جو انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

آج کل جو نئے مسائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے مسلمانوں کا حقیقۃً کوئی نفع ونقصان متعلق نہیں ہے بلکہ وہ تہذیب جدید کی صدائے بازگشت ہیں، تاہم ایسے مسائل کے وجود سے انکار نہیں، ان کے حل کی صحیح شکل یہ ہے کہ علما، اور جدید تعلیم یافتہ دیندار مسلمان مل کر ان مسائل کی ایک فہرست تیار کریں، پھر جو مسئلہ جس فن یا جس شعبہ سے متعلق ہو اسکے ماہرین اور علما، مل کر اس کا حل نکالیں، اب یہ کام زیادہ دشوار نہیں رہ گیا ہے، اس پر بڑا ذخیرہ جمع ہوچکا ہے، مصر وشام وغیرہ میں جدید فقہ اور اصول فقہ پر بعض

اچھی اور مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اسلامی ملکوں نے جدید مسائل کو جس طرح حل کیا ہے، وہ سب نگاہ کے سامنے ہے، گو یہ سب قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان نے کئی جلدوں میں مجموعۂ قوانین اسلام شائع کیا ہے، اس میں بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے، خود ہندوستان میں جب سے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، بہت سے مفید اور محققانہ مضامین نکل چکے ہیں، مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی نے اس موضوع پر بہت قابل قدر مضامین اور بعض مفید کتابیں لکھی ہیں، ادارۂ تحقیقات شرعیہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے بھی کچھ کام کیا ہے، پرسنل لا پر غور و فکر کیلئے مولانا محمد طیب صاحب نے علماء کا ایک اجتماع کیا تھا جس کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے اب یہ راہ آسان ہو گئی ہے، ضرورت ہے کہ اس سارے ذخیرہ کو سامنے رکھکر اجتماعی طور سے اس کام کی طرف قدم بڑھایا جائے، ورنہ اگر یہ مسئلہ سیکولر مسلمانوں کی مدد سے حکومت کے ہاتھوں میں چلا گیا تو پھر اسلامی قوانین میں تبدیلی کا دروازہ کھل جائے گا، اور مسلمان زبانی احتجاج کے علاوہ کچھ نہ کر سکیں گے، اور اگر خود مسلمانوں نے اسکو حل کر دیا تو شاید حکومت کو مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئے،

تہذیب کی تشکیلِ جدید

معاشی نظام

از

مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۶)

شادی اور مجبوری کے وقت خادم

شادی وخادم کا ذکر بھی روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ثلاثۃ کلھم حق علی اللہ عونہ	تین قسم کے آدمیوں کی مدد اللہ کے
الغازی فی سبیل اللہ والمکاتب	ذمہ ہے، (۱) اللہ کی راہ میں
الذی یرید الاداء والناکح	جہاد کرنے والا، (۲) مکاتب جو
الذی یرید التعفف،[۱]	کتابت کی رقم ادا کرنا چاہتا ہے،
	(۳) نکاح کرنے والا جس کا مقصد
	پاکیزہ زندگی گذارنا ہے،

حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ فرمان جاری کیا تھا،

ان انظر کل بکر لیس لہ مال — دیکھو جو جوان شادی کرنا چاہے

---

[۱] ابن ماجہ ابواب العتق باب المکاتب،

فشاء ان تزوجه فزوجه[۵۱] اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کی شادی کرادو،

حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھ کر وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ دایاں ہاتھ جنگ موتہ میں شہید ہوگیا ہے، یہ سُن کر آپ دیر تک روتے رہے، اور مختلف کاموں کے بارے میں پوچھتے رہے، کہ تمھارا یہ کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کو ایک خادم اور دوسری ضرورت کا سامان دینے کا حکم دیا،

فدعا له بخادم وامر له براحلة وطعام ومايصلحه وماينبغى له[۵۲] ایک خادم دیا، سواری دینے کا حکم دیا، اور ضرورت کے دوسرے سامان دیئے،

غرض حکومت ایک خاص نظم کے تحت (جس سے غیر معتدل زندگی کو فروغ نہ ہو، اور جس کی شکل حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے) مذکورہ ضرورتوں کے انتظام کی ذمہ دار ہے، خواہ یہ ضرورتیں خود فراہم کرے، یا رکاوٹیں دور کرکے آسانیاں فراہم کردے،

وہ جس سے قوم خود کفیل ہو (ب) معاشی لحاظ سے قوم کو خود کفیل بنانے کا ذکر درج ذیل قسم کی تصریحات میں ہے، قرآن حکیم میں ہے،

هو انشأكم من الارض و استعمركم فيها[۵۳] اللہ نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، اور تم سے اس زمین میں آبادی کرائی،

ابوبکر جصاص کہتے ہیں :-

---

۵۱ کتاب الاموال ص ۲۵۱، ۵۲ کتاب الآثار باب افضائل الصحابہ حدیث ۵۲ ۵۳ سعد، ہود، رکوع ۶،

فیہ الدلالۃ علی وجوب العمارۃ للزراعۃ والغراس والابنیۃ[1]

اس آیت میں دلالت ہے کہ کھیتی باغبانی اور عمارتوں کے ذریعہ زمین کی آبادکاری واجب ہے،

قاضی بیضاوی نے خلافت کی بحث میں لکھا ہے،

وکذالک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم[2]،

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو زمین کی آبادکاری، لوگوں کی سیاست ان کے نفوس کی تکمیل اور اللہ کا حکم نافذ کرنے کے لئے اپنا خلیفہ بنایا ہے

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

عمروا البلاد لی نعاش فیھا عبادی[3]،

میرے ملک کو آباد کرو تاکہ میرے بندے اس میں خوشحال زندگی بسر کرسکیں،

ایک اور حدیث میں ہے،

اطلبوا الرزق ولونی خبایا الارض[4]،

رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو،

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے،

سبت العجم بین یدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

---

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۱۰۵، [2] بیضاوی ص ۵،۹ [3] و [4] المبسوط للسرخسی ج ۲۳، ص ۱۵،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — عجمیوں کو برا کہا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ
فنہی عن ذلک وقال لا تسبوھا — اُن کو بُرا نہ کہو انھوں نے اللہ
فانہا عمرت بلاد اللہ فعاش — کے ملک کو آباد کیا جس سے اللہ کے
فیہا عباد اللہ[۵۱] — بندوں نے خوشحال زندگی گذاری،

ماوردی نے حکومت کی ذمہ داری گناتے ہوئے لکھا ہے،

والثالث عمارۃ البلدان — تیسری یہ ہے کہ ذرائع نقل وحمل
باعتماد مصالحہا وتہذیب — شاہراہوں اور دوسری تمام مصلحتوں
سبلہا ومسالکہا،[۵۲] — (زمانہ کے مطابق) کی رعایت کے ساتھ
ملک کو آباد وخوشحال رکھنا،

آمدی لکھتے ہیں :-

ان ما لا یتم الواجب الا بہ — جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ
واجب مثلہ،[۵۳] — ہو سکے، وہ بھی اسی طرح واجب ہوگی،

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :-

وما لا یتم الواجب الا بہ فہو — جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو، وہ
واجب،[۵۴] — بھی واجب ہے،

تنظیمات کے بارے میں حکومت کے اختیارات وسیع ہیں

مذکورہ دونوں قسم کے انتظام میں حکومت کو اختیار ہے کہ جدید تنظیم قائم کرے، یا موجودہ تنظیم سے کام چلائے، اپنی ماتحتی میں تنظیم قائم کرے

---

۵۱ ادب الدین والدنیا ص ۲۰۰ ۵۲ الاحکام السلطانیہ للماوردی ۵۳ اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۵۰، ۵۴ الجامع فی السیاسات الالٰہیہ ص ۱۶،

یا لوگوں کو انا دانہ قائم کرنے کا حکم دے لیکن بنیادی حیثیت سے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے،

تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو | (۱) تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو کہ اس کے بغیر بقاء کا جواز نہ حاصل ہو سکے گا،

(۲) اس میں نفع و نقصان کا مدار اخلاقی ہو، اس کے بغیر مفاسد کا دروازہ نہ بند ہو سکے گا

قرآن حکیم میں مقابلۃً مفید تر کا ثبوت درج ذیل ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ[1]	بے شک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے،

عدل و احسان نہایت وسیع اور جامع لفظ ہیں، اُن کے ذریعہ مصالح کے حصول اور مضرت کے دفعیہ پر ابھارا گیا ہے جس سے حالات و زمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم کو اختیار کرنے کا ثبوت ملتا ہے[2]

دوسری جگہ ہے،

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ[3]	اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کو محض اس لئے بھیجا کہ رحمتِ عامہ کا ظہور ہو،

"رحمتِ عامہ" میں حالات و زمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم بھی داخل ہے، کیونکہ اگر کسی ایک طریق کار پر اکتفا کیا گیا، تو لوگ تنگی میں مبتلا ہوں گے، جس سے رحمت کے منافی بات لازم آئے گی[4]

نفع و نقصان کا مدار اخلاقی ہو | قرآن حکیم میں نفع و نقصان کے مدار کا ثبوت یہ ہے،

---

[1] سورۂ نحل رکوع ۱۳، [2] تعلیل الاحکام ص ۲۰۸، [3] سورۂ انبیاء رکوع ۷، [4] تعلیل الاحکام ص ۲۸۷،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا[1] — لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑھ کر ہے۔

کلام عرب میں "اثم" اخلاقی و روحانی نقصان اور ضرر، مادی وجسمانی نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے، اسی لئے آیت میں ضرر کے بجائے لفظ اثم لایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواز و عدم جواز یا حلال و حرام کے لئے مدار اخلاقی و روحانی نقصان ہے، نہ کہ مادی وجسمانی نقصان،

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ خود قرآن مجید میں ہے کہ انھوں نے قحط کے زمانہ میں غذائی اشیاء محفوظ کرکے بقدر ضرورت لوگوں میں تقسیم کرنے کا نظم قائم کیا تھا[2] جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کو حالات کی رعایت سے مفید تر راہ اختیار کرنے کا حکم ہے،

حکومت کی ماتحتی میں تنظیم ہو | عہد نبوی میں اس کے لئے کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی، بلکہ جو آمدنی آتی تھی آپ اسکو اسی وقت مستحقین میں تقسیم فرما دیتے تھے البتہ حضرت ابو ہریرہؓ کو مامور کیا تھا کہ جو ننگا بھوکا مسلمان آتا، وہ اس کو آپ کی خدمت میں لے آتے، آپ اس کے کھانے پینے کا انتظام فرماتے[3]،

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں یہی طریقہ رکھا جو آمدنی ہوتی تھی، اس کو تقسیم فرما دیتے، چنانچہ پہلے سال کی آمدنی میں بلا تفریق مرد عورت، بوڑھے بچے، اور آزاد و غلام دس دس درہم تقسیم کئے، دوسرے سال کی آمدنی میں بیس بیس درہم، (طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۳)

---

[1] بقرہ - ۲۷ [2] یوسف [3] السنن الکبری کتاب الوکالۃ باب التوکیل فی المال وطلب الحقوق نیز التراتیب الادار یہ جلد ۲

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں باقاعدہ بیت المال قائم کیا، جس کے مصارف میں بلاامتیاز مسلم وغیر مسلم سارے غربا و مساکین کی امداد و دستگیری بھی تھی، اس کی تفصیل حدیث و فقہ کی کتابوں میں ہے، آپ کا عام حکم تھا کہ

"مملکت میں ہر تنگدست کو دیا جائے، ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے، ہر کمزور کی مدد کی جائے، ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے، ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے، وغیرہ"[1]

حضرت معاویہؓ نے سرکاری سطح پر کفالت عامہ کے لئے افسر اعلیٰ کا تقرر کیا تھا،

فجعل معاویۃ رجلاً علیٰ	حضرت معاویہؓ نے لوگوں کی ضرورت
حوائج الناس[2]	پر ایک آدمی مقرر کیا،

آزادانہ تنظیم ہو | آزاد تنظیم کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت کی اس قسم کی آزاد تنظیم عاقلہ وغیرہ کو برقرار رکھا، اور عوام کو بھی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا، جس سے جدید تنظیم قائم کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

من کان معہ فضل ظھر	جس شخص کے پاس سواری، اور
فلیعد علی من لا ظھر لہ	دوسرے سامان ضرورت سے زائد
ومن کان لہ فضل من زاد	ہوں، وہ اس شخص کو دیدے جس
فلیعد بہ علی من لا زاد لہٗ	کے پاس یہ سامان نہ ہوں جس کے

---

[1] شرح شرعۃ الاسلام سید علی زادہ، [2] ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء فی امام الرعیۃ،

قال فذکر من اصناف المال ماذکر حتی رائینا انہ لا حق لاحد منا فی فضل،	پاس کھانے پینے کی چیزیں ضرورت سے زائد ہوں، وہ زائد چیزیں مفلس و نادار کو دیدے، ابو سعید خدری کا قول ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مال کی مختلف قسموں کا ذکر کرکے زائد مال دوسروں کو دینے کی تاکید فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ زائد مال میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا:-

اِنَّ اللّٰہ تعالیٰ فرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر مایکفی فقرائھم فَاِنْ جاعوا اعرّوا وجھدوا بمنع الاغنیاء حق علی اللّٰہ ان یحاسبھم یوم القیمۃ و یعذبھم علیہ۔	اللہ تعالیٰ نے بقدر کفایت غرباء کی ضرورت پوری کرنا مالداروں پر فرض کیا ہے اگر وہ بھوکے ننگے یا اور کسی معاشی مصیبت میں مبتلا ہوئے، تو یہ مالداروں کے نہ دینے کی وجہ سے ہے، اللہ کا حق ہے کہ قیامت کے دن ان سے حساب لے اور ان کو سزا دے،

یہ احکام عام ہیں ان میں انفرادی صدقہ وخیرات اور اس کی تنظیم دونوں شامل ہیں،

تشکیل میں انفرادی و اجتماعی ملکیت دونوں کی اجازت ہے۔ | بدقسمتی سے اس زمانہ میں ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلۂ ملکیت کو دی گئی ہے، جس کے غلط تصور نے بڑے بڑے نتائج پیدا کیے۔ آج بھی اس کی وجہ سے بہت سے ملکوں میں ایک طبقہ میں محنت و مشقت کے بغیر دولت و سامان عیش کی انتہائی فراوانی ہے اور دوسرے طبقہ میں محنت و مشقت کے باوجود فلاکت و نکبت ہے،

ایک طرف ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ہے، اور دوسری طرف ملک معمولی معمولی چیزوں میں دوسروں کا محتاج ہے۔ ایسی حالت میں تشکیل جدید میں نہ ملکیت کی بحث کی کوئی اہمیت ہوگی اور نہ تنظیم کو (انفرادی یا اجتماعی) میں محدود کرکے تنگی پیدا کی جائیگی بلکہ انفرادی و اجتماعی دونوں کی اجازت ہوگی اور سردست حالات کے لحاظ سے ذرائع پیداوار درج ذیل حصوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے،

ذرائع پیداوار کی تقسیم | (۱) وہ جن پر اجتماعی ملکیت ہوگی یعنی حکومت براہ راست انتظام کریگی،

(۲) وہ جن پر بتدریج اجتماعی ملکیت ہوگی،

(۳) وہ جن پر انفرادی ملکیت ہوگی،

پہلے حصہ کی تفصیل | پہلے حصہ میں حکومت کی نامزد کردہ بنیادی صنعتیں اور اس قسم کی چیزیں شامل ہوں گی:۔

(الف) فولاد و لوہا۔ اس میں کان مشینی اوزار اور ڈھالنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں،

(ب) اسلحہ جات۔ اس میں دفاع سے متعلق صنعتیں ہیں،

(ج) برقی پلانٹ۔ اس میں بجلی پیدا کرنے کی طاقت اور اس سے متعلق صنعتیں ہیں،

(د) اٹامک انرجی (ایٹمی طاقت)

(س) کوئلہ کی کان۔ تارکول، پٹرول اور گیس کی صنعت

(ص) خام میگنیز

(ض) جواہرات، سونا، چاندی، تانبا، جستہ، سیسہ،

(ط) ہوائی، بحری اور ریلوے ٹرانسپورٹ

(ع) ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور وائرلیس

(ف) کپڑوں کے مل، بڑے کارخانے اور ڈاک خانے

دوسرے حصہ کی تفصیل | (۲) دوسرے حصہ میں مثلاً یہ چیزیں شامل ہوں گی

(الف) المونیم اور ٹین کی صنعت

(ب) کوئلہ سے کاربن بنانے کی صنعت

(ج) چھوٹے اوزار کے لیے چھوٹی مشینیں

(د) رنگ سازی و پلاسٹک کی چیزیں

(ر) انگریزی دوائیں اور جراثیم کش دوائیں

(س) روڈ ٹرانسپورٹ

(ص) سمنٹ کے کارخانے

(ط) کاغذ کے کارخانے

(ع) چائے کے باغات اور اس سے متعلق چیزیں

(ف) ان کے علاوہ اور چیزیں جو ان میں شامل ہونے کے لائق ہوں،

تیسرے حصہ کی تفصیل | (۳) تیسرے حصہ میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں اور گھریلو صنعتیں شامل ہیں،

(الف) چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے نجی و عوامی کمپنیاں قائم ہوں گی، یا

وہ انفرادی طور پر انجام پائیں گی، ان کے لیے قواعد وضوابط شریعت کی روشنی میں مقرر ہوں گے اور حکومت (بشرط مصلحت) ان کے لیے سرمایہ کی ایک حد (مثلاً (دس بیس لاکھ وغیرہ) مقرر کرنے کی بھی مجاز ہوگی جس کے بعد وہ انفرادی سے نکل کر اجتماعی میں آسکتی ہیں،

(ب) گھریلو صنعتوں کے لیے سرمایہ کی حد بندی نہ ہوگی، ان میں گھر کے ہی اکثر افراد کام کرتے ہیں، باہر کے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے، اس بنا پر نہ کام کرنے کے اوقات کا تعین ہوتا ہے اور نہ کام کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔ حکومت چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لیے قرض دیگی اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کرے گی،

اس طرح ایک طرف اجتماعیت کا تجربہ ہوگا تو دوسری طرف افراد کو کاروبار کا موقع ملتا رہے گا، ان میں نہ کوئی آخری شکل ہوگی، اور نہ کسی شکل کو ذاتی دقار و اقتدار کے لیے باقی رکھا جائے گا کہ وہ سرچشمۂ رزق پر قابض ہو کر اللہ کی مخلوق کو غلامی پر مجبور کر سکے،

جدید تشکیل میں ملکیت کے صحیح تصور پر عمل در آمد ہوگا

تشکیل جدید میں انفرادی و اجتماعی بحثوں کے بجائے ملکیت کے صحیح تصور پر عمل درآمد ہوگا اور تعلیم و تربیت پر زور دیا جائیگا،

صحیح تصور یہ ہے کہ ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان بحیثیت "امین" اس پر قابض ہے یعنی ذرائع پیداوار افراد کے سپرد ہوں یا جماعتوں کے، ان سب کی حیثیت محض "امین" کی ہے، جس کو مالک کے مقررہ قانون کے مطابق استعمال و انتفاع کا حق حاصل ہے، اور اسی وقت تک یہ حق حاصل رہے گا جب تک وہ حصول مقصد (خلق خدا کی خوشحالی و فارغ البالی) میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ایسی فضا

پیدا کرنے میں مددگار بنیں، جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو،

تشکیل میں اسی حق استعمال و انتفاع کو حقِ ملکیت سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آراضی کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:

وحق الملك في الآدمي انه احق بالانتفاع من غيره[1]	حق ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے غیر کے مقابلہ میں زیادہ انتفاع کا حق حاصل ہو،

اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں باہمی ربط پیدا کیا جائیگا	تعلیم و تربیت کے ذریعہ اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں ربط پیدا کیا جائے گا، اسکے بغیر مذکورہ تنظیمات سے خاطر خواہ

نتیجہ نہیں نکل سکتا، اگر محض تنظیمی تبدیلی کے ذریعہ معاشی مسائل حل بھی ہو گئے تو اخلاقی اصلاح نہ ہونے سے دوسرے بہت سے نفسیاتی و اجتماعی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے جن پر قابو پانا سخت مشکل ہوگا،

مذکورہ بالا اشیاء کی فہرست نہ آخری ہے اور نہ کوئی فہرست آخری ہو سکتی ہے، حالات کے لحاظ سے حکومت کو نئی فہرست بنانے اور پرانی فہرست میں ردوبدل کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح چند معدنیات کو چھوڑ کر انفرادی کو اجتماعی اور اجتماعی کو انفرادی میں تبدیل کرنے کا بھی پورا اختیار ہے، البتہ حکومت و عوام دونوں کے ہر اقدام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور ضروری ہے، اور حقوق سے زیادہ فرائض پر زور ہوگا،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

حافظ امان اللہ بنارسی

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

دہلی کو روانگی اور واپسی پر شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت و ارادت

سلطان عالمگیر کی حکومت کا پچاس سالہ دور (۱۰۶۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک) پورے ملک کے لیے امن و امان، عیش و رفاہیت کا دور تھا، خاص طور سے دیار پورب شاہی توجہات و عنایات سے ارباب علم و فضل کے حق میں گلزار تھا، اسی زمانہ میں حافظ صاحب نے نشو و نما پائی، خود ان کا گھر بھی گلزار بنا ہوا تھا، اس پر عالمگیر کی خصوصی توجہ تھی، مگر سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا انتشار پیدا ہوا کہ پورے ملک میں ابتری پھیل گئی، دیار پورب کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑنے لگیں، اور علماء و فضلا اور مشائخ سکون و اطمینان کی نعمت سے محروم ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے، ۱۱۳۱ھ میں محمد شاہ بادشاہ ہوا، اسی سال اس نے محمد امین نیشاپوری (برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری) کو اودھ کا حاکم بنایا جس نے یہاں آتے ہی ایک طوفان برپا کر دیا، قدیم خانقاہوں اور مدرسوں اور علماء و مشائخ کی جاگیریں ضبط کر لیں، ان کو طرح طرح سے پریشان کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور خانقاہیں اجڑنے لگیں اور علماء و مشائخ پریشان ہو کر ادھر ادھر رخ کرنے لگے، آزاد نے مآثر الکرام میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

تا حدود سنہ ۱۱۳۰ھ ہنگامہ علم و علماء
دریں گل زمین گرمی داشت تا آنکہ
برہان الملک سعادت خان نیشاپوری
در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ
شد، و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد،
نیز مثل دار الخیور جونپور و بنارس
و غازیپور و کڑا مانک پور و کوڑہ جہان آباد
وغیرہ ضمیمہ حکومت گردید، و وظائف
و سیور غالات خانوادہائے قدیم
جدید یکقلم ضبط شد، و کار شرفاء و نجباء
بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش
مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ
در پیشہ سپاہ گری انداخت و رواج
تدریس و تحصیل آن درجہ نماند
امدادے کہ از عہد قدیم معدن علم
و فضل بود یکقلم خراب افتاد،
و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر
برہم خورد، انا للہ وانا الیہ راجعون[1]

سنہ ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین میں علم و علماء کی
سرگرمی باقی رہی، یہانتک کہ محمد شاہ
کے آغاز جلوس میں برہان الملک
سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ
کا حاکم ہوا، اور صوبہ الہ آباد، جونپور،
بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور،
کوڑا جہان آباد وغیرہ کے شہروں
کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے جدید
و قدیم علمی اور دینی خانوادوں کے
وظائف یکقلم ضبط کرلیے، جس سے شرفاء
و نجباء کو سخت پریشانی برداشت کرنی
پڑی اور معاش و معیشت کی پریشانی نے
وہاں کے لوگوں کو علم سے باز رکھ کر سپہ گری
کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اور پہلے
کی طرح درس و تدریس کا رواج باقی نہیں رہا جو
مدرسے قدیم زمانہ سے علم و فضل کے معدن
تھے، یکقلم ویران ہوگئے اور ارباب کمال
کی اکثر انجمنیں برباد ہوگئیں۔

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲

جونپور، الہ آباد، غازیپور، کڑا مانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ کی طرح بنارس کے اربابِ فضل و کمال بھی محمد امین نیشاپوری حاکم اودھ کے ظلم کا شکار ہوکر جاگیروں اور وظائف سے محروم ہوگئے، حافظ صاحب بھی اس کا نشانہ بنے، انکے خاندان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ ختم کردی گئیں، اس لیے ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دہلی جانا پڑا، مگر یہ نہیں معلوم کہ دہلی میں ان کی شنوائی اور وظائف و جاگیر کی واپسی ہوئی یا نہیں ہوئی، البتہ واپسی پر الہ آباد میں حضرت شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل ہوا، جو اس دورِ فتن و پریشانی میں سکونِ قلب کا باعث بنا، مآثر الکرام میں مجمل طریقہ پر صرف اتنی تصریح ملتی ہے:

در آخر ایام حیات از شاہجہان آباد وارد الہ آباد شد، و از خدمت والائے شیخ محمد یحیی المدعو بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ استفادہ طریقہ انیقہ نقشبندیہ نمود و بآں مشغولی ورزید[1]	حافظ صاحب اپنی زندگی کے آخر ایام میں شاہجہان آباد (دہلی) سے الہ آباد وارد ہوئے، اور شیخ محمد یحیی المعروف بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ سے طریقہ نقشبندیہ کا استفادہ کرکے اس میں مشغول ہوگئے۔

سلوک و معرفت کی راہ بڑی پُرسکون ہوتی ہے، اس راہ کے راہی غمِ زمانہ سے آزاد ہوکر عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر جہاں یہ چیز اشخاص و افراد کے حق میں نعمت ہے، اقوام و ملل کے لیے نہایت پُرخطر ہے، اگر پوری قوم اجتماعی طور سے اس راہ پر چل پڑے تو سکون کی تلاش تباہی کا ذریعہ بن جائے گی،

حافظ صاحب کا سفرِ دہلی انتقال سے دو تین سال پہلے ہوا تھا، اس کے بعد

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲

انھوں نے درس و تدریس سے علٰحدہ ہوکر سلوک و معرفت کی راہ اختیار کرلی، غالباً دہلی میں ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے تعلیم و تدریس کے ہنگامہ سے علٰحدگی اختیار کرکے روحانی سکون و اطمینان کی قلیل مدت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ میں شمار ہونے لگے۔

شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا اصل نام محمد یحییٰ ہے، وہ شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ کے برادر زادہ، داماد اور مرید وخلیفہ ہیں، اصل وطن سید پور ضلع غازیپور تھا، شاہ خوب اللہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تحصیل سے فارغ ہوگئے تھے، علم شریعت وطریقت کے بحر زخار تھے، پوری عمر اپنے استاذ و مرشد کی تعلیم و تربیت کے مطابق بسر کی، رشد و ہدایت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، ۱۱ رجب جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ میں الہ آباد میں وفات پائی، حافظ صاحب نے دہلی سے واپسی پر ان سے بیعت کی اور طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق ریاضت کرکے چند ہی دنوں میں اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، اور زندگی کے باقی دو تین سال اسی روحانی سکون میں بسر کیے، ان کے روحانی ارتقاء میں خود ان کے خاندانی مذاق اور گھریلو تعلیم و تربیت کو بڑا دخل تھا، ان کے والد شیخ محمد رشید جونپوری اور ان کے بیٹے شیخ محمد ارشد جونپوری کے روحانی فیض سے "غلام درگہ پیران چشتی" تھے، اور مفتی و فقیہ اور قاضی کے لباس میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرتے تھے، حافظ صاحب اپنے والد کے روحانی فیض سے بہرہ یاب تھے، لیکن انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ دینی علوم کی تعلیم اور علماء کے انداز پر گذارا، آخر میں اس ہیزم خشک میں شاہ خوب اللہ کی ایک نگاہ نے آگ لگادی،

مرشد کی نگاہ اور مسترشد کی استعداد نے تھوڑے ہی دنوں میں نسبت نقشبندیہ کے مخصوص اثرات بہ کمال وتمام ظاہر ہوگئے، مآثر الکرام میں ہے:

بعد ظہور اثر معہود ایں طائفہ علیہ حضرت شیخ فرمودند کہ ظاہراً بعد اجتماعے کہ سید سندرا باخواجہ علاء الدین عطار عطر مرقدہ اتفاق افتادہ ایں قسم اجتماع نشدہ باشد ولکن شما از سید دریں طریق راجح اید، ومن در جنب خواجہ رتبہ ندارم	حافظ صاحب پر حضرات نقشبندیہ کے مخصوص اثر کے ظہور کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ سید سند اور خواجہ علاء الدین عطار کے باہمی اجتماع کے بعد بظاہر میرے تمہارے درمیان اس قسم کا یہ دوسرا اجتماع ہے مگر تم اس معاملہ میں سید سند سے سبقت لے گئے، اور خواجہ علاء الدین عطار کے مقابلہ میں کوئی مقام و رتبہ نہیں رکھتا،

یہ سنکر حافظ صاحب نے عرض کیا

حافظ امان اللہ تواضع کرد کہ شما قدم بہ قدم خواجہ اید ومن باسید مساسے ندارم[۵]	حضرت والا خواجہ علاء الدین کے ہم پلہ ہیں، البتہ میں سید سے کوئی نسبت نہیں رکھتا،

مرشد و مرید کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب اگرچہ اس بزم میں بہت دیر سے آئے مگر بہت جلد صف اول میں پہنچ گئے، اور شیخ محب اللہ الہ آبادی ۱۰۵۸ھ کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی، جو ایک زمانہ میں زبردست ہنگامہ

---

[۵] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲

کا باعث تھا۔ اور جس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی تھیں، میر سید محمد ترمذی ۱۱۰۱ھ، شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ اور شیخ محمد بن عیسی ہرگامی اکبرآبادی ۱۱۰۰ھ وغیرہ نے بھی اس کی شرحیں لکھیں، شیخ محب اللہ الہ آبادی مشاہیر علمائے صوفیہ میں ہیں، حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ فن تصوف میں ان کی تحقیقات و تدقیقات مرتبۂ اجتہاد کو پہنچی تھیں رجب ۱۰۵۸ھ میں الہ آباد میں فوت ہوئے تصوف کے اسرار و حکم پر ان کی متعدد کتابیں ہیں، جن میں سے ایک رسالہ تسویہ بھی ہے۔ مولوی عبد الحق نے مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ رسالہ تسویہ میں علاوہ اور امور کے جبرئیل و وحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"جبریل محمد در ذات محمد بود صلی اللہ علیہ وسلم، و ہمچنیں جبریل با ہر پیغمبرے در ذات وے بود۔ و آں قوت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت وحی بر ایشاں نازل می گردید، و لہذا جبریل با ہر پیغمبرے بزبان وے سخن گفتہ"[1]

اور آزاد نے میر سید محمد ترمذی کالپوی ۱۱۰۱ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے وارد دات کے نام سے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی تھی، اس زمانہ کے علمائے ظاہر نے شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ پر ہنگامہ برپا کر کے سلطان عالمگیر کو خبر پہنچائی کہ اس رسالہ میں شریعت کے خلاف باتیں ہیں، سلطان نے حکم دیا کہ پورے ملک کے درویش اور مشائخ کو معسکر سلطانی میں حاضر کر کے سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے، اس موقع پر شیخ محمد افضل الہ آبادی کو میر سید محمد ترمذی کی کتاب وارد دات کے بارے میں تشویش ہوئی کہ غلبۂ حال میں یہ کتاب سپرد قلم ہو گئی ہے، اور رسالہ تسویہ کے بارے میں بہت

---

[1] مقدمہ مآثر الکرام

زیادہ اشتغال پھیلا ہوا ہے، اس لیے واردات کو پانی میں ڈال دیا جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا، مگر کتاب محفوظ رہی، اور یہ نسخہ شیخ خوب اللہ (محمد یحییٰ) الہ آبادی کے پاس محفوظ رہا، آزاد نے لکھا ہے:-

شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی قدس سرہ در کتاب اعلام الاعلام می گوید من این رسالہ بعینہا با رسائل دیگر از تصانیف حضرت سید میر قدس سرہ یکجا جلد کردہ، حرز جان وایمان دارم"[1]

علمائے شریعت کی طرح سلطان عالمگیر نے اس رسالہ پر شدید نکیر کی اور صوفیہ ومشائخ کے محضر میں شیخ محب اللہ کے مریدوں سے کہا کہ اس رسالہ کے مندرجات کو احکام شریعت کے مطابق کرکے بتاؤ، ورنہ شیخ کی بیعت واوراد سے توبہ کرو،

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسویہ کس قدر مختلف فیہ رسالہ تھا، اور اس کے مباحث بظاہر فلسفیانہ افکار ونظریات پر مشتمل تھے، اس کی شرح کے لیے قلم اٹھانا اور اس کے معتویات کو شریعت کے مطابق ثابت کرنا باطنی اسرار وحکم کے ماہرین ہی کا کام ہو سکتا ہے، اس لیے حافظ صاحب کی شرح تسویہ علوم باطنی میں ان کے تبحر کی بین دلیل ہے،

تصانیف حافظ صاحب علوم مروجہ وفنون متعارفہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے، اور تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی شغل رکھتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، تصوف، کلام اور فلسفہ وغیرہ پر ان کی متعدد معیاری کتابیں ہیں،

---

[1] مقدمہ مآثر الکرام ج ۱ص ۲۱۲ و ۲۱۳،

(۱) المختصر اصول فقہ میں عربی زبان میں نہایت جامع متن ہے، (۲) المحکم رسالہ مختصر کی شرح ہے۔ محکم الاصول کا قلمی نسخہ حضرت مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارسی کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر اس کی موجودہ بے ترتیبی کی وجہ سے اس کی زیارت نہیں ہوسکی، (۳) شرح رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی، (۴) ملا محمود جونپوری اور میر باقر استرآبادی کے درمیان حدوث دہر کے مباحث پر محاکمہ، (۵) حاشیہ تفسیر بیضاوی، (۶) حاشیہ حکمۃ العین، (۷) حاشیہ عضدی، (۸) حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ (۹) حاشیہ تلویح، (۱۰) حاشیہ شرح مواقف (۱۱) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی، (۱۲) حاشیہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جونپوری، اس میں جابجا ابحاث باقیہ کا رد بھی ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید جونپوری کے استاد ملا محمد افضل استاد الملک نے ایک مرتبہ رسالہ شریفیہ کی تعریف کی، شیخ محمد رشید نے ان کے ہاتھ سے لیکر آٹھ دن میں اس کی بہترین شرح لکھ دی جس سے ملا محمد افضل بہت خوش ہوئے، اس سے ملا محمود کو انقباض ہوا، اور انھوں نے اپنے ایک شاگرد ملا محمد باقی کو حکم دیا کہ تم رسالہ شریفیہ کی شرح لکھو، جس میں شیخ محمد رشید کی شرح کی بھی شرح ہو، چنانچہ ملا محمد باقی نے چند دن میں شریفیہ کی شرح آداب باقیہ کے نام سے لکھکر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کردی اور اسی کے ساتھ شیخ محمد رشید کی شرح کی ایک شرح ابحاث باقیہ کے نام سے لکھی، جس میں جگہ جگہ شیخ محمد رشید پر اعتراضات کیے، حافظ صاحب نے شیخ محمد رشید کی فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کی شرح میں ملا محمد باقی کی کتاب ابحاث باقیہ کے ان ہی اعتراضات کا رد کیا ہے،[1] افسوس ہے کہ حافظ صاحب کی ان تصانیف میں سے

۱؎ تجلی نور ج ۲ ص ۶۶،

کوئی کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذر سکی کہ اس کا تفصیلی تعارف کرایا جا سکے، انکی سب سے آخری تصنیف شرح تسویہ ہے،

وفات | شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت کے بعد دو تین سال تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کر کے ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں فوت ہوئے، مآثر الکرام میں ہے

عنقریب ہماں ایام در بنارس کہ	قریب قریب ان ہی ایام میں اپنی
مسقط الراس او ست انتقال کرد،	جائے پیدائش بنارس میں ۱۱۳۳ھ
وکان ذلک فی ستہ ثلث وثلثین	میں فوت ہوئے، اور اسی جگہ
ومائیۃ والف، وہمانجا مدفون گردید[۱]	دفن کیے گئے،

تمام تذکرہ نویسوں نے حافظ صاحب کا سنہ وفات اور مدفن یہی بتایا ہے، لیکن کسی میں مہینہ اور تاریخ کی صراحت نہیں ہے، اسی روضہ میں ان کا بھی مزار ہے جسے انھوں نے ۱۰۹۷ھ میں اپنے والد وغیرہ کے لیے تعمیر کرایا تھا، جو اس وقت علوی پورہ میں سٹی اسٹیشن کے جنوب میں سڑک کے اس پار واقع ہے، اسی کے پاس یتیم خانہ مظہر العلوم کی عمارت ہے، مقبرہ کے کتبہ میں یہ اشعار ہیں، جو حافظ امان اللہ بنارسی کے والد مفتی نور اللہ کے بارے میں ہیں، ان کے مادۂ تاریخ سے ۱۱۰۴ھ نکلتا ہے:۔

نماند کسے دائم اندر جہاں	ندارد بنا گنبد آسماں
بغلطند زیر زمیں مہوشاں	بخاک اندر آمیز کیخسرواں
گدا و شہ و قانع تاجراں	گذشتند چوں برق در یک زماں

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳

بسا بادشاہ و سکندر فشاں نشاں نش نماند دریں کارواں
درحقیقت دل است روضۂ دوست
ہر کہ صافش گرفت دوست از اوست
دریں دہر ہر کس کہ آمد دراں بدنیا کجا یافت آرام جاں
چہ شد اں سلیمان و نوشیرواں چہ جمشید در آخر گلستاں
نہ آں شہسواران لشکرکشاں نہ آثار ترکش، نہ تیر و کماں
روضۂ چشم کن صفا اے دوست
اوست در ہر مقام خلق از دوست
کجا خاک و کوباد، وآب رواں کجا آتش گرمیٔ دیگراں
نہ افلاک پائندہ وسائباں مگر ذات حق "کل یوم بشاں"
صاف کن روضۂ دل خود دوست
صوفی زر وضۂ دل خود اوست
بناکرد حافظ دریں بوستاں زبہرخدا مرقد دوستاں
مورخ ز امداد غیب اللساں نکو یافتہ "روضۂ طالباں"
سنہ ۱۱۸۵ھ
چشم بکشا در آب روضۂ دوست
ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست ہے۔

ان اشعار میں جگہ جگہ فنی اور شعری استقام ہیں جو انکے صحیح طور سے پڑھ نہ جانے کا نتیجہ ہیں۔
برہان الملک سعادت خاں کے پرآشوب دور میں آپ کا خاندان محفوظ رہا مگر بعد میں نوابان اودھ کی کوشش سے دوسرے سنی خاندانوں کی طرح آپکے خاندان کے افراد بھی شیعہ ہوگئے۔

برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال

از
جناب لطف الرحمٰن صاحب پٹنہ

یہ امر مسلّم ہے کہ زبان جب تک زندہ رہتی ہے دوسری زبانوں سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ ان کے الفاظ اس زبان کے اپنے الفاظ بنجاتے ہیں۔ دنیا کی تقریباً سبھی زندہ زبانوں میں یہ اصول پایا جاتا ہے۔ اگر انگریزی زبان سے فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور اردو سے فارسی، عربی اور ترکی الفاظ خارج کر دیے جائیں تو یہ زبانیں بے مایہ ہو کر رہ جائینگی۔

اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دو مختلف زبانیں بولنے والی قومیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد قائم ہوتا ہے تو قانون فطرت کے مطابق مذہب، اخلاق، زبان اور طرز رہائش وغیرہ پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے، جو رفتہ رفتہ زیادہ واضح اور نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پوری دنیائے لسانیات میں یہ اصول کارفرما ہے، اور دنیا کی تقریباً سبھی زبانیں اسی اشتراک و اتحاد کی رہین منت ہیں۔ اس میں کوئی استثنا نہیں کیونکہ اظہار مطلب اور افہام و تفہیم کے لیے ہر شخص ایسا لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کو دوسری قوم کا فرد سمجھ لے۔ یہ سلسلہ

برابر چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں،[1]

برج بھاشا، شورسنی اپ بھرنش کی ایک شاخ ہے، اپ بھرنش کا زمانہ پراکرت کے بعد کا ہے، پراکرت کے انحطاط کے بعد مختلف علاقوں میں جو مختلف اپ بھرنشیں ابھریں اُن میں شورسنی اپ بھرنش اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس عہد میں ادب کے وجود کا سراغ اسی زبان میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے :-

"Possibly Soursoni was the polite language of the day when people employed a vernacular, and in the Apaleransa period, eastern poet employed the Sourseni-Apaleransa to the exclusion of their local pation (The origin & The Devlopment of Bengali lang. p. 91)

اور ڈاکٹر ٹکمپتی آریائی اپنے ڈی۔لٹ کے مقالے میں فرماتی ہیں :-

"اشوک کے بعد کے اتہاس (تواریخ) سے گیات (معلوم) ہوتا ہے کہ اشوک کے بعد ماگدھی کے وکاس (فروغ) پر دھیان نہیں دیا گیا۔ اس کا ویوہار (استعمال) ابھن سریشٹھ (بھلے طبقے) کے لوگ کرنے لگے .... ودوانوں (علما) کا انومان (اندازہ) ہے کہ اکیلے شورسنی اپ بھرنش نے ہی ماگدھی اور اردھ ماگدھی بھاشاؤں کا استھان تک چھین

---

[1] محمد یحییٰ تنہا - سیر المصنفین جلد اول ص ۳۵

(اودبی علاقہ) ادھیکرت (محفوظ) کرلیا، اس انومان کا آدھار یہ ہے کہ کیول شورسینی اپ بھرنش میں ہی ساہتیہ الیبدھ ہوتا ہے اِس تتھیہ (حقیقت) کی پُشٹی (تصدیق) اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اپ بھرنش کال میں پوربی چھیتروں کے کوی اپنی چھیتریٔ بولیوں (علاقائی زبانوں) اُپیکچھا (نظرانداز) کرکے شورسینی اپ بھرنش کا دیوہار ساہتیک ُدیشیوں کیلئے کرتے تھے۔" (مگھی بھاشا کا ادھین)

مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور یہاں باضابطہ توطن اختیار کیا تو ہندوستان کے باشندے ان کی زبان وتہذیب اور اخلاق وعادات سے قدرتاً متاثر ہوئے، مسلمان اپنے ساتھ ایک اعلیٰ مذہب، ایک مکمل دین اور بلند اخلاق لے کر آئے تھے، اخوت ومساوات کے معلم تھے اور کمزوروں سے ہمدردی، عورتوں پر رحم، عبادت خانوں کا تحفظ دینی فرض سمجھتے تھے، اس کے برعکس ہندوستان اونچ نیچ کی تفریق، اور برہمن اور شودر کے اختلاف میں مبتلا تھا، ان حالات میں یہاں کے باشندوں کے لیے اسلام کی تعلیمات عجیب اور قابل تقلید تھیں، چنانچہ دونوں قومیں پہلے سندھ اور اس کے نواح میں، پھر پنجاب، دلی، دکن، بہار اور بنگال میں ملیں اور صدیوں تک یہ ارتباط قائم رہا، اس ارتباط سے دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا، اس کی جھلک دونوں قوموں کی زبان میں بھی نظر آتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں بولی جانے والی تقریباً سبھی زبانوں مثلاً برج، کھڑی بولی، بندیلی، ہریانی، پنجابی، قنوجی وغیرہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں،

ہمارا موضوع برج بھاشا میں عربی، فارسی کے استعمال کا جائزہ ہے، برج بھاشا کا مرکز برج کا علاقہ ہے، اس میں متھرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے،

اس کا تعلق اردو زبان سے خاصا گہرا ہے، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اردو اسی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، لیکن ہمارے[1] خیال میں برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہو، جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے اطراف میں بولی جاتی ہے، بہت مشابہت رکھتی ہے، مگر یہ اپ بھرنش کی ایک علاحدہ شاخ ہے، پروفیسر محمود شیرانی فرماتے ہیں:-

"ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں، لیکن جب ان دونوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں، اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے، اس لیے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں، ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں، بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔"

(پنجاب میں اردو مقدمہ)

برج بھاشا کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کے شعراء نے اپنے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے، برج کے مشہور شعراء میں سورداس، کنبھن داس، پرمانند داس، چتربھج داس اور میرابائی وغیرہ نے عربی، فارسی کے الفاظ نہ صرف استعمال کیے ہیں بلکہ حتی الوسع صحت کا بھی خیال رکھا ہے، خصوصاً سورداس نے اس کثرت اور مہارت کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال کیا ہو کہ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کو عربی سے واقفیت تھی، اس میں حیرت کی کوئی بات

---

[1] سکسینہ: تاریخ ادب اردو ص ۲۶

نہیں ہے، کیونکہ نابغۂ فن تعصب و تنگ نظری سے پاک ہوتا ہے، پھر اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ فارسی دفتری زبان تھی، اس لیے ایک زندہ زبان ہونے کی حیثیت سے برج نے عربی فارسی کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹا، اس کی تصدیق ڈاکٹر پی، ان، منڈل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"...... عربی، فارسی اور ترکی کے انیک شبد (متعدد الفاظ) اتری بھارت میں سامانیہ بول چال کی بھاشا میں پرچلت (مروج) ہو گئے تھے، یہی کارن ہے کہ ان بدیشی بھاشاؤں کا ودھی وت ادھین (باضابطہ مطالعہ) نہ کرنے والے کویوں نے بھی ان کا سوتنترتا پوروک (آزادانہ) پریوگ کیا، اور اس پرکار اپنی بھاشا کو ویوہارک روپ دینے میں سمرتھ ہو سکے۔" (سور کی بھاشا)

ذیل میں ہم برج بھاشا کے چند مشہور شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں:

سورداس :۔ فارسی اور عربی الفاظ کو اپنی شاعری میں جس کثرت سے اور جس خوبصورتی کے ساتھ سورداس نے استعمال کیا ہے، برج کے کسی شاعر نے نہیں کیا ہے۔ سورداس، کرشن بھگت اپنے زمانے کے عدیم المثال شاعر اور بڑے اچھے زبان داں تھے۔ ان کی زبان دانی کا اعتراف ہندی ادب کے تقریباً سبھی نقادوں نے کیا ہے، اور بحیثیت ماہر السنہ اُن کی اہمیت تسلیم کی ہے، ذیل میں ان کے کلام کے حوالے سے ان الفاظ کی ایک مختصر فہرست نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے جسے سور نے استعمال کیا ہے :۔

عربی الفاظ | عبیر۔ اُڑت گلال عبیر زور تہہ ورت دیپ اجیارو

عمل ۔ آنند کند چند مُکھ نسی دن اُدو لوکت یہ عمل پریو

امین ۔ نین امین اُدھر مکی کیں بس جنہ کو تنہو چھپیو

اصل ۔ گری اور جا پریم پرتی کو اصل کہاں کھتیا وے

قلعی ۔ دیکھے مادھو کی چتورائی اُدھری کناک قلعی دینج گئے وکے

جمع ۔ سابق جمع ہوتی جو جوری من ذلک تلبا یو

جواب ۔ سور آپ گذران مصاحب لے جواب پہنچاوے

مصاحب ۔ ،، ایضاً ،، ،،

عقل ۔ اندر ڈھیٹ بلی کھائی ہمری دیکھو عقل گنوائی ،

خطا ۔ سورداس حیرنن کی بلی بلی کون خطاتیں کرپا باری

فارسی الفاظ | ترکش ، کمان ۔ کوبدھی کمان چڑھائی کوپ کری بدھی ترکش ریتا

کمان ۔ بھری کمان دیلو کتی ٹھاڑی اپنے رنگ رنگیلی

در ۔ جیوت جاچت کن کن نردھن در در رٹت بے حال

دربار ۔ جانت پانت (ذات پات) کو و پوچھت ناہیں سری پتی کے دربار

دستک ۔ سورداس کی یہی ونتی دستک کی جے معاف

دامن گیر ۔ ان پاپن تیں کیوں اُب رو گے دامن گیر تمھارے

سردار ۔ تم تو بڑے کُل جھنے ارو سب کے سردار

یہاں سورداس کا ایک دوہا نقل کیا جاتا ہے، جس میں انھوں نے بڑے سلیقے سے عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے:۔

سانچو سو لکھنہار کہاویں

کا یاگرام مساحت کری کے جمع باندھی ٹھہراوے
من مہتو کری قید اپن میں گیان جبتیا لاوے
مانڑی مانڑی کھریان کر دودھ کو پاتا بھجن بھراوے
بٹہ کائی قصور بھرم کو فرد تلے گے ڈارے
نیچے ایک اصل پر راکھے ہرے نہ کبھو ٹارے
کری اور جا پریم پرتی کو اصل کہاں کھتیا وے
دوجے قرض دور کری دیتہ نیکو نہ نامے آوے
مجمل جورے خرچ نی کے کری راکھے لیکھا سمو جھی بتا وے
سور آپ گذران مصاحب لے جواب پہنچا وے

اس کے علاوہ دربان، خاک، آواز، جہاز، سرتاج، باز، نقیب، خواص نوبت، ضمانت، نفع، شہنائی، پیادہ، دغا، بخشش، خراد، ریشم، غور، لائق حضور، بازار، ہزار، ثابت، صندوق، نیزہ، آخر، محل، فوج، سانہ، خبر، زہر، گنہگار، طاق، وغیرہ الفاظ بھی سور کے یہاں ملتے ہیں،

سور داس کی حیثیت اپنے عہد کے نمایندہ شاعر کی ہے، اس لیے حوالے تفصیل سے پیش کیے گئے، سور کے بعد کومبھن داس کا نام آتا ہے، جو اشٹ چھاپ شاعروں میں ہیں، انھیں بھی کرشن سے بڑی عقیدت تھی، انھوں نے اپنے دوہوں میں اس عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے دوہوں میں گذر، بسر، اوقات، گمان، دربار، ناز، نیاز خواص، باقی، جمع، صاف، معاف وغیرہ الفاظ ملتے ہیں، لیکن سور کے مقابلے میں اس طرح کے الفاظ بہت کم ہیں کومبھن داس کے ہم عصر اور ہم عقیدہ چیتربھج داس اور

پرمانند داس تھے ، انھوں نے جہاں کرشن سے اظہار عقیدت کیا ہے وہاں شاعری کے دامن کو بھی وسیع کیا ہو، اگر برج کے شاعروں کی فہرست سے ان شعراکو خارج کر دیا جائے تو اس کے ادب کی تاریخ نامکمل رہ جائیگی ، انھوں نے احوال، اعلان، جاسوس، زر، ہزار، کاغذ، عتاب، دربار، مقتول، کلہ، قصیدہ، لائق، نہال، پرد، ریختہ، حیف وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں ، سورداس کے بعد عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا سلیقہ سب سے زیادہ پرمانند داس کے یہاں نظر آتا ہے۔

برج کا علاقہ متھرا اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے لیکن حیرت کی بات ہو کہ راجستھان جیسے دور افتادہ خطہ کی باشندہ شاہی گھرانے کی خاتون میرابائی نے کرشن جی سے اپنی محبت وعقیدت اور جوش جنوں کا اظہار اسی زبان (برج) میں کیا ہو، تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ میرا صغرسنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی ، شوہر سوگ اور برہ کی آگ بجھانے کے لیے اس نے اپنی توجہ کرشن کی طرف منعطف کر دی تھی ، اس کے یہاں بھی عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، بعض اشعار کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے ، اور معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ کے ہیں ، مثلاً

جو میں ایسا جانتی لے پریت کیے دکھ ہوئے　　　نگر ڈھنڈھورا پٹتی رے پریت نہ کریو کوئے

کہتے ہیں کہ میرا کا سادھو سنتوں میں بیٹھنا اور انکے ساتھ بھجن کیرتن کرنا میرا کے دیور راناکرماجیت کو پسند نہیں آیا ، اسلیے اس نے زہر دینے کی کوشش کی ، میرا نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے ؎

؎ زہر پیالہ بھیجیا رے دو بھیو میرا ہاتھ
؎ میرا کے پربھو گردھر ناگر ہنس کر پی گئی زہر

میرا کے یہاں نہایت روانی سے عربی فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے ،

آون کہہ گئے اجھو نہ آئے دوس رہا اب تھوڑا　　　میرا کے پربھو کب رملوگے عرض کر دوں کر جوڑ

لہ راجستھان کی پنگل بھاشا ۔ موتی لال ۔

کلّیاتِ علی

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی

علی قلی بیگ ترکمان ابن سلطان خلیفہ فارس کے ترکوں میں تھے، جہانگیر[1] کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت میں منسلک ہو گئے، مؤلف عرفات عاشقین کے زمانہ میں ان کی شان و شوکت کا شباب تھا، برہان پور میں مقیم تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد معتوب ہو گئے، اور امارت اور درباری زندگی چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی اور فقراء کی صحبت میں رہنے لگے،

ان کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، ان کے یہ چند اشعار کئی تذکروں نے نقل کیے ہیں :-

طبع تو گر کامل افتادہ است جرم بادہ چیست ۔ برگلوی شیشہ نتواں بست تقصیر ترا

بسیار ملولیم ازیں عمر ندانیم ۔ کآسائش ما در دم تیغ کہ نہفتہ است

خیال شمع رویش دشمن آسایش من شد ۔ چراغے در نظر دارم ازاں خوابم نمی آید

کلیات علی کا ایک عمدہ قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے،[2] سید مظفر نامی نے اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے کہ مصنف کی فرمایش سے لکھا گیا ہے، بعد ختم کتابت مصنف نے مضامین میں جو اضافہ کیا ہے، ان کو حواشی پر اپنے قلم سے لکھا ہے، اس میں

[1] ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء [2] ۷۸۱، ادب، نظم فارسی

پانچ لوحیں مذہب زبرجد کی ہیں۔

کلیات علی کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ مؤلف کے تجربات کا نچوڑ ہے، اور اس میں بے شمار حکایتیں ہیں، جن کا تعلق خود علی قلی سے تھا یا ان کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے اس زمانہ کی اخلاقی، معاشی اور سماجی حالت کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور ان میں ایران وہند کی مشترکہ ثقافت کے گہرے نقوش دکھائی دیتے ہیں، ان حکایتوں سے خود مؤلف کے رجحانات اور تجربات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس نسخہ میں سب سے پہلے نثر میں ایک مقدمہ ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

"نیست بر معنی وحدت شاہد، انما اللہ الہ واحد، در دار الشفا شرح معنی این بیمار نحیف علی گویہ کہ تا ملایمات دنیوی و فکر احوال اخروی......
این دیوانۂ الٰہی را چوں بر دل ہجوم می کرد..... و زبان پریشان می گفت و بر سر چہار سوق عالم کہ ہر کس بکیفیتی سرخوش بود و از شدت مستی پروای درد کسی نمی کرد...... غمی کہ ہست غم فرداست......"

اس کے بعد مثنوی "بہجۃ العارفین"[1] ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

زاں پیش کہ این نمود بی بود از خلوت بود روی بنمود

اس کے بعد ایک دوست کا ذکر ہے، جس نے انھیں شعر کہنے سے منع کیا تھا۔

از گفتن شعر خود چہ حاصل رعنائی طبع را فرو ہل

اس کے بعد "علمای قال" کے سلسلہ میں ہندوستان کی ایک رات کا ذکر

---

[1] ۵۶۰ بیت

کیا ہے، جس میں واں اول، دوم، سوم، اشراف، متکلم اور حکیم نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، پھر اپنے والد کی مدح کی

در گوشۂ این خرابہ خوارم یکتا پدر است غمگسارم

اور ان سے اجازت لے کر سفر شروع کیا،

اس مقام پر علی نے اہل مدرسہ و صومعہ کی توصیف کی ہے اور "عالم قال" کو چھوڑ کر "عالم حال" اور توحید کی طرف رجوع کیا ہے، اس کے بعد ملا محمد صوفی مازندرانی[1] کا بڑے خلوص سے ذکر کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انکے بڑے گہرے دوست تھے،

یاریست مرا بکشور ہند صوفی و ندیم و زاہد و رند

صوفی منشی محمد شن نام خود باغ و بہار بادۂ و جام

صابر عراقی[2]، ابراہیم خاکی، نادم جیلانی[3]، صدر الدین مسیحی، طالب آملی کے ذکر پر یہ مثنوی ختم ہوتی ہے[4]

دوسری مثنوی "خرقۂ علی" ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

خدایا توئی بر جہاں بادشا پذیرندۂ مردم پارسا

اس مثنوی کے شروع میں اس کا سبب تالیف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک سرو رات میں علی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوان نے آکر کہا کہ خرقہ تیار کرو، اس کے بعد شاہ عباس ماضی[5] کی مدح کی ہے:

---

[1] وفات ۱۰۳۵ھ / ۲۶-۱۶۲۵ء [2] میر صابر متوفی ۱۰۷۰ھ / ۶۰-۱۶۵۹ء [3] شہسوار بیگ نام گیلانی متوفی ۱۱۰۰ھ / ۸۹-۱۶۸۸ء [4] تقریباً ۵۲۹ بیت [5] ۹۸۵ھ ـ ۱۰۳۸ھ / ۱۵۸۷ء ـ ۱۶۲۹ء

خدیو خرد مند عباس شاہ فروزندۂ بخت وتخت وکلاہ

مثنوی میں چار باب اور بہت سی چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں جن میں سے اکثر آپ بیتی ہیں، یا شاعر کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی کتنے بڑے سیاح اور تجربہ کار تھے۔ پہلے باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مثنوی ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں ہندوستان میں لکھی گئی، اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی، اس میں شاعر نے اپنے وطن واپس جانے کا بھی ذکر کیا ہے :-

شبی سر فرو بردہ بودم بخویش بیاد آمدم عہد یاران خویش
بسیج سفر را ہمی ساختم دو اسپہ بدیں شوق می تاختم
ز ہجرت فزوں بود دہ بر ہزار کہ گشتم فلک وار گرد دیار
ہمانا کہ بودم ہمی سال سی نوشتم بہند اینچنیں فارسی

بادشاہوں کی عدالت کے بارہ میں ایک حکایت سید خواجہ کی ہے جو کسی سخی راجہ کے پاس بہت دنوں تک رہے تھے، ایک قصہ خود علی کی جوانی کا ہے، وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے، جب بادشاہ نے اس حسین کی شہرت سنی تو اس کو بلایا، پھر جب علی معشوق سے ملے تو اس نے کہا "اے علی تم نے ابھی تک وہ جہانسوز حسین نہیں دیکھا ہے جس کی آگ میں رند اور بادشاہ دونوں جل جاتے ہیں"

بگفتا علی سخت سوزیدۂ تو حسن جہاں سوز نادیدۂ
سرکوئی خوباں ہمہ روزگار ز شاہان و رنداں بود فتنہ زار

درویشوں کے اخلاق کے بارہ میں بہت سی دلچسپ اور مفید حکایتیں ہیں، آخر میں ساقی نامہ کے طرز پر ایک حکایت ہے جس میں ایک گرم رات کا

نقشہ کھینچا گیا ہے،

"خرد نامۂ علی" کو علی نے نثر میں بھی لکھا ہے، اور اس کا نام "کتاب منثورۂ خرد نامۂ علی" رکھا ہے، اس میں بادشاہوں کی سیرت کے بہت سے واقعات ہیں جو خود علی قلی سے متعلق ہیں، یا ان کے مشاہدہ میں آئے ہیں،

اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی[۱] ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے،

بگذر از شاہد ان عہد حکیم — انّ ربّی بکیدہن علیم

آخر میں ۲۵۲ رباعیاں ہیں، ایک رباعی میں اخوندوں کا مذاق اڑایا گیا ہے

اخوند کہ صوفی و متیں آمدہ است — با نشاء تریاک حزیں آمدہ است

یک بین و موحد است در کردۂ خویش — در عیب کساں دل دو بیں آمدہ است

ایک میں علی نے اپنے وطن جانے کا ذکر کیا ہے:۔

آں دوست کہ در جوہر ما ساخت عرض — صحت ہمہ از دو بود اگر او ست مرض

رو نہ بوطن علی بغربت تاکی — ہر نامہ کہ خواندیم ہمیں بود غرض

ایک رباعی میں علی لوگوں کی مذہبی تنگ ذہنیتوں کا ذکر کرتے ہیں، جس سے ان کی وسعت مشرب کا پتہ چلتا ہے،

تا چند کہ ایں برافضی گشت شبیہ — تا کی کہ فلاں بناصبی ہست کریہ

زیں کعبہ رواں کنارۂ خواہ علی — بتخانۂ ما ایں بتان است وجیہ

ایک رباعی میں کسی سورت کے بزرگ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

اے بندر سورت از تو معنی کردۂ — ہر دم علی از نگاہت اندر بدۂ

در آتش و آب در گرفتی عالم — تا در تر و خشک آتش اندر زدۂ

---

[۱] ۱۰۰ سو بیت،

مآخذ

۱۔ تقی اوحدی : عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۲۳۰، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۲۔ والہ داغستانی :۔ ریاض الشعرا، نسخۂ خطی شمارہ ۲۲۳ ب، " " "
۳۔ سراج الدین علی خاں آرزو :۔ مجمع النفائس نسخۂ خطی، شمارہ ۶۹۵ " " "
۴۔ حسین قلی خاں عظیم آبادی :۔ نشتر عشق، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۶ " " "
۵۔ سید علی حسن خاں : صبح گلشن، مطبع فیض شاہجہانی، بھوپال
۶۔ محمد عبد الغنی خاں : تذکرۃ الشعرا، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ ۱۹۱۶ء
۷۔ علی قلی : کلیات علی قلی، نسخۂ خطی شمارہ ۷۸۱، (نظم فارسی) سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
۸۔ احمد علی ہاشمی : مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری پٹنہ

مقالہ نما
مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۶)
مباحث منطق، حکمت و فلسفہ

عبدالسلام ندوی ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۱ء

"مسئلہ ارتقاء اور حکماے اسلام" حوالہ ۲۷۹/۸

متکلمین اسلام نے جب علم کلام کو مدون کرنا چاہا تو ان کو دو مرحلے طے کرنا تھے، اولاً تو یہ کہ خود یونانی فلسفہ سے صحیح واقفیت حاصل کی جائے اوس کے بعد ان کی تردید کی جائے، پہلا کام دوسرے کام سے مقدم تھا، اس بنا پر علماء نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی.... ....میں جو لوگ قدیم فلسفہ میں چور ہیں اُن کے نزدیک ڈارون کی وقعت ایک بندر نچانے والے سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس مسئلہ کا وہ موجد ہے اس سے زیادہ کوئی مسئلہ فلسفہ کی تمام عظیم الشان شاخوں کا جامع نہیں،

عبدالکریم میر علوی اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۱۲ء

حرکت زمین پر بسیط بحث حوالہ ۲۷۹/۹

اس رسالہ کے لکھنے سے بڑی غرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو ایک دنیا کی دنیا لڑ رہی ہے، جو کچھ فریقین نے اپنے خیالات ثابت کرنے کے لئے موشگافی کی ہے، سب کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ لوگ خود فیصلہ کر سکیں،

اس رسالہ کے دیکھنے سے انگریزی داں۔ عربی دانوں کے خیالات مع دلائل پورے واقف ہو سکتے ہیں، اور عربی داں انگریزی دانوں کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں،

عبدالواحد صاحب جون ۱۹۱۱ء

امکان خلاء ص ۲ ۔ ۱۵

حوالہ ۔ $\frac{279}{8}$

"فلسفہ کے حاملانِ قدیم و جدید بالاتفاق یہ مانتے ہیں کہ حقیقتِ اشیاء کا دریافت کرنا، انسانی طاقت سے بالاتر ہے، فلسفۂ قدیم کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ حقائقِ اشیاء کا علم محال ہے،

موضوع پر قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے،

علوی، ضیاء الحسن اگست ۱۹۱۰ء

"حواس خمسۂ باطنی" ص ۔ ۵ ۔ ۱۳

حوالہ $\frac{279}{5}$

یونان کے کسی حکیم نے حواس خمسۂ ظاہری پر قیاس کر کے یہ تصوری قائم کی کہ انسان کے جس طرح یہ ظاہری پانچ حواس ہیں، اسی طرح پانچ حواس باطنی بھی ہیں، ... اس مسئلہ کے ماننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، سب سے پہلی آواز جو مسئلہ کی مخالفت میں اٹھی وہ متکلمین اسلام کی تھی،،

علوی، ضیاء الحسن — جنوری ۱۹۰۷ء

حدوث مادہ — ص - ۲۱ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۴

"یہ مسئلہ کہ مادہ کو فنا نہیں، اور مادہ ہی ہر شے کی علت ہے، جب سے تاریخ فلسفہ کا ہم کو علم ہوا ہے، ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں مانا گیا ہے، اور اس مذہب کے موئدین ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں لیکن مادہ کا جس قدر زور و شور ہمارے زمانہ میں ہے ویسا کبھی نہیں ہوا، چونکہ اس مسئلہ کا ایک پہلو اسلام کے مخالف ہے، لہذا ہم نے مادہ کے بقا کے دلائل پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔"

علی حسن خان (نواب مترجم) — جولائی ۱۹۱۶ء

ایمان علوم طبعیہ — ص - ۹ - ۲۳

حوالہ ۲۸۶

"علوم طبعیہ میں وہ سب علوم داخل ہیں، جن میں موجودات عالم یعنی جمادات، نباتات، حیوانات سے بحث کی جاتی ہو... ہم ان اشیاء کا خلاصہ بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کو علمائے علوم طبعیہ نے طول طویل بحثوں کے بعد متعدد زبانوں میں تحقیق کر کے دنیا پر واضح کیا ہے،

عمادی، عبداللہ — رجب ۱۳۲۳ھ

مناظرہ کا ایک جلوہ — ص - ۱۰ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۴

"مناظرے سے ہماری مراد "علم مناظرہ مرایا" ہے، اور اس مضمون میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں

کہ مناظر کی ابتدائی حالت کیا تھی، یونانیوں نے کس درجہ تک اس پر ترقی کی، اور مسلمانوں نے اسے کس حد تک سجایا، ساتھ ہی ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ موجودہ علمی ترقی کو اسلامی تحقیقات سے کہاں تک فائدہ پہنچا، اور اہل یورپ نے اس بارے میں کس قدر مسلمانوں کے احسان مند ہیں،

معین الدین احمد ندوی، دسمبر ۱۹۱۲ء

"شہاب ثاقب" ص - ۱۹ - ۲۳

حوالہ ۲۷۹/۹

شہاب ثاقب کے ٹکڑوں میں جو اجزاء فلکی میں داخل ہیں، کوئی ایسا مادہ نہیں ہے جو زمین کے اشیاء میں موجود نہ ہو، بس اس سے معلوم ہوا کہ کواکب آفتاب اسی قسم کے مادوں سے مرکب ہیں،

ہادی محمد بی۔اے، (مترجم) فروری ۱۹۱۱ء

"تمثل" ص - ۱۳ - ۲۲ حوالہ ۲۷۹/۸

ہم جب کسی چیز کا علم کرتے ہیں، تو ہم کو پہلے اس کا سادہ ادراک ہوتا ہے، اس کے بعد اس علم میں لذت پیدا ہوجاتی ہے، جس کو وجدان کہتے ہیں، وجدان سے قوت ارادی کو تحریک ہوتی ہے، اور یہ علم کا آخری نتیجہ ہے، ادراک سادہ سے سائنس وجدان سے فنون لطیفہ و تصوف اور قوت ارادی سے مذہب و اخلاق پیدا ہوتے ہیں،

(ہربرٹ اسپنسر کے مضمون کا ترجمہ وخلاصہ)

مضامین تمدن و ثقافت

آزاد ابو الکلام اکتوبر ۱۹۰۵ء

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ کی سرپرستی

ص ۲۳ - ۳۴ - حوالہ ۲۷۹/۲

مسلمانوں کے لیے یہ بات درحقیقت سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار بازی لے گئے، عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم و فنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی جرأت کو تک رہے ہیں۔"

اکرام اللہ خاں ندوی

"سلاطین ہند کے دربار قصر شاہی کا منظر" اپریل ۱۹۱۵ء

ص ۲۱ - ۲۸

حوالہ ۲۸۵

شاہان مغلیہ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ ہفتہ میں ایک روز انصاف و فریادرسی کے لیے مخصوص کر لیتے تھے، اس روز بادشاہ بجائے دیوان عام کے دیوان خاص میں اجلاس کرتا تھا، بادشاہ کے سامنے قاضی، مفتی اور ارباب عمائم جمع ہوتے تھے ...... خاندان تیموری سے سلطنت مغلیہ کے درباروں کا منظر پیش کیا گیا ہے،

اکرام اللہ خاں ندوی

ارباب تصنیف اور انکا علمی انہماک جون ۱۹۱۵ء

ص ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۵

مسلمانوں کا تمام علمی سرمایہ وحشی فاتحین کے ہاتھوں بغداد و قرطبہ میں برباد ہوگیا، اور جو کچھ بچا تھا، وہ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی نذر ہوا، اس لیے مسلمانوں کے علم و فضل کی داستان سرائی کا موقع حاصل نہیں، لیکن تاہم جو کچھ موجود ہے، وہ مسلمانوں کے فخر و مباہات کے لیے کافی ہے، موضوع بالا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور مشہور مصنفین و محدثین کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں،

سلیمان ندوی (علامہ سید)

(۱) "عرب کے یورپین سیاح" ستمبر ۱۹۰۷ء

ص ۲۷ - ۳۱

حوالہ ۲۷۹/۴

سب سے پہلے اس اہم سفر کے لیے جس نے کمر ہمت باندھی وہ اسٹریلیا کا مشہور عالم نیوبھر تھا، ۱۷۶۲ء اور ۱۷۶۳ء میں اس نے یمن کا سفر کیا، اسکی نصف صدی کے بعد ۱۸۰۷ء میں باڈیا جو اسپین کا رہنے والا تھا، عربستان کے سفر کے لیے روانہ ہوا، پہلے مصر آیا اور اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، اور علی بک عباسی اپنا نام رکھا، حلب پہنچا اور وہاں اس نے ایک شریف النسب مسلمان ہونے کا سرکاری سرٹیفکٹ حاصل کیا جس کی مدد سے مکہ معظمہ پہنچا .....

(۲) مسلمانوں کی بے تعصبی ستمبر ۱۹۰۷ء

"یہود اور دولت عثمانیہ ص ۳۲ - ۳۶

حوالہ ۲۷۹/۴

"مسلمانوں کی بے تعصبی کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات اس طرز حکومت

کے پیش کیے جا چکے ہیں۔ جو مدت ہوئی مٹ چکی ہے، مگر اس وقت ہم ایک موجودہ اسلامی سلطنت کی بے تعصبی دکھانا چاہتے ہیں، دولت عثمانیہ کا اپنی یہودی رعایا کے ساتھ کیا برتاؤ رہا، اس مضمون کا موضوع ہے،

(۳) "مسلمان عورتوں کی بہادری" فروری ۱۹۰۸ء

ص ۵ - ۱۶

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۵}$

"اسلام میں قدیم دستور قائم رہا، جہاد میں برابر مردوں کے ساتھ انکی عورتیں شریک رہتی تھیں، ایک موقع پر ایسا ہوا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھ سے مشک بھر بھر کر زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں، مگر اسی کے ساتھ رسول اللہؐ فضول اور بیکار عورتوں کا لے جانا سخت ناپسند فرماتے تھے،

(۴) "روسی مسلمانوں کے کچھ حالات" مئی ۱۹۱۲ء

ص ۔ ۲۹ - ۳۲

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۹}$

تاتاری مسلمانوں کا ایک اسلامی کتب خانہ شہر ترویسکی (روس) میں واقع ہے جس کا نام 'نجات' ہے، گذشتہ سال کی جنوری سے لیکر اگست تک اس کتب خانہ سے گیارہ ہزار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا،

کیا اس سے تاتاری مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) "اندھوں کی تعلیم" جولائی ۱۹۱۱ء

اس کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، ص ۲۹ - ۳۱

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

"اندھوں کی تعلیم کا سب سے پہلے با قاعدہ سسٹم فرانس میں جاری ہوا، والنٹین ہوئے نے ۱۷۸۴ء میں اندھوں کا سب سے پہلا مدرسہ پیرس میں قائم کیا، فرانسیسیوں کے بعد انگریزوں نے ۱۷۹۱ء میں لیورپول میں ۱۷۹۲ء میں ایڈنبرگ ورا سکاٹ لینڈ میں ۱۷۹۹ء میں، لندن میں اس قسم کے مدارس قائم کئے، اور اب یورپ کے ہر ملک میں اندھوں کی تعلیم کا کافی سامان موجود ہے،

(۶) فرمانروایان اسلام کا دربار اگست ۱۹۰۶ء

ص ۲۱ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۳

خلفائے راشدینؓ کے زمانہ تک خلیفہ اور غیر خلیفہ کی مجلس، تخاطب، گفتگو میں کوئی امتیاز نہ تھا، ہر شخص خلیفہ کا نام لیتا تھا، ساتھ بیٹھتا تھا، گفتگو کرتا تھا،

"جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" سے کچھ اقتباسات کا ترجمہ"

(۷) مسلمان اور سرجری جولائی ۱۹۰۹ء

"زہراوی" ص ۲۳ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۶

"موضوع سے مختصر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد دنیائے طب کی عظیم شخصیت امام زہراوی کی شخصیت، اس کے کمال فن اور مہارت سرجری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تصنیفات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

شبلی نعمانی (علامہ) جولائی ۱۹۰۹ء

(۱) "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر" ص ۳ - ۲۲

حوالہ ۲۷۹/۶

"اس معیار سے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو ہندوستان میں آئے کس شان سے آئے اور ملک پر ان کا کیا اثر ہوا، لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم کو بتانا چاہیے کہ ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن کی حالت کیا تھی، چونکہ ہم اس مضمون میں صرف تیموری دور حکومت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسی زمانہ سے پہلے کی حالت دکھانا کافی ہوگا۔"

(۲) اسلام اور تمدن و ترقی — جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ

ص ۱ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۱

"مخالفین اسلام نے بارہا کہا ہے کہ اسلام وحشی قوموں کو ایک حد تک شائستہ اور مہذب بنا سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کے تمدن کے موافق نہیں اور اس وجہ وہ اعلیٰ درجہ کا تمدن پیدا نہیں کر سکتا، اس مسئلہ کو طے کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ تمدن و ترقی کے بزرگ ترین اصول کیا ہیں، اور وہ اس میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟"

زینبی، سید علی — اکتوبر ۱۹۱۵ء

"اہل مصر کے قبرستان اور رسم تجہیز و تکفین" — ص ۱ - ۱۸

حوالہ ۲۸۵

قدیم زمانہ میں اہل مصر اپنے مردوں کو کفن میں لپیٹ کر زمین کے اندر قبروں میں دفن کیا کرتے تھے، لاش براہ راست مٹی میں یا کسی مٹکے میں بند کر کے رکھی جاتی تھی، کہتے ہیں کہ یہ ابتدائی حالت انھوں نے قابیل کی تقلید میں حاصل کی تھی جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے ایک کوتے سے دفن کرنے کا طریقہ سیکھا تھا،

عبد السلام ندوی اپریل ۱۹۱۱ء

(۱) "اسلامی علوم وفنون اور یورپ" ص ۱۳ - ۲۶ حوالہ ۲۷۹/۸

" یورپ میں عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ کتابیں ہیں جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا، لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین سے منسوب کردی گئیں، اس قسم کی کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات سے تھیں، دوسری وہ کتابیں جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا،

(۲) "اکابران قوم کا درجہ قوموں کی تاریخ میں" جولائی ۱۹۱۵ء

ص ۲۲ - ۲۸ حوالہ ۲۸۵

عام خیال ہے کہ بانیان سیاست کو زمانہ گذشتہ کے تاریخی سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن درحقیقت وہ بھی موحدین و مخترعین کی طرح دور ماضی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن ہیگل کوسن اور کارلائل جیسے انشا پردازوں کی آنکھوں کو ان مدبرین کے انقلاب انگیز کارناموں نے بالکل خیرہ کردیا۔

معین الدین ندوی (حاجی) جون ۱۹۱۵ء

" ایام جاہلیت اور خواتین عرب" ص - ۱۱ - ۲۵

" زمانہ جاہلیت کی عورتوں میں زیور اور بناؤ سنگھار کا بھی رواج تھا، بلکہ لوگ اسکو شرافت کی علامت سمجھتے تھے، چنانچہ حاتم طائی کو جب حالت قید میں ایک لونڈی نے طمانچہ مارا تھا، تو اس نے ان الفاظ میں حسرت ظاہر کی تھی

لو ذات سوار لطمتنی یعنی کاش مجھے کوئی کنگن والی طمانچہ مارتی۔

ادبیات

آیاتِ طیّبات

از جناب وارث القادری

آیاتِ ذوالجلال ہیں قرآں کی آیتیں
آئینۂ کمال ہیں قرآں کی آیتیں

دستورِ لازوال ہیں قرآں کی آیتیں
عالم میں بے مثال ہیں قرآں کی آیتیں

فکر و نظر کو نورِ بصیرت عطا کیا
روشن گرِ خیال ہیں قرآں کی آیتیں

جس کے طلوع کو نہیں اندیشۂ غروب
وہ مہرِ لازوال ہیں قرآں کی آیتیں

ابلیس کے فریب کو معدوم کردیا
شعلہ پئے ضلال ہیں قرآں کی آیتیں

واللہ زندگی کا سہارا انہی سے ہے
مومن کی جان و مال ہیں قرآں کی آیتیں

سارے جہاں میں "نیرِ ماضی" تھیں اور
اب "آفتابِ حال" ہیں قرآں کی آیتیں

فطرت کے جزوِ خاص ہیں اسلام کے اصول
انساں کے حسبِ حال ہیں قرآں کی آیتیں

بزمِ جہاں کو مشرقِ ایماں بنادیا
کیا صاحبِ کمال ہیں قرآں کی آیتیں

باطل کا سر کچلنے کو آمادہ آج بھی
بے جنگ، بے جدال ہیں قرآں کی آیتیں

کفار کیوں نہ "لیس کلام البشر" کہیں
خالق کی بول چال ہیں قرآں کی آیتیں

"سبعہ معلقہ" کے قصیدے کدھر گئے
اور آج تک مثال ہیں قرآں کی آیتیں

گنجِ شرف، پیامِ اخوت، رہِ نجات
"فی کافۃ الرجال" ہیں قرآں کی آیتیں

کتنی بھی ہوں بلائیں ٹپکتی ہیں گی سر
مومن کے حق میں ڈھال ہیں قرآں کی آیتیں

صدقہ ہے آپؐ کا کہ زمانہ میں ضوفگن
یا صاحب الجمال ہیں قرآں کی آیتیں

جس کا ثمر خدا و پیمبرؐ کا لطف خاص
ایماں کا وہ نہال ہیں قرآں کی آیتیں

وآرش الہی کے سایہ میں انسانیت پلی
وہ پرچمِ ہلال ہیں قرآں کی آیتیں

بیانِ حقیقت

از جناب عروج زیدی

یہ تخلیقِ جہانِ مور و ماہی
دکھائی تھی انھیں عالم پناہی

ادا امر کو دیا رنگِ نواہی
دلِ گمراہ! یہ تیری تباہی!!

درِ خیر الوریٰ ہی ایک در ہے
جہاں ڈھلتی ہے ماتھے کی سیاہی

عرب کے ساربانوں کا مقدر
جنھیں بخشا گیا اعزازِ شاہی

علم بردارِ امن و عافیت ہے
احد کا اشجعِ عالم سپاہی

زباں کھولوں بھی کیوں پیشِ ستم پہ
مرا حصہ بہ تائیدِ الٰہی

خدا والوں کا تکیہ نا خدا پر
قیامت ہے ہماری کم نگاہی

محبت مائل الفقر فخری
سیاست کو غرورِ کج کلاہی

مرے سر پر ہے دامانِ محمدؐ
یہ فطرت کا سلوکِ خیر خواہی

وہ جن کے دل ابھی اجلے نہیں ہیں
وہ کیا دھوئیں گے ماتھے کی سیاہی

غلامِ صاحبِ ہر دو سرا ہوں
مری ٹھوکر پہ تاجِ بادشاہی

عروج! ایماں بھی ناقص ہے نظر بھی
تباہی! اور پھر ایسی تباہی!!

تضمین بر کلام اقبال

از جناب ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خانصاحب منشاء

ہے میرے دم سے ہاؤ ہو میکدۂ حیات میں
جذب و جنونِ عشق ہے میرے تصرفات میں
مجھ سے ہے ہمہمہ تمام عالم شش جہات میں
میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

میرے ہی دم سے رنگ ہے محفل کائنات میں
حسن عمل کا دخل ہے میرے کمال ذات میں
خوبیٔ خاص ہے نہاں میری ہر اک بات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

فیض و فور شوق سے حوصلے ہیں مرے بلند
ڈال رہا ہوں آج میں ماہ و نجوم پر کمند
میرے لیے ہے وجہ ناز میرا یہ قلب دردمند
"گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں"

اپنی صفات ہی کا رنگ تو نے ہی مجھ میں بھر دیا
خاک کے پتلے کو شرف کتنا بڑا عطا کیا
تجھ سے مگر مجھے گلہ اتنا ہے اے مرے خدا
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھکو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

باب التقریظ والانتقاد

الجزء الاول

من

الابواب والتراجم للبخاری

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۲۲۰، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ (۱) مکتبہ یحیویہ مظاہر العلوم سہارنپور (۲) مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (سعودی عرب)

صحیح بخاری حدیث کی سب سے معتبر و مستند کتاب ہے، اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے امت نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے متعلق بے شمار کتابیں اور شرحیں لکھی گئی ہیں، اور وہ ہر زمانہ میں درس و تدریس کا لازمی جزر ہی ہے،

منجملہ دیگر اسباب کے صحیح بخاری کی دوسری کتب حدیث پر فضیلت و تقدم

کی ایک اہم وجہ اس کے ابواب و تراجم بھی ہیں، جو امام بخاریؒ کی عظمت شان، جلالت قدر، جودت طبع، ذہن رسا، دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، بالغ نظری، کثرت استحضار، وفور علم، تفقہ و اجتہاد اور استخراج و استنباط وغیرہ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں، اور وہ محدثین اور علمائے فن کے غور و فکر کا مرکز رہے ہیں، اور انھوں نے ان کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کی ہے۔

صحیح بخاری کی بعض شرحوں میں ابواب و تراجم کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، اور ان کے متعلق مستقل کتابیں اور علیحدہ رسالے بھی لکھے گئے ہیں، مگر متقدمین کی اکثر کتابوں کی طرح یہ اب ناپید ہیں، اور محض متداول شرحوں میں کہیں کہیں ان کے حوالے ملتے ہیں، ہندوستان کے علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے صحیح کے ابواب و تراجم پر بیش قیمت رسالے تحریر کیے ہیں، جو طبع ہو چکے ہیں،

موجودہ زمانے کے نامور محدث مولانا محمد زکریا صاحب کی عمر گرامی حدیث نبوی کی خدمت اور درس و تدریس میں گذری ہے، اور انھوں نے کئی اہم کتب حدیث کے شرح و حواشی اور ان سے متعلق مفید اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں، صحیح بخاری بھی عرصۂ دراز تک انکے درس و مطالعہ میں رہ چکی ہے، اسلیے اسکے مباحث پر انکی نظر نہایت عمیق اور گہری ہے، اس سلسلہ میں انکو ابواب تراجم کے موضوع پر بھی غور و فکر کا موقع ملا اور وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج قلمبند کرتے رہے،

یہ عظیم الشان علمی و دینی ذخیرہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی حیثیت دراصل بخاری انسائیکلو پیڈیا کی ہے، اس کے شروع میں ابواب و تراجم کے متعلق بڑے اہم اصول تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے ان کو علیحدہ ایک جلد میں

پہلے شائع کیا گیا ہے، یہ چار حصوں میں منقسم ہے،

پہلے حصہ میں بخاری کے تراجم کی اہمیت اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ ہے، دوسرے میں ان مجمل اصول و قواعد کا ذکر ہے جو بخاری سے متعلق کتابوں اور شرحوں میں تراجم کے بارہ میں بیان کیے گئے ہیں، تیسرا حصہ اسی کی تفصیل ہے، اس میں نمبروار ستر اصولوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اقوال و آراء کا جواب دیا گیا ہے جو ابواب و تراجم کی عدم مناسبت کے متعلق ظاہر کیے گئے ہیں، آخر میں ان ابواب و تراجم کا جدول دیا گیا ہے جن میں مسند حدیثیں درج نہیں ہیں، یہ جدول شیخ الہند کے رسالۂ تراجم سے ماخوذ اور حسب ذیل چار نوعیتوں کا ہے :-

(۱) وہ ابواب و تراجم جو گو مسند حدیثوں سے خالی ہیں مگر ان میں کوئی آیت، حدیث، اثر یا سلف کا قول موجود ہے،

(۲) وہ ترجمے جن میں نہ مسند روایت ہی ہے، اور نہ کوئی اور حدیث و آیت وغیرہ مگر نفس آیات ان کے ابواب کا عنوان ہیں،

(۳) ایسے تراجم جو مسند روایتوں سے بھی خالی ہیں، اور ان میں کوئی حدیث واثر اور آیت بھی درج نہیں ہے، بلکہ مصنف نے ان کا ترجمہ اپنے قول کو بنایا ہے،

(۴) وہ ابواب جو بلا ترجمہ ہیں،

شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک پُرمغز مقدمہ ہے، اس میں تراجم کی اہمیت، ان کے متنوع مقاصد، ان کے غموض و خفا کے اسباب، صحیح بخاری کے ساتھ علماء کے غیر معمولی اشتغال و اعتناء، ابواب و تراجم کے متعلق

قدیم تصنیفات اور زیر نظر کتاب کے بعض خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے،

اس رسالہ کے تیسرے حصہ میں جن ستر اصول تراجم کا مفصل ذکر ہے، وہ مصنف کی کتاب لامع الدراری کے مقدمہ میں بھی شامل ہیں، ان میں زیادہ تر شاہ ولی اللہ اور شیخ الہند کی کتابوں، حافظ ابن حجر، علامہ عینیؒ، قسطلانی اور سندھی کی شروح و حواشی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا انور شاہ کشمیری، کے افادات سے ماخوذ و مستنبط ہیں، لیکن متعدد اصول خود صاحب رسالہ کے فکر و مطالعہ اور ذوق و وجدان کا نتیجہ ہیں،

یہ حصہ مصنف کے رسوخ فی الحدیث، وسعت علم و نظر اور کثرت مطالعہ و تدبر کا شاہکار ہے،

جن ابواب و تراجم سے عام شارحین سرسری گذر گئے ہیں یا ان کی ایسی دور از کار تاویل و توجیہہ کی ہے، جس نے امام بخاری کی ذات کو ہدف طعن و اعتراض بنا دیا ہے، ان ابواب میں مصنف علام کے ذوق سلیم اور نکتہ سنج ذہن نے عجیب عجیب حقائق و معارف کا سراغ لگایا ہے، اور ان کی حدیثوں سے مناسبت کے ایسے دقیق پہلو اور لطیف نکتے واضح کیے ہیں، جن سے امام صاحب پر عائد کردہ الزامات نہ صرف رفع ہو گئے ہیں، بلکہ وہ ان کی عظمت و کمال کی دلیل بن گئے ہیں،

جن ابواب و تراجم اور ان کی احادیث کے درمیان عدم مناسبت کو عموماً نقل کی مسامحت، امام صاحب کے وہم یا مسودہ کی تکمیل اور باقاعدہ ترتیب سے پہلے ان کی وفات یا ان کی اپنی شرط اور معیار کے مطابق حدیث نہ ملنے یا راویوں کے

اضافہ وتصرف وغیرہ کا نتیجہ بتایا جاتا ہے، مولانا نے اس طرح کے تمام ابواب وتراجم اور ان کی حدیثوں کے درمیان ایسی دلنشین مناسبت بیان کی ہے کہ ان سب الزامات کی مکمل تردید ہوگئی ہے اور وہ خود شارحین کے قصور فہم اور قلت تدبر وغیرہ کا نتیجہ معلوم ہونے لگے ہیں، ؎

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

کتاب کا زیادہ حصہ اخذ واقتباس پر مشتمل ہے، اور مصنف علام نے عموماً متقدمین کے اقوال اور اکابر کے بیانات کے دائرے کے اندر رہ کر انکی روشنی میں بخاری کے ابواب وتراجم کے اسرار وغوامض حل کیے ہیں، مگر جہاں یہ صورت ممکن نہیں تھی تو وہاں اپنے نتائج تحقیق بیان کیے ہیں، اور کہیں کہیں پورے ادب واحترام کے ساتھ اسلاف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، یا انکے مختلف آراء میں تطبیق وترجیح دیکر اپنی مرجح رائے تحریر کی ہے۔

مصنف نے بالکل غیر جانب داری سے بخاری شریف کا مطالعہ کیا ہے، اسلیے ان کو عام شارحین کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے اور ان کے آراء پر نقد وجرح کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے، ان کی حق طلبی اور انصاف پسندی نے ان کو علامہ عینی کے مقابلہ میں حافظ ابن حجر کی ہمنوائی اور اپنی جماعت کے ممتاز بزرگ شیخ الہند سے بھی کہیں کہیں اختلاف کرنے پر آمادہ کر دیا ہے،

دوسرے بزرگوں کے جو اصول تحریر کیے ہیں ان کی توضیح کے لیے ان کے حوالے سے مثالیں بھی نقل کی ہیں، اور جن مثالوں میں انکو کوئی غلطی نظر آئی ہے، . . . اسکی تصحیح کر دی ہو اور اصول ومباحث کے سلسلہ میں ان بزرگوں کے یہاں مثالیں نہیں

ملی ہیں، خود تلاش و تفحص کر کے اس کی مثالیں دی ہیں، کسی بزرگ کے اصول کے ضمن میں اس کی تائید میں ملنے والے دوسرے بزرگوں کے بیانات بھی نقل کیے ہیں اور خود اپنے اصولوں کی تائید میں اگر متقدمین کے یہاں اس نوعیت کے معلومات ملے ہیں تو ان کو ذکر کر دیا ہے۔

جن ابواب و تراجم کے مختلف الفاظ مروی ہیں ان کی تصریح اور مرجح روایت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

بعض اصولوں میں باہم بڑی یکسانیت ہے، اس لیے ان کے دقیق فرق کو واضح کر کے التباس رفع کر دیا گیا ہے۔

غرض بخاری کے ابواب و تراجم کے متعلق مختلف کتابوں میں جو کچھ منتشر مواد تھا وہ سب اس میں مفید اضافہ و تشریح کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب نہایت جامع اور معلومات افزا ہے۔

اس کتاب کے محاسن کے ساتھ اس کے مسامحات کا مختصر ذکر اس لیے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آئندہ اس کی تصحیح میں مدد ملے گی۔

صفحہ ۱۷ پر صاحب نزہتہ الخواطر کے حوالہ سے علامہ شبلی مرحوم کی ایک مسامحت کا ذکر ہے کہ "انھوں نے گلشن ہند کے حاشیہ میں شیخ ولی اللہ دہلوی المتخلص باشتیاق کو جو شعر و تصوف اور علم تفسیر میں صاحب کمال اور شیخ عبدالاحد بن محمد سعید سرہندی کی اولاد میں تھے، اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، لیکن اصلاً یہ صاحب گلشن ہند کی غلطی ہے، مولانا شبلی نے خود اس قسم کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ انھوں نے گلشن ہند کے اشتباہ میں ڈالنے والے

بیان کی تردید بھی نہیں کی ہے ،

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصولوں کے سلسلہ میں صفحہ ۴۳ و ۴۴ پر بارہویں اور تیرہویں اصول کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ انکو ایک ہی اصل میں شامل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ خود مصنف نے شیخ الہند کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ ان کو ایک ہی اصل مانتے تھے ،

بعض جگہ کتابوں کے نام اتنے مختصر و مبہم ہیں کہ ان کی جانب ذہن آسانی سے نہیں منتقل ہوتا، مثلاً صفحہ ۳۲ پر حدیث طلا وسط کو اگر حدیث للطبرانی فی الاوسط لکھا جاتا تو ذہن آسانی سے منتقل ہو جاتا ،

عبارتوں کے نقل و اقتباس میں حذف و ترمیم کی وجہ سے کہیں کہیں مفہوم میں تبدیلی یا کم از کم ان کی وضاحت مشکل ہو گئی ہے ،

بخاری کے ابواب کے ناموں کو مختصراً ذکر کرنے کی وجہ سے بھی کہیں کہیں مصنف کا منشا پوری طرح واضح ہونے سے رہ گیا ہے ،

طباعت میں صحت کے اہتمام کے باوجود بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں ، چند غلطیاں نقل کی جاتی ہیں .تاکہ دوسرے اڈیشن میں ان کی تصحیح کر دیجائے ،

غلط	صحیح
ص ۲۳ - باب اثنان فما فوقہا جماعۃ	فوقہما
ص ۲۷ - یہدی طالب الحدیث علی ہذا النوع	الی
ص ۳۲ - باب المزایدہ	باب بیع المزایدۃ
ص ۳۶ - من ما روی عن عمر بن الخطاب وامیۃ رضی اللہ عنہما	ابنہ

غلط	صحیح
ص ۴۰ - جعلها الی شیخ الہند	جعلها شیخ الہند
ص ۴۱ - باب ذلک المرأة	ذلک (اس کا پورا نام باب ذلک المرأة نفسها اذا تطہرت من المحیض ہے پورا نام نہ لکھنے سے بڑا اشتباہ ہوگیا ہے)
ص ۷۱ - فی کم تصلی المرأة من الباب	من الثیاب
ص ۷۲ - ویقول الحسن قال زفر	ویقول الحسن قال بہ زفر
" باب ابراب الابل	باب ابوال الابل
ص ۷۴ - باب الصلوۃ	باب الصلوۃ فی الخفاف
ص ۷۸ - رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اصحابہ فتاخر	"تاخراً"
ص ۹۲ - باب علامة المنافق	باب علامات المنافق
ص ۹۹ - باب وجوب الباب	باب وجوب الصلوۃ فی الثیاب
ص ۱۱۰ - تقدم فی الفائدة الثالثة	الثانیة
ص ۱۲۵ - باب الحکم من قدف مملوکہ	اثم - قذف
ص ۱۲۷ - باب المہر وجزاء الصید	المحصر
ص ۱۲۸ - من استاجر اجیرا فبین وا الاجل	لہ الاجل

آخر میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسالہ سے جو جدول نقل

کیا گیا ہے، اس میں کہیں کہیں حاشیے میں اختلاف نسخ کا ذکر اور اس فرق کی تصریح کی گئی ہے، جو اصل اور جدول کے درمیان ہے، مگر اس قسم کے اور متعدد ابواب پر حواشی تحریر کرنا رہ گیا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والی کتابوں میں مفصل فہرست اور اسماء و اعلام کا اشاریہ شامل رہتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ یہ اہم اور بیش قیمت کتاب فہرست اور انڈکس سے خالی ہے،

مطبوعات جدیدہ

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک } جناب خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۵۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر۔

قیمت مجلد عہ/۱۲ پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

زبان وادب میں ترقی پسندی کوئی نئی چیز نہیں، ہر دور کے ترقی پسند خیالات ورجحانات کا اثر اس دور کے ادب پر پڑنا بالکل قدرتی ہے، جس سے اردو بھی مستثنیٰ نہیں، اردو ادب میں ترقی پسند خیالات کی ابتدا سرسید، غالب، حالی، آزاد شبلی اور اقبال کی نظم ونثر سے ہوئی، اور اردو زبان نے خیالات اور طریقۂ تعبیر دونوں حیثیتوں سے ایک نیا قالب اختیار کیا، مگر اس کا دائرہ مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی، تعلیمی اور اردو زبان وادب کی اصلاح تک محدود تھا، اس کے بعد بین الاقوامی انقلابات وسیاسیات کا دور شروع ہوا، اور سوویٹ روس کے انقلاب سے ساری دنیا گونج اٹھی، اور ایک طبقہ کی نگاہ میں کمیونزم ترقی پسندی کا معیار قرار پائی، اس لیے دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی اس سے متاثر ہوئی، اور چند برسوں کے اندر اس میں ترقی پسند ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، لیکن یہ ادب تمام تر کمیونسٹ ادب کی صدائے بازگشت تھا، اس لیے اس کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں اس کے حصہ میں آئیں، اور ابتدائی دور میں

اس میں بڑی بے اعتدالی ہوئی، ترقی پسند نوآموز شاعروں اور ادیبوں نے جو کمیونزم کو سمجھتے بھی نہ تھے، صرف بازار میں اس کا چلن دیکھکر اس کی لے میں لے ملانے لگے تھے، اس کی بڑی مکروہ تصویر پیش کی، اس کے انتہا پسندوں نے اس ادب کو محض کمیونزم کے پروپگنڈے کا ذریعہ اور ہر قدیم چیز سے بغاوت کو شعار بنا لیا، اور تعمیر کے بجائے تخریب کے نعرے لگانے لگے، اور عوامی ادب کی دھن میں یا عجز کی بنا پر اردو زبان کی پرانی روایات کو بھی نظرانداز کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیا ادب خیالات اور ادبی پہلو دونوں حیثیتوں سے سنجیدہ ادبی حلقوں میں اعتبار پیدا نہ کر سکا، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس میں اعتدال پیدا ہونے لگا، اور اس کے سنجیدہ ادیبوں نے تعمیری اور ادبی دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا، درحقیقت یہی ترقی پسند ادب کا صحیح نمونہ ہے، اس کی تاریخ پر مضامین تو بہت لکھے گئے، لیکن غالباً کوئی مستقل کتاب نہ تھی، اس لیے لائق مصنف نے اس کو اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کا موضوع بنایا، اب انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ ہے، دوسرے میں اس کے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسرے میں ترقی پسند ادیبوں کے تنقیدی خیالات پر تبصرہ ہے، مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لیے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگھالا ہے، اور بڑے اعتدال و توازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے، اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا،

علماء اہل سنت ۔ از مولانا محمود احمد صاحب قادری تقطیع بڑی، ضخامت ۳۲۶، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت للعہ پتہ :۔ خانقاہ قادریہ اشرفیہ اسلام آباد، بھوانی پور، پوسٹ سنبرساڈیہ ضلع مظفرپور، بہار ۔

یہ بریلوی عقیدے کے علماء کا تذکرہ ہے، اہل سنت میں تو شیعہ کے علاوہ ایمۂ اربعہ کے مقلد، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث سب داخل ہیں، لیکن بریلوی حضرات نے غالباً اہل بدعت کے مقابلہ میں اپنے لیے اہل سنت کی اصلاح مخصوص کرلی ہے، جو لوگ ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں، ان کو وہ اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں، ان میں بھی بڑے بڑے مشائخ و علماء گذرے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم لوگوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ لکھنے کی ضرورت تھی، علماء اہل سنت انہی کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں بہت سے معروف و غیر معروف علماء کے حالات آگئے ہیں، مگر بعض ایسے علماء کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو کسی حیثیت سے اس زمرہ میں نہیں آتے، مثلاً مولانا بحر العلوم اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا گنج مرادآبادی تو اپنے دور کے بہت بڑے متبع سنت اور مخالف بدعت تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے علماء ہیں جو بریلوی علماء کے زمرہ میں نہیں آتے، ہمارے لائق دوست مختار الدین احمد صاحب آرزو کے متعلق اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ وہ بھی علمائے اہل سنت میں ہیں، اگر ایسا ہے تو لائق مبارکباد ہیں،

جن کو بریلوی اہل سنت سمجھتے ہیں، ان کے بھی دو طبقے ہیں، ایک متین و معتدل جو اپنے عقائد و رسوم کے تو پابند ہیں، لیکن کسی کو برا بھلا نہیں کہتے، انکے

متعلقات دیوبند اور اہل حدیث سب سے ہیں، مثلاً پھلواری اور فرنگی محل کے علماء، دوسرا طبقہ اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر و تفسیق بھی ضروری سمجھتا ہے۔ یہ کتاب بھی ان پر طنز و تعریض سے خالی نہیں ہے۔ بعض باتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ مثلاً شاہ عبداللطیف ستھنی بہادر شاہ ظفر کے لڑکے تھے، ان خامیوں سے قطع نظر، کتاب اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے علماء و مشائخ اور اصحاب علم و کمال کے حالات محفوظ ہو گئے،

نقشہائے رنگ رنگ۔ از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۴۱۵، صفحات۔ کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت ساٹھ روپے۔ پتہ: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

غالب کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کا اردو کلام ہے، لیکن اس کو وہ "بے رنگ" اور اپنے کمال کا اصلی تماشاگاہ فارسی کے "نقشہائے رنگ رنگ" کو سمجھتے تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے فارسی کلام میں اہل زبان کا لطف ہے، اور وہ تخیل کی رفعت و ندرت میں اردو کلام سے بڑھا ہوا ہے، لیکن ان کے اردو کلام کے تخیل کی نزاکت بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور فارسی کے تو جاننے والے بھی اب بہت کم رہ گئے ہیں، اس لیے اردو کلام سے لطف اٹھانے والے تو بہت ہیں، لیکن فارسی کلام کے سمجھنے والے بھی مشکل سے ملیں گے، لائق مترجم نے اردو داں طبقہ کو غالب کے فارسی کلام سے مانوس کرنے کے لیے ان کی غزلوں کے منتخب اشعار اور ان کی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مقابل میں اصل فارسی اشعار بھی دیدیے ہیں، انتخاب کا معاملہ ذوقی ہے، مگر اس انتخاب

ہیں خوش ذوقی نمایاں ہے، اس ترجمہ میں مترجم کے والد ماجد مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی کا مشورہ شریک رہا ہے جو فارسی زبان کے مسلم اساتذہ میں ہیں، اس لئے ان کا نام ترجمہ کی صحت اور خوبی کی پوری ضمانت ہے، امید ہے کہ اردو کے اصحاب ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

انوار سحر ۔ از ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، صدر شعبۂ علوم مشرقی و عربی و فارسی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت مجلد للعہ۔ پتہ: (۱) ادارہ صبح ادب، گلی نظام الملک اردو بازار دہلی (۲) ادارہ صبح ادب، بی، این ورما روڈ، لکھنؤ۔

انوار سحر ڈاکٹر انوار الحسن کے کلام کا مجموعہ ہے، ان کی علمی حیثیت سے تو واقفیت تھی، لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت ہمارے لیے نیا انکشاف ہے، اور اس کمال کے ساتھ کہ ان کا کلام کہنہ مشق شعراء کے کلام کی ہمسری کرتا ہے، اس کی نمایاں خصوصیت اس کی درد مندی اور سوز و تپش ہے، جو ان کی جوانمرگ اہلیہ کی وفات کا نتیجہ ہے۔ غالباً اسی حادثہ نے ان کو شاعر بنایا ہے، اس لیے کہ پورا کلام درد و الم میں ڈوبا ہوا ہے، اور ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے، اس تاثر کے ساتھ ادبی محاسن سے بھی پوری طرح آراستہ اور درد مند اصحاب دل کے مطالعہ کے لائق ہے۔

م

مفتاح التبلیغ ۔ افادات مولانا محمد حسن خاں صاحب میواتی، ترتیب مولوی ابو عبید اللہ حکیم محمد حسن خاں صاحب میواتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے، ناشر

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶

اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے مندرجہ ذیل چھ نمبروں کی مفصل تشریح و توضیح کی گئی ہے (۱) کلمۂ طیبہ (۲) نماز (۳) علم و ذکر (۴) اکرام مسلم (۵) اخلاص نیت (۶) تفریغ وقت اور ان شش گانہ اصولوں کی اہمیت، ضرورت اور ان کے فضائل کی آیتیں اور حدیثیں جمع کر کے امت کے منصب دعوت و امامت اور دینی جد و جہد کی اہمیت بیان کی گئی ہے، اور آخر میں تبلیغی جماعت کے بعض خاص اشغال و امور نظم جماعت، تقسیم کار، ترتیب اوقات، امیر و مامور کے فرائض، سفر، گشت، مجالس، اجتماعات کے آداب اور تقریر، بیان اور تبلیغ و دعوت وغیرہ کے متعلق ضروری ہدایات تحریر کی گئی ہیں اور ان کے متعلق مولانا محمد الیاسؒ کے ارشادات و ملفوظات بھی نقل کیے گئے ہیں، [کزرعٍ اخرج شطأہ] میں شطأ کا ترجمہ بال صحیح نہیں کیا گیا ہے، صحیح ترجمہ انکھوا، پٹھا اور سوئی وغیرہ ہوگا، آیت قرآنی کے کلمہ طیبہ کا مفہوم اصطلاحی کلمہ طیبہ میں حصر کرنا اور جہاد و قتال کی آیتوں کو تبلیغی جماعت کے دوروں اور چلوں پر منطبق کرنا محل نظر ہے، آیت ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کو غلط نقل کیا گیا ہے، کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے، اور یہ نہ صرف تبلیغی جماعت کے کارکنوں بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہے۔

حیات مسلم[۱]، چاند تارے[۲] اور آسمان، اسلام کیوں[۳]۔ مرتبہ مولانا سید محمد میاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۱۱۲، ۴۸، ۳۲، قیمت عہ ۵ پ، ۵۰ پیسے، ۲۰ پیسے۔ پتے (۱) الجمعیۃ بکڈپو، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (۲) کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶

پہلے کتابچہ میں مسلمان کی پیدائش سے وفات تک کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق اسلامی ہدایات و تعلیمات بیان کی گئی ہیں، اس میں عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرت و معیشت وغیرہ کے متعلق ضروری احکام آگئے ہیں ضمناً ان رسوم اور بدعات وغیرہ کی بھی تردید کی گئی ہے، جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئی ہیں، اور جن کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، دوسرے میں خلائی پرواز کے نتیجے میں چاند، تاروں اور آسمان کے بارہ میں پیدا شدہ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، اور ان کے متعلق قدیم علمائے ہیئت و فلاسفہ اور جدید سائنسدانوں کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، تیسرے میں اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کے امن و سلامتی کے ضامن ہونے کی وضاحت کی گئی ہے، ان کتابچوں کی زبان آسان و عام فہم اور پیرایۂ بیان دلکش ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

نظام تعلیم میں حکومت جو اقدامات کر رہی ہے اس سے تعلیم کو قومیانے کا رجحان ظاہر ہو رہا ہے، اس کی زد میں اقلیتوں کے تعلیمی ادارے بھی آئیں گے، جو کسی حیثیت سے بھی ایک جمہوری اور سیکولر حکومت کے لیے زیبا نہیں ہے، تعلیم کا مقصد ذہن و دماغ کی آزادانہ تربیت اور نشو و نما ہے، قومیانے کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم حکومت کے تابع ہو جائے جو تعلیم کی آزادی کے سراسر خلاف ہے، تعلیم میں تو شخصی حکومتوں نے بھی کبھی مداخلت نہیں کی، خود اسلامی ہند میں ہندو مسلمانوں کے ہزاروں لاکھوں مدارس تھے، ان میں بہت کم ایسے تھے جو حکومت کے ماتحت رہے ہوں بیشتر مدارس علماء اور اہل خیر قائم کرتے تھے، اور وہی ان کو چلاتے تھے، زیادہ سے زیادہ حکومت بعض مدارس کی امداد کرتی تھی، مگر اس کے نظام میں اسکو دخل دینے کا حق نہ تھا، اس لحاظ سے اس دور میں تعلیم صحیح معنوں میں پبلک کے ہاتھوں میں تھی، اس آزادی کو قائم رکھنے کے لیے عربی مدارس نے نہ انگریزوں کی اجنبی ست کی امداد قبول کی اور نہ اب قومی حکومت کی، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان مدارس کے علماء ہندستان کی آزادی میں پیش پیش تھے، سارے متمدن اور جمہوری ملکوں میں تعلیم آزاد ہے، حکومتیں جن یونیورسٹیوں کی امداد بھی کرتی ہیں ان میں بھی ان کو مداخلت کا حق نہیں ہے،

تعلیم کو قومیانا سوویٹ یونین کی ایجاد ہے جس کو قوموں کی آزادی اور مساوات کا

بہت بڑا وکیل سمجھا جاتا ہو لیکن حقیقۃً وہ انتہا درجہ کا مستبد حکومت ہو جس میں جذبات و خیالات پر بھی پابندی ہے، حکومت پر کسی تنقید کو برداشت نہیں کیا جاتا، اس کی سزا قتل یا جلا وطنی ہے، وہ زبان سے تو اپنی اقلیتوں کی مذہبی آزادی اور ان کی زبان اور تہذیب کے تحفظ کی مدعی ہے لیکن عمل یہ ہے کہ سویٹ یونین کی مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کو جن کی تعداد کئی کروڑ ہے، اتنا مسخ کر دیا ہے کہ وہ صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، اور اس سرزمین میں جو صدیوں تک اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہ چکی ہے، اور جہاں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے، اسلام کا نام و نشان باقی نہیں ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روس سے جو مسلمان طلبہ ہندوستان میں حصول تعلیم کیلئے آتے ہیں، وہ روزے نماز کے نام تک سے ناواقف ہوتے ہیں، البتہ اس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے کچھ آثار قدیمہ رکھ چھوڑے ہیں جن کی ضرورت کے وقت نمائش کر دی جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس سے اسلام ختم ہو چکا ہے اور اسکے بچے کھچے آثار مٹانے کی کوشش برابر جاری ہے،

اس کے ایجنٹ بڑے فخر سے اس کا یہ کارنامہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے روس کے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی ہے، اور انکو تعلیمی تہذیبی اور اقتصادی حیثیت سے بام عروج پر پہنچا دیا ہے، اگر یہ صحیح بھی ہو تو ایسے عروج اور ترقی سے کیا فائدہ جب مسلمان، مسلمان ہی باقی نہ رہے بلکہ دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، یہ ترقی نہیں بلکہ نسل کشی ہے تعلیم کو قومیانے کی ایک دلیل یہ بھی دیجاتی ہے کہ اس کا مقصد جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا ہے، یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے، اتحاد و یکجہتی تنہا تعلیم کے ذریعہ نہیں پیدا کیجا سکتی، بلکہ بلاتفریق مذہب و ملت ملک کے تمام باشندوں کے درمیان حقوق میں عدل و مساوات اور رواداری و کشادہ دلی سے پیدا ہوتی ہو، کسی اقلیت پر اسکے ملی مزاج کے خلاف تعلیم مسلط کرنے کا الٹا اثر پڑیگا، اس سے اور زیادہ بے اعتمادی پیدا ہوگی،

جس ملک میں ایک قوم، ایک مذہب اور ایک تہذیب ہو وہاں تو قومیانے کا جواز نکل سکتا ہے، لیکن جو ملک مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہو اور دستور نے ان سب کے تحفظ کی ضمانت بھی دی ہو وہاں تعلیم کو قومیانا دستوری تحفظ کے سراسر خلاف ہے، یہ مسئلہ اس پہلو سے بھی قابل غور ہے کہ جن ملکوں میں ڈکٹیٹرشپ ہے، یا جہاں ہمیشہ ایک ہی پارٹی کی حکومت کا قانون ہو وہاں تو قومیانا شاید مفید ہو لیکن ایک جمہوری ملک میں جہاں برابر حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، بلکہ ایک ہی وقت میں مختلف ریاستوں میں مختلف پارٹیوں کی حکومت ہو سکتی ہے، تعلیم کو قومیانا خود تعلیم کیلئے مضر ہے، اگر ہر برسر اقتدار حکومت اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تعلیم کو قومیاتی رہے تو اس کا سارا نظام چوپٹ ہو کر رہ جائے گا، اسلئے تعلیم کو خاص طور سے اقلیت کے تعلیمی اداروں کو قومیانا دستوری، جمہوری، اور تعلیمی کسی حیثیت سے بھی مناسب نہیں، تعلیم پر حکومت کی نگرانی صرف اسی حد تک ہونی چاہیے کہ اس میں کوئی چیز ملکی مفاد کے خلاف نہ ہو،

لیکن حکومت اور ملک کا مفاد دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہندوستان میں اس فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے اقلیتوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہاں ملکی مفاد نام ہے اکثریت کے جذبات و خواہشات کا، خواہ وہ ملکی مفاد کے کتنے ہی خلاف ہوں، چنانچہ ایک ہی چیز جو اکثریت کے لئے قومیت اور وطنیت کی نشانی سمجھی جاتی ہے، اقلیت کے لیے فرقہ واریت بنجاتی ہے، اکثریت حکومت پر سخت سے سخت تنقید اور اس کی پالیسی کی مخالفت کرے تو اس سے اسکی قومیت اور وطن دوستی میں کوئی فرق نہیں آتا، لیکن اگر اقلیت کسی معاملہ میں ملک کی خیر خواہی میں کوئی ایسا خیال ظاہر کرے جو حکومت کی پالیسی یا اکثریت کے جذبات کے خلاف ہو تو فرقہ پروری اور ملک کے ساتھ غداری ہے، بلکہ اپنے حقوق کا مطالبہ بھی علٰحدگی پسندی شمار کیا جاتا ہے، یہ روزانہ کے مشاہدات ہیں، جس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں،

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

سیاسی نظام

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۷)

جمہوریت حکومت کی ترقی یافتہ شکل ہے

مغربی تہذیب نے سیاسی نظام میں کافی پیشرفت کر لی ہے، جمہوریت اس کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے، جس تک کافی تجربہ کے بعد پہنچا گیا، اور جس سے بہتر نظام کا تصور سردست ناممکن ہے، لیکن اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی نہ اس کی واضح تعریف ہو سکی اور نہ اس کو ٹھیک طرح عملی جامہ پہنایا جا سکا، چنانچہ ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس نے جو تحقیقاتی کمیٹی جمہوریت پر ریسرچ کیلئے قائم کی تھی، اس نے درج ذیل بنیادی سوال کیے تھے،

جمہوریت سے متعلق دو بنیادی سوال اور ان کے جواب

(۱) جمہوریت کا مفہوم کیا ہے،

(۲) اکثریت کا فیصلہ کیا ہمیشہ درست ہوتا ہے ؟

پہلے سوال کے جواب میں اکثر لوگوں نے اعتراف کیا کہ جمہوریت ایک مبہم لفظ ہے، جسکا مفہوم اب تک متعین نہیں ہو سکا، اور دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ اکثریت کے

یہ کو غلطی سے پاک سمجھنا خود زبردست غلطی ہے، کیونکہ انسان خواہ فرد ہو یا جماعت بہرحال ن ہے، وہ ان کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتا جو نوع انسانی کا خاصہ ہیں،[1]

زیں جن کی ہر دور کی حکومت میں یکساں ت رہتی ہے، اور جن میں عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی نہیں ہے

حکومت کی شکل و صورت کا تعلق چونکہ شعور کی بیداری اور حالات کی تبدیلی سے ہے، جس میں عقل و تجربہ کی رہنمائی سے بڑی حد تک کام چلتا رہتا ہے، اس بنا پر ل جدید میں شکل و صورت سے نہیں بحث کی گئی، بلکہ ان بنیادی چیزوں سے بحث ئی ہے، جن میں عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی نہیں ہے، اور جن کی ہر دور کی حکومت میں ل ضرورت رہتی ہے، مثلاً

(۱) اقتدار اعلیٰ کا تصور (۲) حکومت کی نوعیت (۳) خیر و شر کا معیار (۴) جمالیاتی قدریں (۵) قانون سازی کا حق (۶) حقوق و فرائض کی تعیین وغیرہ۔

لی کا نظریۂ سیاست

مغرب کی سیاست میں ایسی بلند و برتر ہستی کا تصور مفقود ہے جہت سے کامل اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ہو، اس بنا پر چار و ناچار مذکورہ ں میں انسان کو رہنما تسلیم کیا گیا ہے، اور انسان نے اس سلسلہ میں جو کارہائے ل انجام دیے ہیں، ان کا اندازہ میکاولی (Maciavelli) کے درج ذیل ے سے ہوتا ہے جس پر مغرب کا سیاسی نظام قائم ہے منغلی کہتے ہیں :-

"میکاولی کے نزدیک قومی مملکت ہی کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی اور انسان کی اصلی غرض و غایت ہے، وہ نفس قوت کی خاطر ترقی قوت کا پرستار ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ قوت کس سمت میں کام کرے گی، اس کی نظر میں سلطنت نہ اخلاقی ہے

---

[1] Democracy in a world of Tension. P.504

اور نہ قانونی بلکہ وہ محض سیاسی ہے، اور اسی معیار سے سلطنت کے تمام کاموں کا جائزہ لینا چاہیے، اس سلسلہ میں مذہب، اخلاق اور قانون کو خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے؛[1]

دوسری جگہ اس کی رائے منقول ہے:۔

سلطنت کے قیام و بقا کے لیے "رئیس" کو اکثر اوقات معاہدوں، نیک نیتی، انسانیت اور مذہب کے خلاف عمل کرنا چاہئے،[2]

ایک اور جگہ ہے:۔

جب ملک کی ہستی معرض خطرہ میں ہو تو انصاف اور ناانصافی رحم اور ظلم قابل ستائش اور شرمناک فعل کسی کا اطلاق نہیں ہوتا اور ان میں سے کسی کو راہ عمل میں حائل نہ ہونا چاہیے، تمام مواقع کو برطرف کرکے وہی راہ اختیار کرنی چاہیے جس سے ملک کا وجود اور اس کی آزادی قائم رہے، جو شخص اخلاق کے عام تصورات سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا اس کے لیے انفرادی زندگی ہی درست ہے، اسے حکمرانی کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔"[3]

انسان کی فطری کمزوریاں | تشکیل جدید میں انسان کی درج ذیل فطری کمزوریوں کا ذکر ہے، جو سب کے نزدیک مسلم اور سب کے تجربہ میں ہیں،

(۱) وہ دل کا کچا ہے

ان الانسان خلق ھلوعا (المعارج) بیشک انسان کچے دل کا پیدا کیا گیا ہے،

---

[1] نظریۂ سلطنت، ملیحلی ص ۲۰۰، ۲۰۲ [2] تاریخ یورپ ص ۱۸۴ [3] تاریخ فلسفۂ جدید ۱ ص ۲۶۔

وہ کمزور ہے:

وخلق الانسان ضعیفا (النساء) — انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

وہ جلد باز ہے:

وکان الانسان عجولا (بنی اسرائیل) — انسان جلد باز ہے۔

وہ بے صبرا ہے:

اذا مسه الشر جزوعا (المعارج) — جب اس کو برائی (تنگی) پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔

وہ بے توفیقا ہے:

اذا مسه الخیر منوعاً (ایضاً) — جب اس کو بھلائی (فراخی) پہنچتی ہے تو بے توفیقا ہو جاتا ہے

وہ جھگڑالو ہے:-

وکان الانسان اکثر شئ جدلا (الکہف) — انسان بہت زیادہ جھگڑالو ہے

وہ مال و دولت کی محبت میں سخت ہے،

وتحبون المال حبا جما (الفجر-۱) — تم مال سے جی بھر کر محبت کرتے ہو

آل و اولاد میں اس کے لیے آزمائش ہے:

انما اموالکم واولادکم فتنة (التغابن-۱) — بیشک تمھارے مال اور اولاد تمھارے لیے فتنہ ہیں۔

عورت اس کا سب سے کمزور پہلو ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما رأیت من ناقصات عقل — کسی زیرک مرد کی عقل سلب کرنے والا

ودین اذھب للب	تم عورتوں سے زیادہ کسی کو میں نے
الرجل الحازم من احداٰیھن	نہیں دیکھا۔

ظاہر ہے کہ ان فطری کمزوریوں کے ہوتے ہوئے مذکورہ چیزوں میں انسان کی رہنمائی قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر تشکیل میں اللہ کی رہنمائی قبول کی گئی ہے، جو ہر حیثیت سے کامل اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ہے،

ذیل میں ہر ایک کی کسی قدر تفصیل دیجاتی ہے:

(۱) اقتدار اعلیٰ کا تصور۔ | اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ ہے

مغرب میں اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) عوام کے سپرد ہے، اس کا اثر زندگی اور اجتماع پر جو مرتب ہوتا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے تشکیل میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، جس کے سامنے جواب دہی کا تصور گوشۂ تنہائی میں بھی انسان کو ہر قسم کی زیادتی وحق تلفی سے باز رکھتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وھو الذی فی السماء الٰہ	اللہ ہی آسمان میں معبود ہے اور
وفی الارض الٰہ وھو الحکیم	اور زمین میں معبود ہے، وہ حکمت
العلیم (الدخان - ۷)	والا اور علم والا ہے۔
اللّٰھمّ مالک الملک تؤتی	اے اللہ سلطنت کے مالک آپ جس کو
الملک من تشاء وتنزع الملک	چاہیں سلطنت دیں اور جس سے چاہیں
ممن تشاء (آل عمران - ۳)	لے لیں۔
وھو القاھر فوق عبادہ	اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر وہ بڑی حکمت والا
وھو الحکیم الخبیر (الانعام - ۲)	اور خبر رکھنے والا ہے،

واللہ غالب علی امرہ ولکن	اور اللہ اپنے حکم پر غالب ہے لیکن
اکثر الناس لا یعلمون (یوسف)	اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں ،
الا لہ الخلق والامر تبارک	یاد رکھو اللہ ہی کا کام پیدا کرنا اور حکم کرنا ہے
اللہ رب العلمین (الاعراف - ۷)	اللہ بڑی برکت والا سارے جہان کا
	پروردگار ہے ۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے جیل کے قیدیوں کے سامنے ہر اقتدار کی نفی کرتے ہوئے صرف اللہ کے اقتدار کی دعوت ان الفاظ میں پیش کی تھی ،

یٰصاحبی السجن ءارباب	اے میرے قید کے ساتھیو! ذرا غور تو
متفرقون خیر ام اللہ الواحد	کرو، متفرق معبود بہتر ہیں یا صرف اللہ
القہار	بہتر ہے جو اکیلا اور زبردست ہے ،

(۲) حکومت کی نوعیت

اللہ کا اقتدار تسلیم کرنے کے بعد حکومت میں بنیادی تبدیلیاں	اللہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کے بعد حکومت کی نوعیت میں درج ذیل قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں ،

(۱) اصل حکومت اللہ کی ہوتی ہے اور انسان بحیثیت نائب و امین حکومت کا حقدار رہتا ہے ، قرآن حکیم میں ہے :

یا داؤد انا جعلنک خلیفۃ	اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں نائب بنایا
فی الارض فاحکم بین الناس	تم لوگوں کے درمیان انصاف سے حکم دو
بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن	اور خواہشات کی پیروی نہ کرو ورنہ لوگ
سبیل اللہ (ص - ۲)	تمھیں گمراہ کر دیں گے ۔

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین	خرچ کرو اس میں سے جن میں اللہ نے
فیه (الحدید - ۱)	تمھیں خلیفہ بنایا ہے،
ان اللہ یامرکم ان تؤدوا	بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے
الامانات الیٰ اھلھا واذا	کہ امانتوں کو اس کے اہل تک پہنچاؤ
حکمتم بین الناس ان	اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو
تحکموا بالعدل (نسأ - ۸)	تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں :۔

آیت کریمہ میں حاکموں کو خطاب ہے کہ وہ رعایا کا مکمل بند و بست کریں، دین و شریعت کے مقتضیات کا ان کو پابند بنائیں " امانت" کی ادائیگی میں یہ بھی داخل ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیئے جائیں۔ (الجوامع فی السیاست الالہیہ ابن تیمیہ ص)

(ب) اللہ کے حکم کے مطابق حکومت شورائی طرز کی ہوتی ہے، جس کی شکل و صورت حالات اور شعور کی بیداری کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے،

قرآن حکیم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے،

وشاورھم فی الامر (آل عمران) معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیا کرو

دوسری جگہ ہے :

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ۴) ان کے معاملات میں باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں

(ج) حکومت کے ہر قاعدہ و قانون میں اللہ کی حکمت عملی منعکس ہوتی ہے، یعنی باران رحمت کی طرح تنظیم و تقسیم کے قوانین اور ذرائع و مواقع سب کے لیے عام ہوتے ہیں،

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان — بیشک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے،

یہ آیت زندگی کے تمام گوشوں کی جامع ہے، کتبِ فقہ میں ہے:

اجمع آیۃ فی القرآن للحث علی المصالح کلھا والزجر عن المفاسد باسرھا — یہ آیت تمام مصالح کے حصول پر ابھارنے اور مفاسد پر تنبیہ کے لیے سب سے زیادہ جامع ہے،

(د) حکومت کے ہر بندوبست میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور ابھرتا ہے، جس سے ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جاتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا — بیشک کان، آنکھ اور دل ان سب کی اس سے بازپرس ہوگی،

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ — جس شخص نے ذرہ برابر بھلائی کی اسکو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی وہ اس کو دیکھے گا۔

(ر) حکومت کا مقصد اقدارِ حیات کی حفاظت، برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا فروغ ہے،

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا — یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو ہم زمین میں حکومت دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں

عن المنکر (الحج - ۶)

(۳) حکومت، قومیت و وطنیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر انسانیت و بین الاقوامیت کے وسیع دائرہ میں داخل ہو جاتی اور ہر شے میں عالمگیریت پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کی نسبت سے جو چیزیں بھی بیان کی گئی ہیں وہ ہر قسم کی اضافتوں اور حد بندیوں سے بلند ہیں،

(۴) خیر و شر کا معیار۔

خیر و شر کا معاملہ حد درجہ نازک ہے

خیر و شر کا معاملہ حد درجہ نازک ہے، اگر یہ کام انسانوں کے سپرد کر دیا جاتا تو ہوس کی نیرنگیاں خیر کو شر اور شر کو خیر میں تبدیل کرتی اور عقل کی جولانیاں اس تبدیلی کے لیے سند جواز مہیا کرتی رہتیں، چنانچہ مغربی تہذیب میں انفرادی یا اجتماعی پسند و ناپسند پر خیر و شر کا مدار ہے، پسند و ناپسند میں چونکہ برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس بنا پر ہر صبح کا خیر شام کے شر میں اور شام کا شر صبح کے خیر میں تبدیل ہوتا رہتا ہے،

تشکیل میں معیار اللہ کی کتاب ہے

تشکیل جدید میں خیر و شر کا معیار اللہ کی کتاب ہے، جو ناطق بالحق ہے اور جس کا فیصلہ آخری ہے، اس میں تبدیلی کی کسی زمانہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے،

قرآن حکیم میں ہے:

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبٰت ویحرم علیھم الخبٰئث (اعراف - ۱۹)

اللہ کا رسول لوگوں کو معروف (خیر) کا حکم دیتا ہے، اور منکر (شر) سے منع کرتا ہے اور، پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

وتمت کلمۃ ربک صدقا
وعدلا لا مبدل لکلمتہ
وھو السمیع العلیم وان تطع
اکثر من فی الارض یضلوک
عن سبیل اللہ ان یتبعون
الا الظن وان ھم الا
یخرصون
(الانعام ۔ ۱۴)

آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی باتیں پوری ہوگئیں ان میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں ہے، اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اگر آپ ان لوگوں کا کہنا مانیں گے جو روئے زمین میں اکثریت میں ہیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، وہ محض اپنے گمان کی پیروی کرتے اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے،

ھو الفصل لیس بالھزل ....
ھو الذی لا یزیغ بہ الاھواء
(مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن)

وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے، وہ مذاق نہیں ہے، خواہشات اس میں کجی نہیں پیدا کرسکتی ہیں،

اقدار کی تین قسمیں

اقدار کی تین قسمیں ہیں :-

(ا) روحانی (ب) اخلاقی اور (ج) جمالیاتی

(۳) جمالیاتی قدریں: زندگی اور اجتماع کے لیے جس طرح روحانی اور اخلاقی قدروں کی ضرورت ہے، اسی طرح جمالیاتی قدروں کی بھی ضرورت ہے، جمالیاتی میں حسن وجمال، لطف وکمال، توازن و اعتدال اور تناسب وہم آہنگی وغیرہ شامل ہیں،

مغرب میں قدروں کے درمیان موافقت نہیں ہے

مغربی تہذیب میں ان قدروں کے درمیان کوئی موافقت نہیں، بلکہ تضاد ہے، چنانچہ جمالیاتی ذوق کے اظہار کیلئے فنون لطیفہ اور آرٹ کے ذیل میں جو شکلیں اور صورتیں تجویز ہوتی ہیں اُن میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ "اخلاق" کا سایہ بھی ان پر نہ پڑنے پائے، اور روحانیت کا درجہ تو اس کے بعد کا ہے ایسی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں فنون لطیفہ اور آرٹ کے نام سے فحشیات اور بیحیائی کی ساری شکلیں رائج ہیں، پروفیسر P.A. Sorokin (پی اے، سارو کن) جدید آرٹ کے بارے میں لکھتے ہیں،

اس نے تقریباً تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دیا ہے، کیونکہ یہ دلچسپی اور تفریح کا ایسا سامان شاذونادر ہی فراہم کر سکتے، جیسا شراب اور عورت کر سکتی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ "آرٹ" اخلاق سے عاری، غیر مذہبی اور غیر اجتماعی ہو گیا ہے، اور بسا اوقات مذہبیت، اخلاق اور اجتماعیت کا دشمن بنکر نمودار ہوتا ہے۔[۱]

فنون لطیفہ کے بارے میں کہتا ہے :۔

آج ۷۰ تا ۸۰ فی صدی فلموں کی توجہ کا مرکز جنسی محبت یا جرائم ہیں، مجسمہ سازی اور تصویر میں بھی ان ہی کا غلبہ ہے، فنون لطیفہ خاکے اڑانے اور طنز و استہزا میں خاص طور پر مشغول ہیں، خدا سے لیکر شیطان تک ہر ایک کی تحقیر اور انکا مذاق اڑانا ان کا معمول ہے۔[۲]

تشکیل میں جمالیاتی سرچشمہ اللہ کی صفات ہیں اور اقدار کے درمیان باہمی توافق

تشکیل جدید میں دوسری اقدار کی طرح جمالیاتی اقدار کا سرچشمہ بھی اللہ کی صفات ہیں (تفصیل اوپر گذر چکی)

---

[۱] Crisis of our Age ص ۷۴-۷۵ [۲] ایضاً

جن میں باہم تضاد نہیں بلکہ توافق ہے، یعنی تینوں کو تناسب و اعتدال کے ساتھ مقررہ حد کے اندر نشو و نما کا موقع ملتا ہے،

چند آیتیں اور حدیثیں | قرآن حکیم میں جمالیاتی اقدار کا ذکر ان آیتوں میں ہے:-

وصورکم فاحسن صورکم	اس نے تمھاری صورت بنائی اور
(المومن - ۶)	اچھی صورت بنائی،
لقد خلقنا الانسان فی احسن	ہم نے انسان کو خوب سے خوب
تقویم (التین - ۱)	انداز پر پیدا کیا،
الذی خلقک فسوّٰک	وہ ذات جس نے تجھ (انسان) کو پیدا
فعدلک (الانفطار - ۱)	کیا، درست کیا، توازن دیا۔
انا زینا السمآء الدنیا	ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت
بزینة ن الکواکب (الصّٰفّٰت - ۱)	کے ساتھ مزین کیا،
انا جعلنا ما علی الارض	جو کچھ روئے زمین پر ہے ہم نے اسکی
زینة لها (الکهف - ۱)	زینت بنا دیا،
الذی احسن کل شیٔ (السجدہ)	جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی،
ولکم فیها جمال حین تریحون	اور تمھارے لیے جانوروں میں ایک حسین
وحین تسرحون (النحل - ۱)	منظر ہے، جب تم انھیں شام کو چرا کر لاتے ہو
	اور جب چرانے لے جاتے ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ جمیل یحب الجمال	بیشک اللہ۔۔۔۔ جمیل ہے اور

(مسلم کتاب الایمان باب تحریم الکبر) جمال کو وہ پسند کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

ان اللہ طیب یحب الطیب نظیف — بیشک اللہ پاکیزہ ہے، وہ پاکیزگی
یحب النظافۃ (ترمذی ابواب — کو پسند کرتا صاف ستھرا ہے، صفائی و
الادب باب ما جاء فی النظافۃ) — ستھرائی کو پسند کرتا ہے،

ایک اور جگہ ہے:

حبب الی من الدنیا النساء — دنیا سے مجھے عورتیں اور خوشبو زیادہ
والطیب (النسائی کتاب عشرۃ النساء) — مرغوب ہیں،

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے جمالیاتی قدروں کا ثبوت ملتا ہے،

(۵) قانون سازی کا حق۔

قانون سازی کا حق اللہ کو حاصل ہے

قانون سازی کے لیے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے،

(الف) باریک بینی و ہمہ جہتی نگاہ

(ب) عظمت و تقدس کا تحفظ

اگر یہ دونوں نہ ہوں تو کوئی قانون نہ انسانی مفاد کی حفاظت کر سکتا ہے، اور نہ سرکش گردن اس کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہوتی ہے، مغربی تہذیب میں قانون سازی انسان کے سپرد ہے، جو ہزار ترقی کے باوجود یہ دونوں باتیں اپنے اندر نہ پیدا کر سکا تشکیل جدید میں قانون سازی کا حق اصلاً اللہ کو ہے، جس کا قانون اس کی ہمہ جہتی نگاہ کی وجہ سے ایک طرف انسان کے مادی و روحانی مفاد کا ضامن ہے اور

دوسری اس کی عظمت و تقدس کے آگے گردنیں جھکنے پر مجبور ہوتی ہیں ۔ قرآن حکیم میں ہے،

ان الحکم الا للّٰہ (یوسف-۱۰)	حکم صرف اللہ کا ہے
ولا یشرک فی حکمه احدًا (الکھف-۳)	اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا،
اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم	اس کا اتباع کرو جو تمھارے پاس تمھارے
ولا تتبعوا من دونه اولیاء	رب کی طرف سے اتارا گیا، اسکے علاوہ
(الاعراف - ۱)	اور دوستوں کا اتباع نہ کرو
افغیر اللّٰہ ابتغی حکما وھو	کیا اللہ کے علاوہ کوئی فیصلہ کرنے والا
الذی انزل الیکم الکتٰب	تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمھاری طرف
مفصلا (الانعام - ۱۴)	مفصل کتاب اتار دی ۔

قانون کی دو قسمیں ہیں | قانون کی دو قسمیں کی جاتی ہیں :-

(۱) اصلی اور (۲) ذیلی ۔

" اصلی وہ ہیں جو اللہ کی طرف سے مستقلاً عمل کے لیے مقرر ہوتے ہیں ، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی ، البتہ حالات کے لحاظ سے وقتِ ضرورت ان کے موقع و محل کی تعیین ہوتی ہے ۔

" ذیلی " وہ ہیں جو قوت نافذہ کی طرف سے " اصلی " پر عمل در آمد کے لیے وقتاً فوقتاً مقرر کیے جاتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ۔

" ذیلی " قانون کی ضرورت دو وجوں سے ہوتی ہے ،

(۱) جب معاشرتی فساد کی وجہ سے اصلی قانون پر عمل دشوار ہو جاتا ہے ،

(۲) اصلی قانون پر عمل در آمد کے لیے معاشرہ کی جس قدر بلند سطح درکار ہے،

وہ موجود نہیں ہوتی ۔

اصول نسخ سے مدد | وضع قانون ہو یا موقع ومحل کی تعیین دونوں میں اصول نسخ سے مدد لی جاتی ہے، یعنی اس کے ذریعہ قوت نافذہ کو قانون کے نفاذ میں حالات کے لحاظ سے وہ اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں جس کے ذریعہ دونوں کام بخوبی انجام پاسکتے ہیں، وہ اختیارات یہ ہیں :۔

(۱) قانون کے نفاذ کو متقدم یا موخر کرنا (۲) اگر قانون میں عمومیت ہے تو اس میں خصوصیت پیدا کرنا (۳) اگر مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا (۴) قانون کی وسعت کو محدود کرنا (۵) قانون سے بعض صورتوں کو مستثنیٰ کرنا (۶) قانون کے نفاذ میں کسی شرط کا اضافہ کرنا (۷) قانون کے نفاذ میں کسی صفت کا اضافہ کرنا۔

متقدمین کے نزدیک "نسخ" کے مفہوم سے ان اختیارات کا ثبوت ملتا ہے،

رفع دلالۃ العام والمطلق	نسخ کبھی عام، مطلق اور ظاہر لفظ وغیرہ
والظاہر وغیرہا تارۃ اما	کی دلالت دکھا دینے کو کہتے ہیں، یعنی
بتخصیص او تقیید او حمل	عام میں تخصیص اور مطلق میں تقیید کیجاتی ہے
مطلق علی مقید و تفسیرہ	یا مطلق کو مقید پر حمل کرکے اسکی تفسیر و توضیح کیجاتی
وتبیینہ حتی انہم لیسمون	ہے، یہانتک کہ استثناء شرط اور صفت کو بھی
الاستثناء والشرط والصفۃ	نسخ کہا جاتا ہے، کیونکہ انکے ذریعہ بھی ظاہر کی
نسخاً لتضمن ذلک رفع	دلالت اٹھا دیجاتی ہے، اور مراد کو بیان کیا
دلالۃ الظاہر وبیان المراد	جاتا ہے، سلف کی زبان میں نسخ مراد کے
فالنسخ عندھم وفی لسانھم	بیان کا نام ہے، یہ بیان اس لفظ

ھو بیان المراد بغیر ذلک	کے طور سے بلکہ کسی امر خارج سے
بل بامرٍ خارج عنه[۱]	بھی ہوتا ہے ۔

دوسری جگہ ہے :-

ھو رفع الظاھر لتخصیص	کسی تخصیص تقیید شرط یا مانع کی وجہ سے
او تقیید او شرط او مانع	ظاہری محل کو نظرانداز کرنا عمومی
فھذا اکثر من السلف یسمیه نسخا[۲]	طور پر سلف اسی کا نام نسخ رکھتے تھے ۔

مذکورہ اختیارات ہی کی بدولت حضرت عمرؓ نے بحیثیت قوت نافذہ بہت سے اصلی قانون کے موقع و محل متعین کیے تھے، اور بہت سے نئے قوانین وضع کیے تھے جیسا کہ ان کی فقہ سے ظاہر ہے ،

اجتہاد کی جامع اصطلاح ذیلی قانون وضع کرنے یا اصلی کا موقع و محل متعین کرنے کا حق ہر دور میں قوت نافذہ یا اس کے قائمقام جماعت (علماء) کو حاصل رہا ہے ۔ جس سے اصلی قانون ایک طرف جمود و تعطل سے محفوظ رہتا ہے ۔ اور دوسری طرف زندگی و قانون کے درمیان ربط باقی رہتا ہے، مگر اس حق کو آزادانہ استعمال کرنے کی گنجایش نہیں ہے ، اس کے لیے "اجتہاد" کی جامع اصطلاح موجود ہے، اسی کے دائرہ میں اس کو استعمال کی اجازت ہے، "اجتہاد" دراصل قانون کو ترقی پذیر زندگی سے ہم آہنگ بنانے کے لیے انتہائی کوشش کا نام ہے ! اس شرط کے ساتھ کہ اخلاق و قانون میں ربط باقی رہے ۔ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے راقم کی کتاب "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" اور "مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر" دیکھنا چاہیے ،

[۱و۲] اعلام الموقعین فصل المراد بالنسخ عند عامة السلف

شہریت کے حقوق و فرائض

(۴) شہریت کے حقوق و فرائض متعین کرنے کا مسئلہ کچھ کم اہم نہیں ہے، مغرب کے نزدیک چونکہ اقدار حیات اضافی ہیں، اور ان کا سرچشمہ اور ان کے خوب و ناخوب کا معیار سوسائٹی ہے، اس بنا پر حقوق و فرائض کی تعین کے لیے مستقل و متعین بنیادیں نہ فراہم ہو سکیں، تشکیل جدید میں حقوق و فرائض کی بنیاد اخلاقی قدریں ہیں، جو مستقل اور دائمی ہیں، اس لیے ان کے لحاظ سے ہر شہری کو بلا تفریق مذہب و ملت درج ذیل قسم کے حقوق حاصل ہیں۔

ہر انسان واجب الاحترام ہے

(۱) ہر انسان بحیثیت انسان کے لائق احترام ہے، اس میں رنگ، نسل، زبان، مذہب، حسب و نسب، عزت و امارت، پیشہ اور ذات وغیرہ کی بنا پر کوئی تمیز و تفریق نہیں ہے، حکومت کا فرض ہے کہ مختلف تدبیروں سے مذکورہ اضافتوں کی بنا پر تفریق و تمیز کی ذہنیت کو ختم کر دے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

ولقد کرمنا بنی آدم (بنی اسرائیل)	ہم نے انسان کو معزز بنایا،
ولکل درجات مما عملوا (الانعام)	ہر ایک کے درجے ان کے عمل کے لحاظ سے ہیں،
ان اکرمکم عند اللہ	اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز
اتقٰکم (حجرات - ۲)	وہ ہے جو زیادہ متقی ہے

ہر ایک کو جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے

(۲) ہر شخص کا حق ہے کہ اس کے جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے۔

انسانی حرمت کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں اس کے بارہ میں یہ تاکید فرمائی:۔

فان دماءکم واموالکم	آج کے محترم دن (یوم عرفہ) کی طرح
واعراضکم حرام کحرمۃ	تمہاری جان و مال اور آبرو ایک
یومکم ھذا (مشکوٰۃ باب حجۃ الوداع)	دوسرے کے لیے محترم ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا :۔

اموالھم کاموالنا ودمائھم	ان کے (غیر مسلموں) مال مثل ہمارے مال کے
کدمائنا (نصب الرایہ ج ۳ کتاب السیر)	ہیں اور انکی جانیں مثل ہماری جانوں کے ہیں۔

عدل واحسان کے قوانین سب کے لیے عام ہیں

(۳) عدل و احسان کے قوانین سے سب کو یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے، حتی کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم ہے،

ولا یجرمنکم شنأن قوم علی	کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر
ان لا تعدلوا اعدلوا ھو	آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے عدل نہ کرو
اقرب للتقوی (المائدہ - ۲)	ہر حال میں عدل کرو، یہ روش تقوی سے زیادہ قریب ہے۔

سب کو یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے

(۴) کائنات کی تمام چیزوں سے سب یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کے مستحق ہیں۔

ھوالذی خلق لکم ما فی	اللہ ہی ہے جس نے تم سب کے لیے زمین
الارض جمیعا (بقرہ - ۳)	کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔

دوسری جگہ ہے

وجعلنا لکم فیھا معائش	تم سب کے لیے ہم نے زمین میں زندگی

ومن لستم لھم برازقین — کے ساز و سامان (وسائل و ذرائع) بنائے اور ان کے لیے بھی جن کو تم رزق نہیں دیتے ہو۔

(الحجر۔ ۳)

حکومت میں ہرایک کو شرکت کا حق ہے

(۴) حکومت میں (بشرط صلاحیت) ہر ایک کو شرکت کا حق ہے، شورائی طرز حکومت میں اور باتوں کی طرح اس کا لحاظ بھی ضروری ہے، شوریٰ کی آیتیں اوپر گذر چکی ہیں،

حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ و بصرہ و شام کو لکھا کہ اپنے میں سے بہتر اور صاحب صلاحیت افراد کو منتخب کرکے بھیجو تاکہ انکو حکومت میں شریک کیا جائے۔[1]

اسی طرح مختلف ممالک فتح ہونے کے بعد اکثر سابق غیر مسلم افسران کو بحال رکھا گیا جن کے بارے میں علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں کہ حکومت کا مزاج بدلنے کے بعد ان سب نے ظلم و ستم کی راہیں چھوڑ دی تھیں،

فکانت جبایتھم بالتعدیل — ان افسران کی وصول تحصیل عدل و انصاف کے ساتھ ہوگئی تھی۔

(کتاب الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۱۲۰)

ہر شخص کو مذہب و عقیدہ کی آزادی کا حق ہے

(۵) ہر شخص کو عقیدہ، مذہب اور مسلک میں آزادی کا حق ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:-

لا اکراہ فی الدین — دین کے معاملہ میں کوئی جبر و زبردستی نہیں ہے۔

(البقرہ ۔ ۳۵)

آزادی کی مختلف شکلیں

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مذاہب کے

[1] کتاب الاموال باب فی تقبیل السواد و اختیار الولاۃ ص ۲۹۴

ماننے والوں کو آپس میں بھائی اور امتِ واحدہ قرار دیا:

الناس کلھم اخوۃ (مسلم وابوداؤد) سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

انھم امۃ واحدۃ (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ والاموال لابی عبید ص ۲۰۴ و ۲۰۵) وہ سب ایک امت ہیں۔

ہر مذہب کے عبادت خانوں، عبادت کے طریقوں اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت کی گئی، چنانچہ یہ حکم تھا:

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ	یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادتخانے
ولا یمنعون من ضرب النواقیس	نہ گرائے جائیں، یہ لوگ ناقوس بجانے
ولا من اخراج الصلبان فی	اور اپنی عید کے دن صلیب نکالنے
یوم عیدھم (کتاب الخراج ص ۲)	سے نہ روکے جائیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ	یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادتخانے
وعلی ان یضربوا النواقیسھم فی	نہ گرائے جائیں، یہ لوگ رات اور دن
ای ساعۃ شاؤا من اللیل	میں جب چاہیں ناقوس بجائیں، البتہ نماز
او نھار الا فی اوقات الصلوٰۃ	کے اوقات مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ لوگ اپنی عید
وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام	کے دن صلیب نکالیں۔
عیدھم۔ (ایضاً)	

ہر ایک کو عبادت کے علاوہ اور دوسرے مذہبی امور کی ادائیگی کی پوری آزادی

دی گئی، ابو عبید کئی مفتوحہ ملکوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں:

فھذہ بلاد العنوۃ واقر	یہ تمام ممالک غلبہ سے فتح کیے گئے تھے
اھلھا فیھا علی مللھم	اور ان کے باشندے اپنے اپنے مذہب
وشرائعھم (کتاب الاموال ص ۱۰۱)	اور شریعتوں پر باقی رکھے گئے تھے،

ہر ایک کے پرسنل لا اور کلچر کے حفاظت کی ضمانت دی گئی، جیسا کہ تشریح ہے۔

فھم احرار فی شھاداتھم	یہ لوگ اپنی شہادت کے احکام،
ومناکحاتھم ومواریثھم	نکاح کے معاملات، وراثت کے
وجمیع احکامھم	قوانین اور دوسرے تمام پرسنل معاملات
(ایضاً ص ۱۴۰)	میں آزاد ہیں۔

ہر ایک کو مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی، جیسا کہ اس حکم سے ظاہر ہے:

ولا یحال بینھم وبین	ان کے اور ان کی شریعتوں کے
شرائعھم[1]	درمیان حائل نہ بنا جائے۔

دوسری جگہ ہے:

ولا یکرھون علی دینھم[2]	انکے دین میں کسی قسم کی زبردستی نہ کیجائے۔

حکومت وعوام دونوں سے متعلق حقوق و فرائض ہیں	جس طرح ہر شہری کو مذکورہ قسم کے حقوق حاصل ہیں، اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ امور خیر میں حکومت

کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون و خیر خواہی کریں،

اسی طرح حکومت کا فرض ہے کہ ہر شہری کے حقوق ادا کرنے میں پوری کوشش

[1] طبری جزو رابع ذکر الخبر عن وقعۃ المسلمین والفرس بنہاوند [2] طبری فتح بیت القدس

کرے، غفلت و مداہنت سے کام نہ لے، اور ان کے آرام کی خاطر خود تکلیف اٹھائے،

غرض اس تشکیل میں دونوں طرف سے حقوق و فرائض کی تعیین کر دی گئی ہے، اگر ٹھیک ٹھیک ان پر عمل درآمد کیا جائے تو حکومت اور عوام کے مسائل بڑی آسانی کیساتھ حل ہوتے رہیں، اور موجودہ خلفشار کی نوبت نہ آئے۔

عہد ہشام کا معاشی جائزہ

از جناب ڈاکٹر عبد الباری صاحب ایم، اے۔ بی، ایل۔ پی، ایچ، ڈی
لکچرر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہشام بن عبد الملک (۱۰۵-۱۲۵ھ) جو خاندان بنو امیہ کا دسواں خلیفہ تھا، اپنے دور کے لائق ترین مسلم حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے، اموی سلطنت کی پرشکوہ عمارت کے تین مستحکم ستونوں میں سے ایک ہشام بھی ہے، دوسرے دو اشخاص حضرت امیر معاویہؓ بن سفیان (متوفی ۶۰ھ) اور عبد الملک بن مروان (م ۸۶ھ) ہیں[1]، خلیفہ منصور (م ۱۵۸ھ) جیسا حکمراں بھی جو بنو امیہ کا سخت ترین مخالف تھا، ہشام کی ان الفاظ میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا:-

"ہشام خاندان بنو امیہ کے بہترین لوگوں میں سے ایک تھا"[2]

ہشام نے قریب قریب بیس (۲۰) برس تک اموی حکومت کی سربراہی کی، اسکے عہد خلافت میں یہ حکومت تین بڑے بر اعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں پھیلی ہوئی تھی، جس کا ایک سرا مغرب میں جنوبی فرانس سے ملتا تھا، دوسرا مشرق میں گجرات تک وسیع تھا،

ہشام کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز ہے کہ اس نے اس سیاسی، مذہبی،

---

[1] المسعودی: مروج الذہب ج ۳ ص ۲۲۳ [2] البلاذری: انساب الاشراف ج ۲ ص ۱۸۳

معاشی، سماجی اور علمی ڈھانچے کی معاری کا کام انجام دیا ہے، جسے اسلامی تاریخ میں سنہری دور سے تعبیر کیا گیا ہے، اس نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، لیکن حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کی کامیابی اور نظامِ مملکت کی کارکردگی بہت حد تک اس کے مستحکم اقتصادی نظام پر منحصر ہے، اس لحاظ سے سرکاری خزانہ کے استحکام اور اس کے دفاتر کی تنظیم میں ہشام نے بڑے کارنامے انجام دیے، اور اموی خلفاء میں اس کی حکومت کا بجٹ نہایت متناسب اور جدید ڈھنگ کا تھا، اموی خلفاء میں کوئی بھی حکومت کے معاملات خصوصاً عمال کے فرائض منصبی اور سرکاری دفاتر (دواوین) کی باقاعدگی کے سلسلے میں ہشام کے جیسا نگران اور محتاط نہیں تھا،[1]

منصور نے بھی جو بیدار مغز عباسی حکمراں تھا، ہشام کی تقلید کی تھی، سرکاری خزانہ کے امور میں اس کی پالیسی کا بنیادی ڈھانچہ قریب قریب وہی تھا جسکی داغ بیل ہشام نے ڈالی تھی، یہاں تک کہ سکوں کا نظام بھی وہی تھا جس کی ابتدا ہشام نے کی تھی،[2] مالیات پر ہشام کا مکمل کنٹرول، سرکاری خزانہ میں غیر معمولی اضافہ کا سبب تھا، چنانچہ جتنی دولت اس کے خزانہ میں جمع ہوئی اتنی دولت کسی دوسرے اموی خلیفہ کو نصیب نہ ہو سکی[3]

اب ہم اقتصادیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں:

(۱) **زراعت**:۔ حکومت کے اقتصادی نظام کا سب سے اہم پہلو اس زمانہ میں زراعت تھا، ہشام کے عہد میں زراعتی پیداوار کے خطے درج ذیل تھے،

(۱) عراق میں دریائے دجلہ اور فرات کی وادی،

---

[1] ابن کثیر:۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ص ۳۵۳ [2] المسعودی:۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۲۲۳
الماوردی:۔ الاحکام السلطانیہ ص ۱۵۰ [3] الزرکلی:۔ الاعلام ج ۹ ص ۸۴-۸۵

(ii) الجزیرہ میں اس وادی کا بالائی حصہ۔

(iii) مصر میں نیل کی وادی،

(iv) خراسان میں دریائے جیحون (Oxus) کی وادی۔

جہاں تک ان علاقوں کے تجارتی حالات اور سیاسی استحکام کا تعلق ہے عراق اور مصر سب سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں تھے، ان سب خطوں کی زمین زرخیز تھی، زرعی پیداوار کے لیے آب و ہوا بھی مناسب تھی، خود حکومت بھی زرعی ترقیاتی منصوبوں کی ہمت افزائی کرتی تھی، اس نے زرعی پیداوار کے اضافے کی بہت سی صورتیں اختیار کیں، مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور زمینداروں نے مل کر غیر مزروعہ آراضی کو قابل کاشت اور زیادہ سے زیادہ زرعی پیداوار کے لائق بنانے کی کوششیں کیں۔[1]

حسان النبطی کے ذریعہ وادی نیل کے دارلی علاقوں اور دریائے دجلہ و فرات کے درمیان سیلاب سے متاثر علاقوں سے نئی قابل کاشت آراضی علیحدہ کی گئیں۔[2] لوگوں کو لگان کی بہت کم شرح پر آراضی کاشت کے لیے دیجاتی تھی، سینچائی کے لیے نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا جس سے پیداوار بہت بڑھ گئی تھی، حکومت کی طرف سے سینچائی کو آسان بنانے، سیلاب کو روکنے اور تجارتی و زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے متعدد اسکیمیں، نہروں کی کھدائی، پلوں اور پشتوں کی تعمیر کی بروئے کار لائی گئیں، چنانچہ ہشام نے "الھنی" اور "المری" نہروں کو شہر "رقہ" کے قریب بنانے کا حکم دیا،[3] دوسری نہر "المجامع" کے نام سے

---

[1] مروج الذہب ج ۳ ص ۲۱۶، [2] الماوردی: الاحکام ص ۱۴۳، جرجی زیدان ج ۱ ص ۲۱۵۔

[3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۱۸۱، المصعب بن عبداللہ: نسب قریش ص ۱۶۰۔

کوفہ میں عراق کے گورنر خالد القسری (م ۱۲۶ھ) کے ذریعہ بنائی گئی،[1] اس کے علاوہ خالد القسری کی تعمیر کردہ نہر "المبارک" بھی مشہور ہے۔[2] ان نہروں کی تیاری میں بڑی بڑی رقمیں صرف ہوئیں، صرف "المبارک" کی تعمیر میں ایک لاکھ درہم خرچ ہوئے تھے۔[3] خالد القسری کے زیر اہتمام کوفہ کا ایک پرانا پل از سر نو تعمیر ہوا، تاکہ سیلاب کے پانی کو روکا جا سکے۔[4] اسپین کے گورنر عبدالرحمٰن الغافقی (م ۱۱۴ھ) نے بھی قرطبہ میں ایک بڑا اور حسین پل تعمیر کرایا جس کا مقصد تجارتی سامان کی نقل و حمل اور لوگوں کی آمد و رفت میں سہولتیں مہیا کرنا تھا۔[5] الحر بن یوسف (م ۱۱۳ھ) والی موصل نے آب رسانی کے لیے ایک نہر موصل میں نکلوائی، اسی طرح بلال بن ابی بردہ (م ۱۲۰ھ) نے بصرہ میں ایک نہر تعمیر کرائی۔[6] تجارت کے فروغ کے لیے جدید طرز کے بازاروں کا قیام، تجارتی مراکز میں عمل میں آیا، یہ سب بازار سڑکوں کے ذریعہ دارالسلطنت سے اور خود ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیے گئے تھے، تاکہ غلہ اور دیگر اشیاء کی آمد و رفت آسانی سے ہو سکے۔[7] سبزیاں اور ادویات کے پودے اگانے پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ کسانوں کو اس کی آزادی تھی کہ وہ ٹیکس نقد کی شکل میں ادا کریں یا جنس کی صورت میں۔ اس سے ان کو غلہ فروخت کرنے کی زحمت سے نجات مل جاتی تھی۔ کسانوں کو مختلف طریقوں سے آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ زرعی پیداوار کے اضافے

---

[1] ابن الفقیہ مختصر کتاب البلدان ص ۱۸۳ [2] یاقوت الحموی معجم البلدان ج ۷ ص ۸۳ [3] المبرد: الکامل ج ۱ ص ۲۸۲

[4] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، ص ۱۸۳ [5] الزرکلی الاعلام، ج ۴ ص ۸۳ [6] یاقوت الحموی: معجم البلدان، ج ۸ ص ۳۳۷ [7] البلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۹۴

میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف وادی نیل میں ۳۰،۰۰۰،۰۰۰ ایکڑ (فدان) آراضی قابل کاشت بنائی گئی تھی۔[1] اس طرح ہر ایک زرعی خطے کی پیداوار میں اضافہ ہوا، عراق کی پیداوار سب سے زیادہ بڑھی تھی، خالد القسری گورنر عراق نے صرف عراق کی آراضی سے ۱۳ لاکھ درہم سالانہ حاصل کیے تھے۔[2]

ملک میں گیہوں اور کھجور کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا تھا، دوسری پیداوار میں جو، چاول، گنا اور کپاس اہم تھے۔ ان کوششوں سے ملک غلہ کے معاملہ میں خود کفیل ہو گیا، اور ہشام کے دور میں غلہ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی،

(۲) **معدنی ذخیرے**:۔ معدنیات بھی حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے، معدنیات میں چاندی، لوہا، سلفر اور مٹی کا تیل فارس کی کانوں سے نکال کر صنعتی شہر بصرہ بھیجا جاتا تھا، سلفر اور لنڈ بلخ سے حاصل ہوتا تھا،[3] عہد ہشام میں سفید مٹی کا تیل (White Naphtha) خوزستان کے راحمرمز شہر سے اور سیاہ تیل آذربیجان سے نکالا جاتا تھا،[4] مٹی کا تیل اور تار (Tar) دجلہ کے مشرقی پہاڑوں سے بھی حاصل ہوتا تھا۔ تار اور سلفر بڑی مقدار میں موصل میں پایا جاتا تھا، یہاں سے عراق کے مختلف شہروں اور بندرگاہوں میں بھیجا جاتا تھا، اس کا استعمال جہازوں، کشتیوں اور حماموں میں ہوتا تھا، مٹی کے تیل اور تار (Tar) کی پیداوار میں اضافہ کے لیے اس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا، موتی خلیج فارس میں الفرات کے دہانے کے قریب سے نکالے جاتے تھے۔[5]

---

[1] جرجی زیدان: تاریخ تمدن اسلام ج۲ ص ۱۰۱ [2] الجہشیاری: کتاب الوزراء ورق ۲۹ (ب) [3] الخربوطلی تاریخ العراق ص ۹، ۳۰ [4] الجہشیاری: کتاب الوزراء، ورق ۱۳۰ [5] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۲۶۵

اسپین کی کانیں بھی جستہ، لوہا، تانبہ، چاندی، سونا، کوئلہ اور پہاڑی نمک کا بڑا خزانہ تھیں۔[1] ان کے علاوہ دوسری جگہوں خصوصاً خراسان سے مختلف قسم کے پتھر، سنگ مرمر اور جواہرات حاصل کیے جاتے تھے۔ لوگوں کو کان کنی کی پوری آزادی تھی، حکومت صرف ⅕ حصہ برآمد شدہ اشیاء کا لیتی تھی۔[2]

(۳) **صنعت وحرفت**:- جیسے جیسے نئے شہر بستے گئے اور ان کی آبادی میں اضافہ ہوا، ضروریات زندگی کی اشیاء کی مانگ بڑھتی گئی، اس کے علاوہ اسلامی مملکت کے اندر خام اشیاء، سستے مزدوروں اور نئے بازاروں کی دستیابی اور رسل و رسائل کے لائق اعتماد ذرائع نے مختلف مصنوعات کے کارخانوں کی افزائش میں غیر معمولی مدد پہنچائی۔

(۱) کپڑے کی صنعت :- ملک مختلف علاقوں میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے تیار ہوتے تھے، اس عہد کی سب سے چالو تجارت کپڑوں کی تھی، پوشاک کے معاملہ میں خلیفۂ وقت کی اعلیٰ مذاقی سے پارچہ بافی کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی، عہد ہشام کے کپڑے اپنی نفاست، رنگوں کی بوقلمونی اور ڈیزائنوں کے حسن و تنوع کیلئے مشہور تھے، اور اس کی نسبت سے ہشامیہ کپڑے اپنے وقت کے فیشن ایبل اور مقبول ترین پوشاک میں شمار کیے جاتے تھے،[3] اسکے زمانہ کے اعلیٰ قسم کے کپڑے حسب ذیل تھے،

الخز (ریشم یا ریشم و اون کے تاروں سے تیار شدہ)

القطوف (ریشمی کپڑے (Beel.m.e.r.s))

الرقم (لکیر دار کپڑہ (Bariegaeted))

---

[1] یاقوت الحموی: معجم البلدان ج ۱ ص ۲۲ [2] الصولی: ادب الکاتب ص ۱۹۸ - ۲۰۱

[3] المسعودی: مروج الذہب، ج ۳ ص ۲۰۷

الوشی: (ریشمی بروکیڈ مطرز)

الارمنی: (ریشمی بروکیڈ)

الدیباج: (بروکیڈ، مخمل)

ان کے علاوہ دوسری قسمیں بھی تیار ہوتی تھیں۔[1] الخز اور الدیباج اس عہد کے سب سے قیمتی اور عمدہ کپڑے تھے، جس کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بصرہ تھا۔[2] کوفہ و بصرہ کپڑوں کے بڑے مرکز تھے، موصل بھی پارچہ بافی کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔[3] دوسرے اہم مرکز مصر، یمن اور المشرق تھے۔[4]

(ز) گھریلو دستکاری اور چھوٹی صنعتیں:۔ اس عہد میں اس قسم کے کام چھوٹے پیمانے پر انجام پاتے تھے، قالین، پردے، چادریں اور صوف پوش وغیرہ مختلف علاقوں میں تیار کیے جاتے تھے، الطراز (کشیدہ کاری اور زری کا کام) سب سے زیادہ شاہی محلات اور سرکاری حکام کے گھروں پر ہوتا تھا۔[5] فرنیچر اور امور خانہ داری سے متعلق لکڑی کا سامان عراق اور موصل میں تیار ہوتا تھا۔ شام اور عراق شیشے کے کارخانوں کے لیے مشہور تھے۔[6] شیشہ کے سامان کے لیے حلب آج تک مشہور ہے،

(ح) آتشیں سامان اور اسلحہ سازی کے کارخانے:۔ خلیفہ ہشام کے زمانہ میں اسلحہ سازی کی صنعت کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی، اور اس کی پیداوار میں بڑا

---

[1] الیعقوبی:۔ تاریخ ج ۲ ص ۳۲۸ [3] المسعودی، مروج، ج ۳ ص ۲۱ [2] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۵۸ - ۳۵۹ ۔ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۱۶۳، ۱۶۵ [5] ابن خلدون: مقدمہ ص ۲۹۳

اضافہ ہوا[1]۔ اسلحہ سازی کے مشہور کارخانے شام، تونس اور عراق کے علاقوں میں قائم تھے۔

(۷ ا) جہاز سازی کی صنعت:۔ بحر روم کی جنگوں کی بنا پر جنگی جہازوں اور کشتیوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، اس سے جہاز سازی کی صنعت میں ترقی ہوئی۔ تونس اور ٹائرس کے جہاز سازی کے کارخانے اس دور میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔[2] نقل وحمل میں کام آنے والی کشتیاں عراق اور سندھ میں سدوسان کے مقام پر تیار کی جاتی تھیں۔[3] اس زمانہ کی کامیاب بحری مہمیں جہاز سازی کی ترقی کا ثبوت ہیں۔

(۷) عمارت سازی کی صنعت:۔ ہشام کے عہد میں متعدد نئے شہر آباد ہوئے، اور بڑے بڑے محلات تعمیر کیے گئے شہری آبادی کے اضافہ نے تعمیر کی صنعت کو فروغ دیا، تعمیر کے کاموں میں استعمال ہونے والی اشیا مختلف جگہوں پر تیار کیجاتی تھیں، موصل میں "المنقوشہ" جیسے حسین محل کی تعمیر بذاتِ خود تعمیری ترقی کا ثبوت ہے۔[4]

(۴) **تجارت** (الف) ہشامی عہد میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا، عراق میں بصرہ سب سے بڑا اور ترقی یافتہ تجارتی مرکز تھا، اس کو پوری مملکت کا تجارتی مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا۔[5]

---

[1] حتی: تاریخ شام ص ۴۰۸؛ الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۰۶؛ الزرکلی: الاعلام ج ۴ ص ۳۴۵؛ امین واصف بک: فہرست معجم الخریطۃ التاریخیۃ ص ۳۹ [2] الزرکلی: الاعلام ج ۴ ص ۳۴۵؛ مصطفی بک نجیب: حماۃ اسلام ج ۱ ص ۱۹۸؛ امین واصف بک: فہرست ص ۱۳۱؛ حتی: تاریخ شام ص ۴۸۹ [3] الخربوطلی: تاریخ ص ۳۵۸-۳۴۸ [4] ابن الاثیر: الکامل ج ۵ ص ۲۶۳ [5] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان ص ۱۶۷

حج کے موقع پہ ہر سال حجاز تجارت کا بہت بڑا بازار بنجاتا تھا، اور یہاں تجارتی لین دین اور معاہدات ہوتے تھے۔[1]

(۱) بازار (السوق):- تجارت کی دنیا میں مارکیٹ کا وجود ضروری ہے، منظم و متوازن تجارت کا سارا دارومدار عمدہ اور مناسب بازاروں پہ ہوتا ہے، انہی کے ذریعہ ہر قسم کے سامان کی کھپت ہوتی ہے،

عہد ہشام میں صرف عراق میں پانچ عمدہ قسم کے بازار قائم ہوئے[2]، کوفہ میں خالد القسری، گورنر عراق نے ایسا بازار بنوایا جس میں تجارتی اشیاء کے لیے الگ الگ حصے تھے، دوکانوں کی چھتیں پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں[3]، ایسے بازاروں کی زیادہ تفصیل تو دستیاب نہیں ہو سکی، لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ ایک مرکزی بازار ہوتا تھا، جہاں ہر قسم کے تجار جمع ہوتے تھے، دوسری قسموں کے بازاروں کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تھی، بلکہ مختلف چیزوں کے بازار شہر کے مختلف حصوں میں ہوتے تھے[4]، چنانچہ شہر بصرہ میں بزازوں کی دوکانیں باب عثمان کے قریب تھیں اور سبزیوں اور پھلوں کی باب المرزق کے پاس[5]،

بازاروں کے نظم و نسق کی نگرانی مارکیٹ انسپکٹر کے ذریعہ ہوتی تھی جنھیں المحتسب کے نام سے پکارا جاتا تھا، اس کے مددگار "عامل علی السوق" اور "العارف" کہلاتے تھے، محتسب بازار کے بھاؤ اور ناپ تول کی بھی نگرانی کرتا تھا، اور تجارتی جھگڑوں کا فیصلہ بھی کرتا تھا، رات کو بازار بند ہونے کے بعد پولیس کا

---

[1] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان ص ۳،۲ [2] تین کوفہ میں اور ایک ایک بازار بصرہ و حیرہ میں تھا [3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۲۹۴ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۲۳۸ [5] ایضاً ص ۲۳۹

پیرا رہتا تھا،[1]

صالح احمد العلی کے قول کے مطابق پیشہ ور تجار کی تعداد اس زمانہ میں کافی حد تک بڑھ گئی تھی،[2] حکومت بازار کے بھاؤ اور خصوصیت سے اجناس کے نرخ کی بڑی سختی سے نگرانی کرتی تھی، بازار کا بھاؤ عام طور پر یکساں رہتا تھا۔ کیونکہ زمین کا لگان نقد و جنس دونوں شکلوں میں ادا کیا جا سکتا تھا، اس سے کسانوں کو لگان کی ادائیگی کے لیے کم داموں پر غلہ نہیں بیچنا پڑتا تھا۔ اسکے علاوہ عام طور پر ٹیکسوں کو بڑھایا نہیں جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر اوقات اشیائے خوردنی کا بھاؤ ایک سا رہتا تھا۔ صرف ایک مرتبہ صوبہ عراق میں خالد القسری کی گورنری کے زمانہ میں گیہوں کا نرخ بڑھ گیا تھا، ایک "الکیلہ" (تقریباً ۵ پونڈ) گیہوں ایک درہم میں فروخت ہونے لگا تھا،[3]

(۱۱) تجارتی بنک کاری کا نظام:- تجارت اور لین دین کی ترقی کے لیے بڑے سرمایہ کا ہونا ضروری ہے۔ خلفائے راشدین ہی کے عہد سے اسلامی مملکت میں پونجی پتیوں کا ایک خوشحال طبقہ موجود تھا جس سے تجارت کو بڑا فائدہ پہنچا،[4] اسلام پونجی پتیوں کا مخالف نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اسلام کے اخلاقی وسماجی تقاضوں کو پورا کرتے اور اپنی دولت کی زکوٰۃ نکالتے رہیں،[5]

عہد ہشام میں اسلامی مملکت میں پونجی پتیوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، مگر بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو پونجی کی کمی کی بنا پر کسی بڑے اور مفید تجارتی

---

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات الاجتماعیۃ ص ۲۳۴، ۲۳۹، ۲۶۶ [2] ایضاً ص ۲۳۵ [3] الطبری، تاریخ، ج ۳ ص ۲۵۶ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات، ص ۱۸۵-۱۸۹ [5] ایضاً ص ۱۸۵-۱۸۶

کاموں میں حصہ لینے سے معذور تھے،

ان حالات میں تجارت کے فروغ کے لیے قرض کا نظام ضروری تھا، مگر اسلام میں سود حرام ہے، اس لیے تجارتی قرض کا ایک نیا نظام قائم کیا گیا،[1] جو عہد حاضر کے نظام بینک کاری سے مختلف تھا، اس میں سرکاری خزانہ (بیت المال) کے علاوہ دوسرے بڑے سرمایہ دار بینک کا کام دیتے تھے اور وہ سود پر قرض دینے کے بجائے تجارت میں حصہ دار ہو جاتے تھے، مرکزی اور ریاستی بینک (بیت المال) بھی کسانوں کو محدود پیمانہ پر قرض دیا کرتے تھے، اس کی سہولت بھی حاصل تھی کہ ایک شخص بصرہ کے بیت المال سے قرض لے کر اس کو حجاز کے بیت المال میں ادا کر سکتا تھا،[2]

اس طرح کے بنکوں کے ممبران مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، قرض کی ضمانت یا رہن لکھ کر دیا جاتا تھا، رہن لینے والا رہن شدہ اشیاء کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا مجاز تھا، یہی وہ نفع ہوتا تھا جو بینک (پونجی پتی افراد) رہن شدہ رقم پر حاصل کرتا تھا، اس کی حیثیت سود کی نہیں تھی، بلکہ یہ فائدہ رہن شدہ اشیاء کی حفاظت اور خدمت کے صلہ میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ بینک ایسے بھی تھے، جنھوں نے مملکت کے مختلف شہروں میں شاخیں کھول رکھی تھیں، جن کا کنٹرول ہیڈ آفس کرتا تھا،[3]

لیکن قرضے کی رقمیں صرف اسلامی مملکت کے حدود کے اندر ہی دیجاتی تھیں، تاکہ وقت ضرورت قانونی چارہ جوئی کی جا سکے، اگر قرض خواہ قرض کی رقم

---

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۱۸۷ - ۲۴۰ [2] ایضاً ص ۲۵۴ و ۲۵۵ [3] ایضاً ص ۲۶۵

وقت پر ادا نہ کرسکتا تو سزا دی جاتی تھی۔[1]

اس طرح کے بینکوں کا کام ہنڈی (Bill of exchange)، ڈرافٹس اور ملکیت کے وثیقہ (Title deeds) کا اجراء تھا، اس سے یہ بڑا فائدہ تھا کہ تاجر سکوں کا بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کی زحمت سے محفوظ ہو جاتے تھے، اور راہ میں لٹنے کا خطرہ بھی نہیں رہتا تھا۔[2] کرنسی کا رکردگی مستحکم رائج الوقت سکوں کے نظام سے کنٹرول کیجاتی تھی، خلیفہ ہشام نے متعدد اصلاحات سکوں کی مستحکم اور منضبط گردش کے لیے کیں۔ اس عہد کے "الخالدیہ" اور "الیوسفیہ" سکے بہترین سکے شمار کیے گئے۔[3]

(iii) رسل و رسائل کے ذرائع :۔ رسل و رسائل کے دونوں ذریعوں بحری اور بری کی ترقی پر خاصی توجہ کی گئی تھی، اہم بازاروں کو سڑکوں اور شاہراہوں کے ذریعہ شہروں سے ملا دیا گیا تھا۔ مثلاً بصرہ سے مکہ معظمہ، کوفہ سے مکہ معظمہ، واسط سے بصرہ، کوفہ سے بصرہ اور واسط سے اہواز وغیرہ،[4] سال میں ایک مرتبہ "حج کی شاہراہ" بڑے پیمانہ پر تجارتی رسل و رسائل کے کام دیتی تھی، ہشام نے اس شاہراہ پر متعدد سہولتوں کا انتظام کر دیا تھا، جس سے مسافروں کو بڑا آرام ملتا تھا۔[5]

بحری حمل ونقل کے لیے نہریں کام آتی تھیں، کرایہ کی کشتیاں، بھاری سامان سستے داموں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی تھیں۔[6] اس لیے نہری نظم ونسق

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۳۶۳ - ۴۶۳ [2] ایضاً ص ۴۶۳ [3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۴۷۰

[4] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۶۵، ۳۷۰، ۳۷۵ [5] المسعودی: مروج الذہب ۳ ص ۲۱۰ [6] الخربوطلی تاریخ العراق ص ۳۵۴

میں ترقی ہوئی، اور متعدد نئی نہریں تعمیر کی گئیں، ان ذرائع کے علاوہ حکومت نے دوسرے ذرائع بھی اقتصادی ترقی کے لیے اختیار کیے، تجارتی سامانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت پر کوئی چنگی نہیں لیجاتی تھی۔[1] اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور کی طرح علاقہ بندی (zonal system) کے طریقے کو نہیں اپنایا گیا تھا،

(ب) خارجی تجارت:۔ غیر ملکی تجارت کے نقطۂ نظر سے اسلامی سلطنت ان دنوں دنیا میں سب سے زیادہ اچھی پوزیشن میں تھی، اس کا اقتدار تجارت کے اہم اور بڑے بڑے بحری راستوں پر قائم تھا، بحر احمر اور خلیج فارس کے ذریعہ مشرقی ممالک سے تجارت کرنا بہت آسان تھا، دوسری طرف مغربی ممالک سے تجارت کے لیے بحر روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا،

شمالی علاقوں (مثلاً بلاد الخزر وغیرہ) سے تجارتی روابط بحر کیسپین کے ذریعہ قائم تھے، گو غیر ممالک سے مختلف سرحدوں پر مسلسل جنگیں باقاعدہ خارجی تجارت کی ترقی میں سد راہ تھیں، پھر بھی غیر ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے، خلیفہ کی طرف سے گورنروں کو بندرگاہوں کی ترقی اور بہتر انتظامات کے لیے خصوصی احکامات صادر ہوتے تھے[2]

سندھ ہند (سندھ کے بعد ہندوستان کے دوسرے علاقے) اور چین سے تجارتی تعلقات کو فروغ دیا گیا،[3] چین کو اسلامی مملکت سے قریب کرنے کے لیے ایک سفارتی وفد چین بھیجا گیا تھا،[4]

عراق کے بندرگاہ میں روئی، ریشمی کپڑے، موتی، جواہرات، کھجوریں

---

[1] صالح احمد: التنظیمات ص ۱۵۱ [2] المسعودی: مروج الذہب ج ۳ ص ۲۱۷ [3] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۷۹ [4] الدکتور حسن ابراہیم: تاریخ الاسلام ج ۱ ص ۳۳۰

اور عطریات برآمد کیجاتی تھیں، لیکن برآمد شدہ اشیاء کی مقدار درآمدات سے ہمیشہ کم رہی، عراق کے درآمدات میں ناریل، کیلا، قالین، ہاتھی، ہاتھی دانت اور ادویات شامل تھیں[1] عراق ہندوستان سے جواہرات، زعفران، لونگ گنا، صندل، ٹیک کی لکڑی اور سیاہ مرچ درآمد کیا کرتا تھا[2] سب سے عمدہ قسم کی مشک تبت سے منگائی جاتی تھی،[3]

داخلی تجارت کے مقابلہ میں بیرونی تجارت زیادہ نہ تھی، اس کمی کا بڑا سبب یہ تھا کہ کمرشیل بنک کاری کا نظام غیر ممالک میں قرضوں کی سہولت مہیا نہیں کرسکتا تھا، لیکن زرتبادلہ کے مراکز (الصیارفہ) غیر ملکی تجارت کو بہت مدد پہنچاتے تھے۔ بصرہ زرتبادلہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، خصوصیت سے غیر ملکیوں کے لیے، صراف سونے کے بدلے رائج الوقت سکے بدلا کرتے تھے، اس عہد کے بازار کے بھاؤ کے مطابق غیر ملکی تجارت چلتی تھی۔ درآمدات کا سب سے بڑا حصہ ہندوستان سے بصرہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا،[4]

ان تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہشامی عہد میں اقتصادی نظام کیسے مضبوط بنیادوں پر قائم تھا، جس کے اثرات اس عہد کی سماجی زندگی میں نمایاں تھے، چنانچہ محققین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس زمانہ میں شخصی آمدنی کی سب سے نچلی سطح قریب دو ذنسو درہم سالانہ کی تھی، اس رقم سے کم آمدنی والے اشخاص غربا میں شمار کیے جاتے تھے، اور انھیں صدقات دینا جائز تھا، العطا (سرکاری وظیفہ) کی سب سے کم تر رقم بھی دو ذنسو درہم سالانہ ہوتی تھی،[5]

---

[1] الخربوطلی: تاریخ ص ۹،۳۰۲ [2] ایضاً ص ۳۰۳ [3] ایضاً ص ۳۸۰ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۲۶۶ [5] ایضاً ص ۲۶۲

دوسرے وظائف اور پنشن کے علاوہ صرف "العطاء" ہی کی رقم ایک شخص کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ اشیائے خوردنی میں سب سے اہم جنس کی قیمت ہمیشہ اعتدال پر رکھی جاتی تھی۔ گیہوں شرق اردن کے ممالک کی سب سے اہم غذا تھی، چنانچہ ہشام کے پورے عہد میں ایک "الکیلہ" (تقریباً پانچ پونڈ) گیہوں کی قیمت ایک درہم سے بھی کم رہی، صرف ایک مرتبہ ایسا موقع آیا تھا جب عراق میں ایک الکیلہ گیہوں ایک درہم میں فروخت

(۱) طبری: ج ۳ ص ۲۵۶

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم مآخذ

از
جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۳)

۱۔ ملفوظات | بیسویں صدی کے ابتدائی مورخین حسب ذیل ذرائع سے تاریخی معلومات حاصل کرتے تھے۔

(۱) عینی مشاہدہ (۲) سماجی روایات (۳) قصائد و عام اشعار، (۴) دفاتر سلطانی (۵) سکے، منار، عمارتیں اور دیگر آثار قدیمہ، لیکن آج ان ذرائع کے علاوہ بھی ایسے مستند مآخذ دستیاب ہو گئے ہیں جن سے ہماری رنگ برنگی تہذیب کے صحیح خد و خال سامنے آتے ہیں، یہ ہیں صوفیائے کرام کے وہ ملفوظات[1] جن میں اپنے عہد کی عکاسی نہایت غیر جانبداری سے کی گئی ہے۔

سلاطین دہلی اور مغلیہ دور حکومت میں صوفیائے کرام کا اثر و رسوخ عوام و خواص کے دل و دماغ پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ عامی سے لیکر عالم تک

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: 1. Introduction, Khair-ul-Majalis Aligrh, 1959. 2. Shik Nasi uddin, chiragh as a great historeal personlity, Islamic culture April 1946 3. Malfuzat Litiratur of Mustim Mystics by Dr. A.D. Arshad Radiance Delhi. June 14th 19 0

ان کی خدمت میں جانا باعث برکت وسعادت سمجھتے تھے، ان صوفیائے کرام کی مجالس میں جہاں آہ وبکا کی دلسوز آوازیں گونجتی تھیں، زمانے کے تغیرات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا، اپنے ماحول اور گذرے عہد کی خوبیوں اور برائیوں پر گفتگو ہوتی تھی، رنج وغم کی داستانیں سنائی جاتی تھیں، اور درد محبت کے تذکرے ہوتے تھے، ان سبق آموز باتوں کو عقیدت مند قلمبند کر لیتے تھے[1]

ان صوفیہ نے اپنا قیمتی وقت عوام کے حلقہ میں گذارا اور ہمیشہ یہ سمجھا کہ بادشاہوں کی صحبت سے ایمان کی رونق میں کمی آتی ہے، امراء تک سے تعلق رکھنا کبھی پسند نہیں کیا ہے

نے بہ نزدیک امیراں می شوند   نے بنزد خان وسلطاں می روند[2]

درباری مورخین جن واقعات کو سیاسی مصلحت یا ذاتی اغراض کی خاطر نظر انداز کر گئے ہیں، یہ درویش اپنی مجلسوں میں ان ہی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑتے گئے ہیں، اور اپنے عہد کے مذہب، تمدن ومعاشرت اور تاریخ وسیرت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے،

ان روحانی سلسلوں میں چشتیہ سلسلہ کا تعلق ہمارے ملک سے سب سے زیادہ رہا ہے، بقول مولانا سید سلیمان ندوی" اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنیں اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے، تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے

[1] دیکھئے، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلوی ۱۹۴۶ء ص ۲۴۱ (برہان اکتوبر ۱۹۴۲ء)

[2] دیوان حضرت جمال الدین ہانسوی، ج اول، ص ۱۰۹ دہلی ۱۸۸۹ء

فتح کیا ہے۔ (نقوش سلیمانی ص۳۵ نیز دیکھئے: (۱) تاریخ دعوت وعزیمت حصہ۳ ص۲۲ (۲) سلاطین وقت اور مشائخ چشت، الفرقان نومبر ۱۹۶۲ء)

اس لیے چشتیا ملفوظات ہندی قرون وسطیٰ کے بڑے قیمتی تاریخی ماخذ ہیں، عوام کے سماجی، تمدنی اور مذہبی حالات ان ہی ملفوظات کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، اس کے علاوہ بادشاہوں اور امرا کے ذہنی محرکات کا اندازہ بھی ان ہی ملفوظات سے ہوتا ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں:

"قرون وسطیٰ کے بیشتر ہندی مورخین ایرانی نظریۂ تاریخ سے متاثر تھے، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخوں میں صرف بادشاہوں کے حالات اور جنگی مہموں کی تفصیل ملتی ہے۔ عوام کی زندگی اور انکے مسائل کی کہیں کوئی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ملفوظات ہمارے تاریخی ماخذ کی اس تکلیف دہ کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں، ان میں عوام کے دلی جذبات، ان کی پوشیدہ آرزوئیں کشمکش حیات میں ان کی بارجیت، ان کی مایوسیاں اور پریشانیاں، ان کی معصوم مسرتیں ـــــ سب ہی محفوظ ہو گئی ہیں۔"[1]

ان ملفوظات کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ موضوع تو نہیں ہیں، پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس سلسلہ میں محققانہ بحث کی ہے،[2] پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں :-

---

[1] ملفوظات کی تاریخی اہمیت، نذر عرشی، دہلی، ۱۹۶۶ء ص۴۰۔ [2] تفصیل کے لیے دیکھئے :-

1. In y of Islam, Vol, ii (London, 1965) P.50 (Prof. K.A. Nizami article
2. The life and time of Shaik F -uddin Ganj-i-Sha er by Prof. K.N. Nizami. P.18-120. 3. Chishti Mystics records of Sultanate period. By Prof M. Habib. M. Quarterly Alegarh.

"ملفوظات کے بہت سے مجموعے جنھیں بعض لوگ مستند سمجھتے ہیں، حقیقتاً موضوع ہیں، ملفوظات کے مطالعہ میں اصل اور موضوع کا فرق کرنا ضروری ہے۔"[1]

(الف) چشتیہ ملفوظات کی فہرست جنھیں محققین نے مستند قرار دیا ہے درج ذیل ہے:-

(۱) سرور الصدور و نور البدور، ملفوظات شیخ[2] حمید الدین ناگوری (متوفی ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء) و شیخ فرید الدین، مرتبہ شیخ عزیز (مخطوطہ)[3]

(۲) فوائد الفواد، ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ امیر حسن علاء سجزی دہلویؒ،

(۳) دُرَرِ نظامیہ۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ مولانا علی محمود بن جاندارؒ۔

(۴) خیر المجالس[4]۔ ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، مرتبہ حمید قلندر،

---

[1] "ملفوظات کی تاریخی اہمیت"۔ نذر عرشی، ص ۱۴۰-۱۴۳ [2] اس نام کے ایک ہی عہد میں دو بزرگ گذرے ہیں، ایک شیخ حمید الدین ناگوری، خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، دوسرے قاضی حمید الدین ناگوری (متوفی ۶۴۴ھ) قاضی صاحب کا مزار دہلی میں ہے۔ دیکھئے: معارف، دسمبر ۱۹۷۰ء۔ اور آستانۂ زکریا، ملتان، مارچ ۱۹۶۱ء [3] پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے اس مخطوطہ کی تصحیح کرلی ہے لیکن ابھی شائع نہیں ہوسکا۔

[4] جس سلیقہ سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خیر المجالس کی تصحیح کی ہے، وہ اپنا ایک نمونہ ہے، دیکھئے: خیر المجالس۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء

(۵) احسن الاقوال[1] ۔ ملفوظات شیخ برہان الدین غریبؒ، مرتبہ خواجہ عماد ن حماد کاشانی،

(۶) جوامع الکلم ۔ ملفوظات سید محمد گیسو درازؒ، مرتبہ سید محمد اکبر حسینی۔

(۷) انوار العیون فی اسرار المکنون، ملفوظات شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ، مرتبہ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ،

(۸) ملفوظات شیخ سلیم چشتیؒ[2]، مرتبہ ابراہیم معصوم،

(۹) لطائف قدوسی، ملفوظات شیخ عبد القدوس گنگوہی، مرتبہ رکن الدین دہلوی

(۱۰) احسن الشمائل[3] ۔ ملفوظات شیخ نظام الدین اورنگ آبادی، مرتبہ خواجہ کامگار خاں،

(۱۱) فخر الطالبین ۔ ملفوظات شاہ فخر الدین دہلوی، مرتبہ نور الدین حسینی،

(۱۲) نافع السالکین[4] ۔ ملفوظات خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ (متوفی ۱۲۶۹ھ) مرتبہ مولانا امام الدین مرید خواجہ تونسویؒ،

---

[1] اس کا قلمی نسخہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم علی گڑھ کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے،

[2] ابھی شائع نہیں ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ آگرہ میں محفوظ ہے،

[3] اس کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شیفتہ کلکشن میں محفوظ ہے۔

[4] ایک قلمی نسخہ دو حصوں میں مکتوبہ ۱۸۷۰ء خاکسار نے مولانا آزاد لائبریری کے لیے خرید لیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ کے تعارف کے سلسلہ میں دیکھئے: خاکسار کا مقالہ "فتح پور کے بعض مخطوطات اور نوادر" معارف فروری ۱۹۶۲ء۔

(ب) چشتی بزرگوں کے وہ ملفوظات جن پر بے اعتمادی[۱] کا اظہار کیا گیا ہے مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) انیس الارواح (۲) دلیل العارفین (۳) فوائد السالکین
(۴) اسرار الاولیاء (۵) راحت القلوب (۶) افضل الفوائد
(۷) مفتاح العاشقین (۸) گنج الاسرار (۹) راحت المحبین ۔

ان موضوع ملفوظات کے سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ایک طویل محققانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں پروفیسر محمد حبیب کی رائے سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

---

[۱] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مقالہ

Chishti Mystics records of The Sultanate period
M. I. Quarterly, Aligarh. Oct. 1950

میں فوائد الفواد، خیر المجالس، سیر الاولیاء، سیر العارفین، اخبار الاخیار، کشف المحجوب، مصباح الہدایہ، مکتوبات یحییٰ منیری اور صحائف السلوک (مصنفہ پیش امام مولانا احمد) کو Genuine texts قرار دیا ہے، مندرجہ بالا ملفوظات پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہے، نیز دیکھئے: مقدمہ، خیر المجالس، بہ تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ علی گڈھ ۱۹۵۹ء، اس موقع پر سید حسن عسکری (پٹنہ) کا مقالہ "سلاطین دہلی کے عہد کے مشائخ کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت" بھی پڑھنے کے لائق ہے، یہ مقالہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی ۱۹۶۴ء کے اجلاس میں پڑھا گیا۔ معارف فروری ۱۹۶۴ء ص ۱۳۹ ۔

"بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملفوظات کے ہر مجموعہ کے مرتب کی یہ خواہش غالب رہی کہ اس کا مجموعہ اتنا اہم سمجھا جائے کہ اس کے پیشرو کے مجموعوں کی اہمیت کم ہو جائے، اس لیے وہ اپنے مرشد کی زبانی کوئی نہ کوئی ایسی روایت بیان کر دیتے جس سے پہلے کے مجموعوں کی اہمیت خواہ مخواہ گھٹ کر رہ جاتی"[1]

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"یہ ملفوظات اب تک نہایت لاپرواہی سے چھپتے رہے، لیکن ان کو محنت سے ایڈٹ کیا جائے اور ان میں سنین اور اسمار کی جو غلطیاں ہیں، ان کی نشاندہی ہمدردانہ طور پر کرکے درست کر دی جائیں تو یہ قدیم العہد ماخذ کے طور پر احتیاط سے استعمال کیے جا سکتے ہیں، جیسا کہ عہد ماضی میں بھی اہل قلم کرتے رہے ہیں"[2]

چشتیہ خانوادوں کے مستند اور موضوع ملفوظات کے علاوہ دوسرے خانوادوں میں سہروردیہ، فردوسیہ، قادریہ، شطاریہ اور نقشبندیہ ملفوظات بھی ہمارے قیمتی تاریخی ماخذ ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :

(۱) اسرار المخدومین، ملفوظات خواجہ کرک سہروردی (متوفی ۸۰۰ھ) مطبوعہ فتح پور ۱۸۹۳ء۔

(۲) سراج الہدایۃ، ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت[3]،

---

[1] معارف، اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۲۵۳ [2] ایضاً، دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۲۷۔

[3] Collection of Malfuzat of Makhdum-i-Jahanian (1307-88) of uch: Proceeding of the Pakistan history conference Karachi, 1951.

(۳) معدن المعانی[1] ۔ ملفوظات حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مرتبہ مولانا زید ابن عربی،

(۴) بحر الحقائق[2] ۔ ملفوظات حضرت شیخ وجہ الدین علوی گجراتی ۔

۲۔ مجموعہ مکتوبات | ہندی قرونِ وسطیٰ کے تاریخی مآخذ کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کے مکتوبات بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اور قرونِ وسطیٰ کے سماجی اور اور مذہبی حالات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں، اس لیے ان مکتوبات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[3] ۔ ان خطوط میں ان بزرگان دین نے سماج کے ہر طبقہ کو مخاطب کیا ہے، اور بادشاہوں، امیروں، عالموں، درویشوں اور عوام سب کو ان کے غلط کردار پر جھنجھوڑا ہے۔ ان کے عیوب گنائے ہیں، ان کو نصیحتیں کی ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے، اور نیکیوں کی تلقین کی ہے، ان خطوط کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اپنے زمانے کے بڑے نباض تھے۔ دکھ درد کا تجزیہ بھی کرتے تھے، اور اس کا علاج بھی بتاتے تھے، خواص سے محاسبہ بھی کرتے تھے اور غرباء کے زخموں پر مرہم بھی لگاتے تھے، اس سلسلہ میں چند مجموعۂ مکتوبات کے نام یہ ہیں:

(۱) مکتوبات حضرت شیخ بو علی قلندر بنام اختیار الدین[4] (۲) مکتوبات حضرت شرف الدین یحییٰ منیری (۳) مکتوبات حضرت نور قطب عالم[5] (۴) مکتوبات

---

[1] دیکھیے: معارف، فروری ۱۹۵۶ء [2] دیکھیے: معارف، جون ۱۹۵۰ء

[3] تفصیل کیلئے دیکھیے: Ency of Islam, vol ii, P 50 [4] اخبار الاخیار، ص ۱۲۱

نیز دیکھیے خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۳۲۷ [5] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص ۱۰۴

سید محمد اشرف جہانگیر سمنانیؒ (مخطوطہ) (۵) مکتوبات شیخ احمد سرہندی (۶) مکتوبات خواجہ معصوم نقشبندیؒ (۷) بحر المعانی[۱]۔ (مکتوبات حضرت خواجہ بندہ نوازؒ)
(۸) مکتوبات قدوسی (حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ)[۲]
(۹) مکتوبات شیخ حسام الدین مانکپوریؒ[۳] (۱۰) مکتوبات شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ (مخطوطہ) (۱۱) مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[۴]
(۱۲) مکتوبات شاہ کلیم اللہ دہلویؒ (۱۳) مکتوبات مرزا مظہر جانجاناںؒ

۳۔ فارسی تذکرے | صوفیائے کرام کے تذکروں سے بھی اسلامی ہند کے مستند حالات دستیاب ہوتے ہیں۔ آج کا مورخ ان تذکروں سے اس عہد کے عوام کے مذہبی رجحانات سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان ایام میں یہ بزرگ ایک نئے ماحول میں کس طرح اپنی زندگی گذارتے تھے۔ اور ان کی رواداری اور انسان دوستی کی بدولت اس اجنبی ماحول میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی[۴]۔ بقول مولانا عبد الحق" انھیں مرے صدہا سال گذر چکے ہیں۔ مگر جن مقامات پر انکے قدم پڑے تھے۔ وہ اب تک "شریف" اور "مقدس" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں[۵]۔ ان کے معاصرین اور عقیدتمندوں نے ان کے تقدس کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے،

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے: رسالہ اردو، علی گڑھ، شمارہ ۳ بابت ۱۹۶۱ء ص ۱۰۴ [۲] مرات الکاملین (مخطوطہ ذاتی کلکشن)
[۳] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے انکے سیاسی مکتوبات کو ایڈٹ کرکے شائع فرمایا ہے جو ایک آپ اپنا نمونہ ہے
[۴] دیکھیے (۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" مصنف سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۴۲-۳۵۲ (۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۱۰
[۵] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۵۱

(۱) امیر خسرو فرماتے ہیں :- ؎

ہمہ شیطاں کش و فرشتہ خدم — در رہش بر ہوا نہادہ قدم
زندہ دار شب از دم تسبیح — غلغل افگندہ در رواق مسیح
ہر سو از شین شرع ساختہ تاج — دل شاں عرش و سجدہ شاں معراج[۱]

(۲) حضرت جمال الدین ہانسویؒ کے جذبات ملاحظہ ہوں ؎

ایں طائفہ گلیم پوشاں — بے زحمت تاج و تخت شاہند
گرچہ حشم و خدم ندارند — با جامۂ زندہ پادشاہند[۲]

(۳) شیخ جمالی فرماتے ہیں ؎

فی الحقیقت ہمچو خورشید سپہر — بر جہاں انداختی انوار مہر[۳]

اب ہم ان ہندوستانی تذکروں کو پیش کرتے ہیں جن سے ہندی قرون وسطیٰ کے متعلق قیمتی اور مستند معلومات حاصل ہوتے ہیں :

(۱) سیر الاولیاء، امیر خورد (۲) لطائف اشرفی[۴]، مرتبہ نظام الدین یمینی (۳) سیر العارفین ـ مولانا جمالی (۴) اخبار الاخیار شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، (۵) گلزار ابرار، محمد غوثی شطاری (مخطوطہ[۵]) (۶) اخبار الاصفیاء، عبد الصمد بن افضال محمد (مخطوطہ

---

[۱] مثنوی ہشت بہشت، امیر خسرو (نولکشور، لکھنؤ) ص ۱۳ [۲] دیوان جمال الدین ہانسوی ج ۱ ص ۵۰ [۳] سیر العارفین ص ۱۰۲ [۴] لطائف اشرفی میں صوفیہ کے تذکرے بھی ہیں، یہ قدیم ترین تذکروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے، دیکھئے: معارف ستمبر ۱۹۵۸ء [۵] اسکا اردو ترجمہ اذکار ابرار کے نام سے آگرہ سے شائع ہوا ہے۔

(۷) مراۃ الاسرار، عبد الرحمٰن چشتی (مخطوطہ) (۸) مجمع الاولیاء، میر علی اکبر حسینی اردستانی۔ (۹) سیر الاقطاب، شیخ اللہ دیا چشتی (۱۰) جواہر فریدی۔ علی اصغر چشتی (۱۱) معارج الولایت۔ غلام معین الدین عبد اللہ (۱۲) مطلوب الطالبین، محمد بلاق چشتی[۱] (مخطوطہ) (۱۳) روضۃ الاقطاب، محمد بلاق چشتی (۱۴) مناقب الاصفیاء، حضرت مخدوم شاہ شعیب[۱]۔ (۱۵) سفینۃ الاولیاء، دارشکوہ (۱۶) خزینۃ الاصفیاء غلام سرور (۱۷) ذکر الاصفیاء معروف تکملہ سیر الاولیاء، خواجہ گل محمد احمد پوری (۱۸) مرات الکاملین[۲]، عباد اللہ خواجہ عنایت اللہ کالپوی (مخطوطہ ذاتی کلکشن)

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھئے: معارف مارچ ۱۹۶۵ء [۲] تعارف کے سلسلہ میں دیکھئے؛ مقالہ "فتح پور کے بعض مخطوطات اور نوادر"۔ معارف فروری ۱۹۷۲ء

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از مولوی سلمان صاحب شمسی ندوی

(۷)
دینی مباحث

آزاد - ابوالکلام فروری ۱۹۰۶ء

القضاء فی الاسلام ص ۲۴ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۲

اسلام دین و دنیا کا جامع ہے، اس لیے اس کے مجموعۂ تعلیم میں اعتقادات و عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی مکمل حصہ موجود ہے، لیکن مخالفین کا دعویٰ ہے کہ اسلام آخری حصہ سے تہی دست تھا، اس لیے رومن لا کی دریوزہ گری کرکے اس کمی کو پورا کیا گیا، اس مضمون میں ہم قانون کے حصۂ قضاءت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ بانیٔ اسلام نے کس جامعیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی اور کس خوبی سے اس کے قواعد مرتب کیے،

۱- ابوالحسن علی ندوی (سید) دسمبر ۱۹۱۲ء

اعجاز القرآن ص ۱۱ - ۲۰

حوالہ ۲۸۰/۲

قرآن کا امتیاز خصوصی اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے۔ اس لیے اس میں انسان اپنے ظنی اور مشتبہ، ناقص و محدود اور خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کرسکتے ہیں، جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

۲۔ "قرآن کا تعارف قرآن کی زبان سے" جنوری ۱۹۴۱ء

ص ۴ - ۱۶

حوالہ ۲۸۰/۳

"اعجاز القرآن سے متعلق متفرق آیات کو جمع کرکے ان کی تفسیر کی گئی ہے"

۳۔ قرآن کی پیشین گوئی مئی ۱۹۴۱ء

ص ۵ - ۱۷

حوالہ ۲۷۹/۲

قرآن مجید کا ایک اعجاز پیشین گوئیاں ہیں ...... جن حالات میں یہ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اور جس طرح ان کا ظہور ہوا وہ ایک معجزہ ہے۔"

سورہ روم کی روشنی میں بحث کی گئی ہے،

۴۔ قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط و موانع نومبر ۱۹۴۱ء

ص ۹ - ۲۵

حوالہ ۲۸۰/۲

قرآن مجید کا خطاب سب سے یکساں ہے، لیکن اس کو قبول کرنے اور اس سے مستفید

ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی، چیز ایک ہے، لیکن اس کے انسانی ظرف اور محل باہم متفاوت ہیں"۔

۵ - رسالت اگست ۱۹۴۱ء

ص ۹ - ۲۰

حوالہ ۲۸۰/۲

پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونے کا دعویٰ ہے، وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ خدا ہے یا اس کے یہ صفات ہیں، بلکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہم کلام ہوتے ہیں، ہمارے پاس اس کے پیغام پہنچتے ہیں؛ ہمارے پاس اس کے فرشتے آتے ہیں۔

۱ - اسحٰق محمد پشاوری مارچ ۱۹۴۲ء

"احتساب اسلام میں" ص ۱۸ - ۲۵

حوالہ ۲۸۰/۳

پہلی صدی کے بعد جب لوگ اعمال میں تساہل برتنے لگے اور نگاہیں حق شناسی کی روادار نہ رہیں تو حکومت کی طرف سے احتساب کا شعبہ قائم ہوا، جس میں مختلف کارکن ہوتے تھے، جو مختلف خدمتوں پر مامور تھے، یہ محکمہ ادارۂ قضاۃ کے بالکل مشابہ تھا۔

۱ - اکرام اللہ خاں ندوی مئی ۱۹۱۶ء

"غلامی اور اسلام" ص ۱۶ - ۲۵

حوالہ ۲۸۶

مضمون میں مخالفین مذہب کے اس الزام کی تردید کی گئی ہے کہ اسلام نے

غلامی کو ختم نہیں کیا اور برقرار رکھا، مذاہب کا جائزہ لیا گیا اور اسلام میں غلاموں کے ساتھ جو حسن سلوک کی تاکید کی ہے، اسے بھی مع واقعات ذکر کیا ہے، نیز اسلام میں غلاموں کے حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- قرآن مجید اور معارضہ فروری ۱۹۱۵ء

ص ۹ - ۲۲

حوالہ ۲۶۹/۱۱

قرآن مجید کے موضوع معارضہ اور تحدی سے بحث کی گئی ہے، جس سے اعجاز قرآن پر روشنی پڑتی ہے۔

۳- ہمارا نصب العین اکتوبر ۱۹۱۵ء

ص ۲۹ - ۳۲

اسلامی نصب العین اور مسلمانوں کے فرائض و واجبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حمید الدین فراہی، (مولانا حمید الدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن)

"قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں" اپریل ۱۹۰۶ء

ص ۲۲ - ۳۲

حوالہ ۲۶۹/۴

قرآن مجید میں جہاں جہاں قسم کا لفظ آیا ہے، پہلے معنی کے لحاظ سے آیا ہے، خدا جب اپنی قدرت و شان کا اظہار کرتا ہے تو آفتاب کی، چاند کی، ستاروں کی، دن کی رات کی قسم کھاتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تمام چیزیں اس کے وجود اور عظمت کی گواہی دے رہی ہیں۔

زکی ۔ احمد زکی بک جون ۱۹۰۹ء

اسلامی غزوات ص ۲۹ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۹

اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ ابتداے اسلام میں مسلمانوں کی جنگی مہمات اس امر کا ثبوت ہیں کہ اسلام نے محض تلوار کے سایہ میں اشاعت پائی ہے۔ لیکن ہر ایک منصف نظر شخص ان لڑائیوں کی صحیح تاریخ پڑھنے سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان تمام غزوات اور لڑائیوں کا اصل سبب اشاعتِ اسلام کا جوش نہ تھا،

۱۔ سلیمان ندوی (سید علامہ) ستمبر ۱۹۱۱ء

الاحتساب فی الاسلام ص ۵ - ۲۳

حوالہ ۲۷۹/۸

محکمۂ احتساب اسلام کا وہ عظیم الشان اور روشن ترین کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب، کوئی تمدن، کوئی سلطنت پیش نہیں کر سکتی۔ یہ دعوی محتاج دلیل ہے، اس کی دلیل ناظرین مضمون کے خاتمہ پر پائیں گے،

۲۔ ارض القرآن اگست ۱۹۱۵ء تا نومبر ۱۹۱۵ء

حوالہ ۲۸۵

قرآن مجید میں بیس، تیس اقوام و اشخاص سے زیادہ نہیں، تاہم انکی تحقیق کے لیے مخصوص طور سے کبھی کوشش نہیں کی گئی، عموماً یہ مباحث تفسیر کے ضمن میں لکھے گئے یا تاریخ عمومی میں مقدمہ کے طور پر مذکور ہوئے، حالانکہ اس اہمیت تخصیص و افراد کی محتاج تھی،

(کتاب سے اقتباسات)

۳۔ اسلام اور تمدن فروری ۱۹۰۹ء

ص ۱۷ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۶

ایک فرانسیسی فاضل میسو رنیا میلیا کے لکچر کا ترجمہ جو اس نے پیرس کانفرنس میں دیا تھا جس میں اسلامی تمدن کی برتری ثابت کی گئی ہے،

۴۔ اسماء القرآن اگست ۱۹۱۱ء

یعنی قرآن مجید کے نام اور انکے متعلق تحقیقات ص ۷ - ۲۰

حوالہ ۲۷۹/۸

مندرجۂ ذیل عنادین سے بحث کی گئی ہے،

نام کی ضرورت ، دیگر صحف انبیاء کے نام ، الہامی کتابوں کے نام الہامی ہوتے ہیں ، کثرت اسماء القرآن ، قرآن مجید کے عام نام ، قرآن مجید کے مخصوص نام وغیرہ

۵۔ اشتراکیت اور اسلام مئی ۱۹۱۱ء

ص ۳ - ۳۴

حوالہ ۲۷۹/۴

نظریہ اشتراکیت کا جائزہ اور اسلام سے موازنہ کیا گیا ہے،

۶۔ برنابا کی انجیل اکتوبر ۱۹۰۷ء

ص ۲۳ - ۳۰

حوالہ ۲۷۹/۴

لوقا ، متی ، مرقس ، یوحنا کی انجیلوں کے سوا عیسائیوں کے یہاں ایک اور انجیل ہے جس کا نام برنابا کی انجیل ہے ، عیسائی اس کو اصل انجیل نہیں سمجھتے ، ان کے پاس اس دعویٰ کی صحت کی دلیل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس انجیل میں اسلام کی ہر جگہ تائید ہے اور ہمارے نزدیک یہی امر اس کی صداقت کا ثبوت ہے ۔

۷ - تاریخ ارض القرآن کا ایک باب جنوری ۱۹۱۵ء

ص ۷ - ۳۶

حوالہ ۲۸۵

ارض القرآن کی پہلی جلد کا اقتباس جس میں اصحابِ ایکہ ، مکہ اور جدہ کے حالات لکھے گئے ہیں ۔

۸ - تحریم شراب اکتوبر ۱۹۰۹ء

ص ۱۵ - ۲۴

حوالہ ۲۷۹/۹

جس طرح اسلام اور اس کے احکام فطری ہیں ، اسی طرح اس کا طریقۂ تعلیم بھی فطری ہے ، اس نے اپنے متبعین کو شراب کی حرمت کا مسئلہ بالکل تدریجی طور سے بتایا تاکہ عرب آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اپنی اس قدیم اور راسخ عادت کو چھوڑ سکیں ۔

۹ - جنگِ احد ستمبر ۱۹۰۹ء

ص ۱۹ - ۲۹

حوالہ ۲۷۹/۹

جنگِ احد کے واقعات سے اسلامی غزوات کے اسباب، مسلمانوں کی جنگی حفاظت، مسلمان مجاہدوں کی بے سر و سامانی، مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال، صحابہ کی بہادری، مسلمان عورتوں کی شجاعت اور ان کی مذہبی خدمت گذاری، مسلمان شہداء کا ایمان صادق اور مشرکین کی سنگدلی کے حالات تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۰۔ سود اور صحفِ انبیاء　　　جون ۱۹۰۹ء

ص ۲۱ - ۲۸

حوالہ ۷/۲ پ

جائزہ لیا گیا ہے کہ گذشتہ صحف میں سود حرام قرار دیا گیا، تاریخی حقائق و واقعات کو ذکر کیے گئے ہیں، اور آخر میں قرآن مجید کی آیات حرمت کی تفسیر پیش کی گئی ہے،

۱۱۔ سیرت کا مختصر پیام　　　مئی ۱۹۴۰ء

ص ۴ - ۱۲

حوالہ ۲۸۷

سیرت پر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک نشری تقریر،

۱۲۔ صحابہ کی تعداد اور طبقاتِ رواۃ　　　اگست ۱۹۰۹ء

ص ۴ - ۱۴ ، حوالہ ۷/۲ پ

علامہ ذہبی کی رائے کے مطابق ان ایکسو پانچ صحابیوں میں سے اٹھائیس صحابہ ایسے ہیں جنکے نام سے علم حدیث کے اکثر صفحات مزین ہیں، ان اٹھائیس ۲۸ صحابیوں میں سے . . . . . . نام کی تفصیل کے ساتھ ۹ صحابہ سب سے زیادہ کثیر الروایات ہیں،

۱۳۔ القرآن والفلسفۃ الحدیثۃ جولائی ۱۹۰۶ء

ص ۲۱ - ۳۰

حوالہ ۲۷۹/۳

اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے جس نے اپنے مسائل کی بنیاد عقل پر رکھی، قرآن مجید کا طرز تعلیم دیکھو کہ اس نے اپنے پیرووں کو جہاں کسی مسئلہ کی تلقین کرنی چاہی، اس کی دلیل بھی بیان کر دی ہے، تتبع سے ایسی بہت سی حدیثیں اور آیتیں مل سکتی ہیں جن میں یہ صاف صاف کہا گیا ہے کہ مذہب کو عقل سے ماننا چاہیے

۱۴۔ قیامت ستمبر ۱۹۰۹ء

ص ۹ - ۱۹ ، حوالہ ۲۷۹/۹

حوالہ ۲۷۹/۹

عقائد کے اکثر مسائل ایسے ہیں جنکے ثبوت اور طرز ثبوت میں اسلام کے مختلف فرقے مختلف الرائے ہیں، لیکن ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ قیامت کے اعتقاد پر کل فرقہائے اسلامیہ کا اتفاق ہے، لیکن یورپ، یونان اور ہندوستان کے اکثر حکماء کو قیامت اور فنائے عالم سے انکار ہے،

۱۵۔ مذہب اسلام اور علم و عقل جولائی ۱۹۱۱ء

ص ۵ - ۱۸

حوالہ ۲۷۹/۸

اس مذہب نے اپنے زور اور قوت کے موافق علم اور تحقیقات جدیدہ کی مخالفت کی، عقل کو آگ اور تکفیر کے ہتھیار سے سزا دی لیکن نہ رکنا تھا نہ رکی

نہ مٹنا تھی نہ مٹی اور خود اس کو ہٹا کر اور مٹا کر رہی، مذہب کے یہی مظالم ہیں جن میں اس نے اپنے خصوصیات سے باہر قدم رکھا، اور آخر حکمائے یورپ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مذہب اور علم دو منافی چیزیں ہیں، جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں

۱۶ - مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید جنوری ۱۹۱۰ء

ص ۱۹ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۴

مسئلہ ارتقاء کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان دفعتہً پیدا نہیں ہوا، بلکہ چند مرحلوں میں انسان اپنی اس آخری منزل تک پہنچا ہے، جماد سے نبات ہوا، نبات سے حیوان اور حیوان سے انسان، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں انسان کے چند دوروں میں پیدا ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

(باقی)

مکتوب حمید

پارس - ۲۳ راگست

محترمی! زاد مجدکم سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تہذیب جدید کا کرشمہ ہے کہ مئی ۱۹۶۲ء کا رسالہ معارف اب اگست کے آخر میں آیا ہے، اس میں امیہ بن ابی الصلت پر مقالہ شوق سے پڑھا، اگرچہ آخر میں "باقی" لکھا ہے لیکن اس کا کسے یقین کہ اسے دیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ اسی لیے دو چیزیں جو ذہن میں گزریں، فوراً عرض کرتا ہوں۔

مقالہ کے شروع ہی میں (یعنی صفحہ ۳۲۵ کے حاشیے میں) لکھا ہے کہ زید ابن عمرو بن نفیل "بعثت نبوی سے ۵، سال پہلے ہی مرگیا" کیا مسند سے میں طباعتی غلطی ہے؟ یا مقالہ نگار نے تحقیق کے بعد لکھا ہے؟

بعثت نبوی چالیس سالہ عمر میں ہوئی، لہذا امیہ کو ولادتِ باسعادت نبوی سے پینتیس سال پہلے مرچکا ہونا چاہیے، لیکن میرے سامنے اس وقت الروض الانف للسہیلی (طبع اول) ہے، اس میں جلد اول کے صفحہ (۱۴۹) پر ہے

روى البخاري عن ...... ان	امام بخاری نے فلاں فلاں سے
النبي صلى الله عليه وسلم	روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے
لقي زيد بن عمرو بن نفيل	بلدح [پہاڑ] کے زیریں حصے میں
بأسفل بلدح قبل ان	زید سے ملاقات فرمائی اور اس
ينزل على النبي عليه السلام	وقت تک آپ پر وحی نازل

الوحی ..... الخ نہ ہوئی تھی ..... وغیرہ

اسی طرح سیرۃ رسول اللہ لابن ہشام میں ہے (طبع یوروپ) اس کے صفحہ (۱۴۸ تا ۱۴۹) پر اس کی موت کے ذکر میں ہے کہ وہ دین حق کی تلاش میں موصل تک گیا، پھر شام آیا تو میفعہ کے مشہور راہب نے اس سے کہا: "تو اسے یہاں کہاں ڈھونڈھ رہا ہے، وہ تو تیرے ہی ملک میں مبعوث ہوگا۔ اور اب اس کا وقت آچکا ہے۔ اس پر وہ تیزی سے مکہ واپس ہوا، مگر راستے میں قبیلۂ لخم کے لٹیروں نے اسے مار ڈالا ——— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید کی وفات بعثت نبوی کے بعد ہوئی،

دوسرا قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (مخطوطۂ استانبول و رباط) کے اس حصہ میں جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، امیہ بن ابی الصلت کی سوانح عمری بھی ہے۔ اس میں یہ جملہ ہے:

دکان یہودیا وہ یہودی تھا،

اس توضیح کے بعد اس کے اشعار میں توحید، فرشتوں وغیرہ کا ذکر آئے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ قبیلۂ ثقیف سے اس کا تعلق موالات کا ہوگا بنسل کا نہیں،

خدا کرے آں محترم اب خیر و عافیت سے ہوں۔

نیازمند
محمد حمید اللہ

باب التقریظ والانتقاد

الہند فی العہد الاسلامی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

الہند فی العہد الاسلامی اسلامی ہند کے مشہور مورخ و محقق حضرت مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۴۱ھ) کی تیسری اہم ترین کتاب ہے، جو حال ہی میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے چھپکر شائع ہوئی ہے، اس سے پہلے ان کی دو کتابیں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" حیدر آباد اور دمشق سے شائع ہو کر عالم اسلام میں قبول عام حاصل کر چکی ہیں، اب یہ تیسری کتاب ہمارے سامنے آئی ہے، اس وقت اسی کتاب کا تعارف مقصود ہے۔

اسلامی ہند پر علماء نے اپنے اپنے دور میں زمانہ اور حالات کے تقاضے کے مطابق کتابیں لکھیں، قدماء میں واقدی ۲۰۷ھ کی کتاب اخبار فتوح السند، مدائنی ۲۲۵ھ کی کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند اور کتاب فتح مکران میں اموی دور اور ابتدائی عباسی دور کی فتوحات و امارات وغیرہ کا تذکرہ تھا، مگر ان میں سے کوئی کتاب آج موجود نہیں ہے، چوتھی صدی میں بزرگ بن شہریار ناخدا نے عجائب الہند کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں عباسی دور میں اہل ہند کے عادات و عوائد

سے متعلق کچھ باتیں پائی جاتی ہیں، یہ ایک قسم کا سفرنامہ ہے، البیرونی ۴۳۰ھ کی کتاب الہند اور تحقیق ما للہند میں یہاں کے علوم وفنون خاص طور سے ریاضی اور فلکیات کا بیان ہے، یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں، اسلامی ہند پر ان مستقل تصانیف کے علاوہ سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، ابن حوقل بغدادی، مسعر بن مہلہل ینبوعی، مسعودی وغیرہ نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں یہاں کے عام حالات درج کیے ہیں، اور ابن خرداذبہ کی المسالک والممالک، ابن فقیہ ہمدانی کی کتاب البلدان، اصطخری کی مسالک الممالک، مقدسی کی احسن التقاسیم اور حموی کی معجم البلدان میں یہاں کے بلاد وامصار اور ان کے جغرافیائی حالات موجود ہیں، مگر ان کے مندرجات ومعلومات کا تعلق تیسری اور چوتھی صدی کے سندھ ومکران سے ہے، نیز ان سے اس زمانہ کے اسلامی ہند کی تصویر سامنے نہیں آتی ہے، البتہ ابن بطوطہ مغربی کے سفرنامہ کی دوسری جلد میں آٹھویں صدی کے اسلامی ہند کے سیاسی و ملکی حالات اور خطط و آثار کے بارے میں کافی مواد پایا جاتا ہے، اسی طرح فضل اللہ عمری کی مسالک الابصار میں تغلق دور کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات درج ہیں، مگر اس کا یہ حصہ ابھی تک مخطوطہ ہے، آخری دور میں شیخ غلام علی آزاد ۱۲۰۰ھ نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان لکھی، جس میں ہندوستان کے چند علماء و فضلاء کے تراجم، ہندوستان سے متعلق آثار وروایات اور ہندی شعر وادب کا تذکرہ ہے،

یہ بات قابل تعجب اور ساتھ ہی افسوسناک ہے کہ ان بارہ تیرہ صدیوں میں یہاں کوئی ایسا عالم نہیں گذرا جس نے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ابن عساکر کی تاریخ دمشق، لسان الدین خطیب کی الاحاطہ فی اخبار غرناطہ اور مقریزی کی

کتاب الخطط والآثار کی طرح اسلامی ہند پر کوئی جامع کتاب تصنیف کی ہو۔ اور تھوڑا بہت جو کام ہوا وہ غیر ہندی علماء و مصنفین کے قلم کا احسان ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں کے فارسی مورخوں اور تذکرہ نویسوں سے شکوہ فضول ہے۔ کیونکہ انھوں نے روز اول ہی سے اپنے اپنے حلقے مخصوص کر لیے تھے، ایک طبقہ کا قلم شاہی دربار کی گلکاریوں میں منہمک رہا، اور دوسرا طبقہ مشائخ کی خانقاہوں میں بیٹھکر اپنے قلم کی برکت سے کشف و کرامات کا مینارۂ نور نصب کرتا رہا اس کے باوجود ان دونوں طبقوں نے بعض معیاری اور معلوماتی کتابیں لکھیں، جن کی قدر و منزلت مسلم ہے، چنانچہ درباری حلقہ میں ابوالفضل کی آئین اکبری اپنے موضوع پر نہایت جامع اور بے نظیر کتاب ہے، جس میں اکبری دور کے ہندوستان کی ملکی و آئینی معلومات اور دوسری بہت سی باتیں نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں، مگر اس کی حیثیت ایک حکومت کے انتظامی آئین نامہ کی ہے، یا زیادہ سے زیادہ اسے تیموری سلطنت کا آئینہ کہا جا سکتا ہے، اس لیے ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو اسلامی ہند کا نقشہ ہمارے سامنے یوں پیش کرے کہ ہم اس میں عہد بہ عہد مسلم ادوار کے خد و خال دیکھ سکیں اور معلوم ہو کہ امویوں، عباسیوں، غزنویوں، غلاموں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، تیموریوں اور ان کے دور کے علاقائی خود مختار امراء و سلاطین نے حکومت و سیاست کے میدان میں کیا کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کا نظام حکومت، نظام مالیات، نظام آراضی، نظام عدل و انصاف، نظام جنگ وغیرہ کس قسم کا تھا، اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں کون کون سے عہدے اور مناصب تھے،

درباری آداب و رسوم کیا تھے، رعایا اور عوام سے امراء و سلاطین کے تعلقات کس نوعیت کے تھے، انھوں نے کیا کیا رفاہی خدمات انجام دیں اور امن و امان کی بحالی و برقراری کے لیے کیا جتن کیے، ان کے دور میں یہاں کے مختلف مذاہب اور مختلف طبقات کے ساتھ کیا سلوک تھا، انھوں نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے مدارس قائم کیے، جوامع و مساجد تعمیر کیں، غیر مسلموں کے معبدوں کے لیے کیا کیا، شفاخانوں کا کیا انتظام تھا، ان میں مریضوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا، انھوں نے اس ملک میں کیسی کیسی پرشکوہ اور حسن و جمال سے بھرپور عمارتیں بنائیں کیسے کیسے باغات و انہار سے اس ملک کو سرزمین جنات و انہار بنایا، کس دور اندیشی سے راستوں اور سڑکوں کی تعمیر کرکے پورے ملک کو ایک بستی بنایا اور ڈاک کا بہتر سے بہتر انتظام کرکے ملک کے دور دراز علاقوں کو جوڑ دیا۔

نیز اس دور میں یہاں کے باشندوں کے مذاہب، زبانیں، رسوم و عادات تہوار، ماہ و سال، اعداد و شمار اور معابد و ہیاکل وغیرہ معلوم ہوں،

بلاشبہہ ان تمام معلومات بلکہ ان کے علاوہ اور بہت سی نہایت اہم اور قیمتی معلومات کے لیے" الہند فی العہد الاسلامی" مکمل اور جامع کتاب ہے اور جس طرح اس کے مصنف مرحوم نزہۃ الخواطر میں ہندوستان کے ابن خلکان اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں ابن ندیم معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح الہند فی العہد الاسلامی میں اپنے ملک کے مقریزی نظر آتے ہیں۔

جس زمانہ میں مولانا مرحوم اسلامی ہند کے علماء و مشائخ، علوم و فنون اور محاسن و مفاخر کی داستانیں عربی زبان میں مرتب کر رہے تھے۔ ان کے

معاصر مورخ و مصنف ان ہی موضوعات و مباحث پر اردو زبان میں کتابیں لکھ رہے تھے، اور ان کو مسلمانوں کے قدیم و جدید طبقوں میں قبول عام حاصل ہوتا تھا، مگر ان کا نقطۂ نظر وفنی اور مقامی نہیں تھا، اس لیے انھوں نے ان کتابوں کے لیے عربی کو تصنیفی زبان قرار دیکر پورے عالم اسلام میں اسلامی ہند کو روشناس کرانا چاہا تھا، چنانچہ یہ مقصد ان کی وفات کے چالیس پچاس سال کے بعد پورے طور سے حاصل ہوا اور انکی کتابیں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک بلکہ عالم اسلام کے علماء و محققین میں مقبول ہوئیں، ساتھ ہی مصنف مرحوم اپنی تصانیف کے ذریعہ ہندوستان کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جسکا ارتکاب شروع سے آخر تک ان کی فارسی کی تاریخوں میں ہوا ہے، چنانچہ یاد ایام میں ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتداء سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں، مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے معیار پر پوری نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے، قزاکوں کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو جنگ دربار کے ذکر سے اس کو آپ خالی نہ پائیں گے۔"

میں اسلامی ہند کی تاریخ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس حقیقت کے اظہار میں اطمینان و مسرت محسوس کرتا ہوں کہ یہ کتاب اور نزہتہ الخواطر

اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اسلامی ہند کی تاریخ نویسی کے معیار پر پوری اترتی ہیں، اور ان میں یہاں کے اسلامی ادوار کی تاریخ کی پوری آئینہ داری موجود ہے، ضرورت ہے کہ "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کی طرح ان دونوں کتابوں کا ترجمہ بھی اردو زبان میں کیا جائے، تاکہ اردو دان طبقہ کے سامنے بھی ہندوستان کے مسلم ادوار کا صحیح نقشہ آجائے، خاص طور سے موجودہ حالات میں اس کی بڑی ضرورت ہے، خود مصنف مرحوم نے اس ضرورت کا اظہار کتاب کے مقدمہ میں یوں کیا ہے کہ

> "میں نے یہ کتاب تفریحی مشغلہ کے طور پر یا کسی کے دباؤ اور شوق دلانے پر تصنیف نہیں کی ہے، بلکہ میرے نزدیک یہ کام نہایت ضروری اور بقدر استطاعت فرض تھا، پھر وطن عزیز بمنزلہ والدہ کے ہوتا ہے، اسکا بھی حق ہے اور اس سے محبت ناگزیر ہے۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ اس کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس سے مسلمانوں کو واقف کرائیں۔"

یوں تو پوری کتاب ہی "دریا بہ کوزہ" کے مصداق ہے، مگر آخری حصہ جو خطط و آثار پر مشتمل ہے، نہایت اہم ہے، اور کہنا چاہیے کہ یہ رخ اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ مستند و معتبر طریقہ پر پہلی بار سامنے آیا ہے، اس میں مختلف دور کے حکمرانوں کے اصول سلطنت، نظام مملکت، شاہی آداب و رسوم زمینوں کی تقسیم، خراج و عشر کی تشخیص، عدل و انصاف اور قضاء کا طریقہ سرکاری دواوین و مناصب، مرکزی اور صوبائی نظام، فوجی نظام، بری اور بحری طاقت، اصول جنگ، شہور و سنین اور ساعات، نقود، سکہ جات

ناپ تول، اوزان وغیرہ کا بیان نہایت مفصل طریقہ پر کیا گیا ہے، اس کے بعد مسلم حکمرانوں کی فنی و تعمیری اور علمی و دینی خدمات، اس سلسلے کے آثار یعنی مساجد، جوامع، مدارس، شفاخانوں، باغات، نہروں، حوضوں، سڑکوں ڈاک، مشاہد و مقابر، ہیاکل و معابد اور فن تعمیر اور فنون لطیفہ کے عجیب غریب آثار و علائم کا ذکر کیا گیا ہے، شاید اسی لیے مصنف نے اس کا نام جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق رکھا تھا۔

فروری ۱۹۲۳ء میں مصنف کا انتقال ہوا، اور اسی سال علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دار المصنفین اعظم گڈھ سے اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کیا، اور اس کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر دہلی میں عربی ٹائپ پر چھپوانا چاہا، اس کا ایک معتد بہ حصہ چھپ بھی گیا تھا، مگر تاخیر کی وجہ سے مسودہ کا باقی حصہ کیڑوں مکوڑوں کی نذر ہو گیا، جب اس علمی حادثہ کی خبر مصنف مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کو ہوئی تو انھوں نے اسی کرم خوردہ اور ناقص مسودہ کو وہاں سے لیکر بڑی محنت سے مکمل کیا، بلکہ بعد کے واقعات کے سلسلے میں نہایت قیمتی اضافے بھی کیے، اور چونکہ اس وقت طباعت کی امید نہیں تھی، اس لیے بحفاظت رکھدیا، اللہ کی شان کہ اس بار بھی یہ مسودہ کیڑوں مکوڑوں کی نذر ہو کر اس کے صفحات غائب ہو گئے مگر مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد اسے دوبارہ مرتب کیا، اور اپنے بھائی مرحوم ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے زیادات پر زیادات الزیادات لکھکر کتاب کو ہر اعتبار سے جامع و مکمل بنا دیا، اور ساتھ ہی موصوف نے مصنف کے حالات کے بعد ۳۲ صفحات کا بسیط مقدمہ لکھا جو بجائے خود ہندوستان کی اسلامی

تاریخ کا عصارہ اور الہند فی العہد الاسلامی کا خلاصہ ہے،

اس کتاب کے تین حصے یا فنون ہیں، پہلا فن یہاں کے جغرافیائی اور ملکی حالات پر مشتمل ہے، دوسرے فن میں مسلم سلاطین کی مختصر تاریخ ہے، اور تیسرے فن میں خطط و آثار کا بیان ہے،

فن اول ص۱ سے ص۱۲۹ تک ہے، اس میں ایک مقدمہ اور پانچ ابواب ہیں، مقدمہ میں جغرافیہ کے عام اصطلاحی الفاظ و محاورات کی تشریح ہے، باب اول میں ہندوستان کا جغرافیہ، دریا، پہاڑ، آب و ہوا، پیداوار، حاصلات، عطور و بخور، عقاقیر، اشجار و اثمار، جانور، پرند، چرند، معدنیات، مذاہب، زبان وغیرہ کا بیان ہے، باب دوم میں طبعی اور جغرافیائی علاقوں اور خطوں کا تذکرہ ہے، باب سوم میں یہاں کے صوبوں اور ان کے مشہور مقامات اور شہروں کا ذکر ہے، باب چہارم میں فرانس اور پرتگال کے ہندوستانی مقبوضات اور انگریزی کے مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں کی ریاستوں اور جاگیروں کی تفصیل ہے، باب پنجم میں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کے باشندوں کی آبادی اور مختلف مذاہب والوں کے اعداد و شمار درج ہیں،

فن ثانی ص۱۳۱ سے ص۳۲۵ تک ہے، اس میں بڑے سلیقہ اور اختصار کے ساتھ ابتدائے اسلام سے اس دور تک کے مسلم بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کا ذکر ہے، اس حصہ کے مطالعہ سے مسلم حکمرانی کے تمام ادوار سامنے آجاتے ہیں، اس میں دس ابواب ہیں، باب اول میں خلافت راشدہ سے لیکر تیسری صدی تک کے غزوات و فتوحات اور امارات کا اجمالی ذکر ہے، جو زیادہ تر بلاذری کی کتاب فتوح البلدان

کے باب فتوح السند پر مشتمل ہے، باب دوم میں غزنوی اور غوری سلاطین کا ذکر ہے، باب سوم میں سلاطین دہلی کا بیان ہے، جس میں غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور تیموریوں کے حالات بڑی جامعیت کے ساتھ درج ہیں، باب چہارم میں سلاطین کشمیر، باب پنجم میں سلاطین دکن، باب ششم میں سلاطین گجرات، باب ہفتم میں سلاطین شرقیہ جونپور، باب ہشتم میں ملوک مالوہ و مانڈو، باب نہم میں طوائف الملوکی کے دور کے امراء وملوک کا بیان ہے، جن میں ملوکِ سندھ، ملوکِ ملتان، ملوکِ بنگالہ، ملوکِ خاندیس، ملوکِ بیجاپور، ملوکِ احمد نگر، ملوکِ اڑیسہ، ملوکِ گولکنڈہ، ملوکِ برار، ملوکِ بریدشاہی، ملوکِ اودھ، اور بنگال، بہار، اڑیسہ، فرخ آباد، روہیل کھنڈ، نجیب الدولہ شاہی اور میسور کے حکمرانوں اور نوابوں کا ذکر شامل ہے، باب دہم میں تین فصلیں اور تذئیل وتکمیل ہیں، فصل اول میں ہندوستان میں برطانوی سلطنت اور انگریزی تسلط کی تاریخ ہے، فصل دوم میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور فصل سوم میں انگریزی میں ہندوستان کے مسلمان امراء و نوابین کا تذکرہ ہے، تذئیل وتکمیل میں مصنف کے صاحبزادوں ڈاکٹر عبد العلی صاحب اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ۱۹۴۵ء سے ہند و پاکستان کی تقسیم کے بعد تک کے واقعات درج کیے ہیں، جن میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے رو سے ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا عددی تناسب، ہر صوبہ میں ان کی تعداد اور یہاں کی سرکاری زبانوں وغیرہ کا ذکر اختصار اور جامعیت کے ساتھ ہے، جو بجائے خود نہایت اہم اور مفید چیز ہے۔

فن ثالث ص ۳۲۲ سے ص ۳۶۳ تک ہے، اس میں سلطنت کے امور و معاملات، محکمہ جات، عہدہ جات، مناصب، شاہی آداب و رسوم اور نظام مملکت اور کارناموں کا

ذکر نہایت تفصیل سے ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلے باب میں آٹھ فصلیں ہیں۔

فصل اول میں ہندوستان کے نظام حکومت اور دُوَلی قانون کے پس منظر کا ذکر کرکے ملوک ہند کے دو طبقے قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے طبقہ میں ملوک اور غلجی وغیرہ سلاطین کے طرز حکومت اور سرکاری مناصب اور حسب ذیل شاہی محکمہ جات اور ارکان دولت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وزیر، عرض الممالک، حاجب، قاضی، امیرداد، کوتوال، امیر کلید دار، امیر وکیل دار، امیر جامدار، امیر سلاح دار، دیوان عرض، دبیر، مشرف، مستوفی، مجموعہ دار، اقطاع دار، مقطع، آخور بیگی، شحنۂ فیل، شحنۂ عمارت ان تمام عہدوں کی تفصیلات اور ان کے کاموں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے طبقۂ سلاطین میں سلاطین تیموریہ (سلاطین مغلیہ) کے مرکزی اور صوبائی عہدہ داروں اور سرکاری افسروں کی تفصیل درج ہے۔ مرکزی افسر اور ارکان دولت جو سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہا کرتے تھے، اور اس کے نائب کی حیثیت سے امور مملکت کو انجام دیتے تھے، یہ تھے: وکیل مطلق، مدار المہام، دیوان اعلیٰ، میر بخشی، صدر الصدور، قاضی القضاۃ، مفتی لشکر، محتسب، داروغۂ عدالت، دبیر، میر تو زک، میر آتش، میر سامان، خانساماں، داروغۂ خریداری، داروغۂ جواہر خانہ، داروغۂ کتب خانہ، داروغہ غسل خا[نہ]، داروغۂ عرض مکرر، داروغۂ ڈاک چوکی، داروغۂ خاصاں، آخور بیگی، شحنۂ فیل، کوتوال۔ صوبوں کے افسر اور شاہی ملازم یہ تھے، صوبہ دار، بخشی، دیوان (اسکے ماتحت پیشکار، داروغۂ کچہری، مشرف دفتر، تحویلدار، منشی کچہری، حضور نویس، صوبہ نویس، محرر خالصہ، محرر دفتر تن، محرر دفتر باقی، محرر سررشتہ تھے اور یہ سب دیوان کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے)، فوجدار، صدر، قاضی، محتسب، داروغۂ عدالت،

وقائع نگار، کوتوال، تھانہ دار، عمل گزار، خزانہ دار، قانون گو، تیکچی، ان کے علاوہ صوبوں میں اور بھی مزید عہدے ہوتے تھے، مثلاً دیوان سائر (اس کے ماتحت داروغہ، امین کروری، مشرف، تحویلدار ہوا کرتے تھے) دیوان حدائق، دیوان بیت المال، دیوان عمارت، بلغور خانہ، دار الشفاء

فصل دوم میں فوجی نظام کا بیان ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے سلاطین کا فوجی نظام چنگیز خاں کے فوجی نظام سے ماخوذ و متاثر ہے، پھر علاء الدین خلجی، شیرشاہ سوری، سلیم شاہ سیگھ شاہ سوری اور اکبر وغیرہ کے فوجی نظام اور جدید قوانین و اصلاحات کا ذکر ہے، اور یہ کہ شاہجہاں کے دور میں بنگال میں زبردست بحری بیڑا تھا جس میں ایک ہزار جنگی جہاز اور ستر ہزار سپاہی تھے، پھر میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی اور طریقہ جنگ کا بیان ہے،

فصل سوم میں شاہی منصب کا ذکر ہے جو سلاطین کی طرف سے ارکان دولت، امرائے ملک اور مقربین بارگاہ کو بخشا جاتا تھا، مثلاً منصب دہ ہزاری، پنج ہزاری اور دو ہزاری وغیرہ میں بادشاہ کی طرف سے کیسے گھوڑے، ہاتھی، گاڑیاں اور ماہانہ وظائف ملتے تھے،

فصل چہارم میں نظام اراضی اور مالگذاری وغیرہ کے قوانین کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے عہدوں کی تفصیل ہے۔

فصل پنجم میں سلاطین کے عدل و انصاف کے طور طریقہ کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں شیرشاہ کی سیاست کا ذکر خاص طور پر ہے۔ اس کے بعد مغل بادشاہوں کے قانون عدل کے بیان کے ساتھ ان کے دربار عام کا ذکر ہے، جس میں دور دور سے مظلوم اور

دادخواہ آکر عدل و انصاف پاتے تھے، اس سلسلہ میں عدل عالمگیری کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے، اور یہ کہ سب سے پہلے عالمگیر نے دار القضاء اور عدالتوں میں شرعی وکالت کا طریقہ جاری کیا،

فصل ششم میں سلاطین کے قصور و محلات کا ذکر ہے، اور یہ کہ اس ملک کے کن کن سلاطین کے کہاں کہاں شاہی محلات ہیں اور ان کا طرز تعمیر کیا ہے۔

فصل ہفتم میں خاص طور سے بادشاہوں کے دربار عام کی تفصیل درج ہے، اور یہ کہ اس جلوس کے شاہی آداب کیا تھے،

فصل ہشتم میں سلاطین ہند کے جشن اور تہوار کا ذکر ہے۔

فصل نہم میں بادشاہ کے اپنے ملک میں نکلنے کے طور طریقہ کا بیان ہے۔

فصل دہم میں بادشاہ کے سامنے آداب بجا لانے کا ذکر ہے۔

باب دوم میں پانچ فصلیں ہیں: فصل اول میں یہاں کے مہینوں، سالوں اور گھڑیوں کا بیان ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کا خصوصی ذکر ہے۔ فصل دوم یہاں کے نقود اور سکہ جات کے بیان میں ہے، جس میں بڑی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے اور ان کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات درج ہیں۔ فصل سوم میں مقادیر و اوزان کا ذکر ہے، فصل چہارم میں زمین کے اقسام خالصہ، صرف خاص، پائیگاہ، جاگیر، انعام وغیرہ کا ذکر ہے۔ فصل پنجم میں عشر اور خراج وغیرہ کا بیان ہے، اسی ضمن میں یہاں کے بادشاہوں کے مالیات کا ذکر بھی آگیا ہے،

باب سوم میں آٹھ فصلیں ہیں: فصل اول میں سڑک اور ڈاک۔ فصل دوم میں حوض اور نہریں، فصل سوم میں باغات، فصل چہارم میں جوامع اور مساجد

فصل پنجم میں مدارس کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ہے، اور ہر صوبہ اور علاقہ کے مشہور مدارس کے حالات درج ہیں، یہ فصل بہت ہی اہم اور مفید ہے، فصل ششم میں شفا خانوں، اطباء، ادویہ، امراض کی تفصیل کے ساتھ شفاخانوں کے حسن انتظام کا تذکرہ ہے، فصل ہفتم میں بزرگان دین اور امراء و سلاطین کے مقابر و مشاہد کا بیان ہے، اور فصل ہشتم میں یہاں کے امام باڑوں کے بارے میں معلومات ہیں، آخر میں نوادر کے بیان میں فیروز شاہ کی گھڑی، جونپور میں گومتی کا پل جسے اکبر کے زمانہ میں منعم خاں نے بنایا تھا، نظام شاہ کے حکم سے محمد رومی کی بنائی ہوئی توپ، فتح اللہ شیرازی کی بندوق اور اس کی چکی، حکیم علی گیلانی کا لاہور میں حوض اور رنگ آباد کی نہر ہرسول اور دہلی کے لال قلعہ کا حمام درج ہے۔

مطبوعات جدیدہ

صدر یار جنگ ۔ مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، وطباعت اچھی، صفحات ۴۸۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے، پتہ: مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنؤ۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم گوناگوں اوصاف و محامد کے جامع، مسلمانوں کی اجتماعی، قومی و ملی سرگرمیوں میں پیش پیش اور ان کے متعدد مذہبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے منسلک رہے ہیں، ریاست حیدرآباد کے امور مذہبی کے صدر الصدور، علی گڑھ کالج و یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کے رکن رکین تھے، مولانا شبلی مرحوم سے خصوصی تعلق تھے، ان کی وفات کے بعد معارف نے اپنی وضع کے خلاف خاص نمبر شائع کیا تھا، مگر ان کی جیسی ہمہ گیر اور جامع کمالات شخصیت کے لیے مستقل سوانح عمری کی ضرورت تھی، اس کا دین ندوہ اور دار المصنفین کے کارکنوں کے ذمہ باقی تھا، اب دار العلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی توجہ سے یہ ادا ہو سکا ہے، زیر نظر کتاب میں پہلے مولانا شروانی کے خاندانی حالات، ولادت، تعلیم، اساتذہ، بیعت و ارادت، انتظام ریاست، کتب خانہ، قومی و ملی خدمات اور مختلف اداروں سے وابستگی، ازواج و اولاد اور معاصرین و احباب کا تذکرہ ہے، پھر انکے علمی کمالات، ذوقِ ادب، تصنیفات، شمائل و اخلاق اور زہد و اتقاء وغیرہ کا ذکر ہے،

آخر میں متعدد اکابر کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے، اس کو پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ کاش فاضل مقدمہ نگار ہی کے قلم سے پوری کتاب لکھی گئی ہوتی تو اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی، لیکن وہ اپنے عوارض اور مشغولیتوں کی وجہ سے اس سے معذور تھے۔ اس لیے ان کی تجویز و انتخاب سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نوجوان اور لائق رفیق مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے بڑی محنت اور جانکاہی سے مولانا شروانی کے کمالات اور کارناموں کا مرقع تیار کیا ہے، اس سے ان کی سیرت کے گوناگوں جلوے اور شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوجاتے ہیں، مگر اس میں بعض خامیاں ہیں، مولانا کے ستھرے اور پاکیزہ ادبی و تنقیدی ذوق اور شعر و سخن سے دلچسپی کا جس قدر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اتنی تفصیل سے ان کی تاریخ و سیرت نگاری اور علمی بلند پایگی کا ذکر نہیں ہے، مولانا کو دارالمصنفین سے مدۃ العمر جو تعلق رہا ہے، اس کا تقاضا تھا کہ ادارے اور تحریکوں سے ان کی وابستگی کے سلسلہ میں مستقل عنوان کے ماتحت اس کا ذکر ہوتا۔ بعض جگہ پیرایۂ بیان علمی نہیں ہے، مثلاً نواب صاحب کی ڈائری میں سر سید سے ملاقات کا ایک سن ۱۸۹۳ء ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی سر سید سے مل چکے ہوں گے، بہرحال" (ص ۱۷۵)، یہاں اندازہ اور تخمینہ کے بجائے ثبوت اور دلیل کی ضرورت تھی، کیونکہ دعویٰ خود مولانا کے بیان کے خلاف کیا گیا کہ "یونیورسٹی بننے کے پہلے سے کالج کے شعبۂ دینیات سے آپ کا تعلق تھا" (ص ۱۶۶) آخر کس قسم کا تعلق؟ مولانا شعبہ کے صدر تھے، یہاں اس کی تصریح ضروری تھی، "غالباً ایک حدیث قدسی میں ہے کہ ..." ص ۳۰۴، اس حدیث قدسی کی تحقیق ہوسکتی تھی۔ اقتباسات کے نقل میں عموماً بے احتیاطی کی گئی ہے، ایک اقتباس کے ساتھ ہی دوسرا اقتباس

ہ یا ہے، یا خود مصنف نے اپنی تحریر اس میں ملاکر شامل کر دی ہے، مولانا شروانی کے
اصرین میں ڈاکٹر اقبال کو ان سے عمر میں بڑا بتایا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، مولانا شروانی
ر مولانا سلیمان اشرف کے تعلقات کے ضمن میں علامہ سید سلیمان ندوی کے وہ تاثرات
ل کیے گئے ہیں جو انھوں نے مولانا سلیمان اشرف کی وفات پر تحریر فرمائے تھے، اس میں
نوں کے تعلقات کا کوئی ادنی اشارہ بھی نہیں ہے، ص ۴۰۵ پر مولانا کی خوش طبعی کے سلسلہ میں
ھا گیا ہے کہ " تحریروں میں تو انھیں (مولانا کو) اس کے اظہار کا موقع نہ تھا" مگر اسکے بعد
ڈھائی صفحوں تک مولانا کی جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، ان سے انکی خوش طبعی اور ظرافت ظاہر
ی ہے، املا وکتابت کی غلطیاں تو بیشمار ہیں، ص ۴۹۳ پر خورد کو تین تین جگہ خرد لکھا گیا ہے،
ں کہیں سنین بھی غلط لکھے گئے ہیں، مثلاً ص ۱۶۱ پر ۱۹۴۴ء کے بجائے ۱۹۴۶ء ہے، ان خامیوں
طع نظر کتاب بجائے خود محنت اور خوش سلیقگی سے مرتب کی گئی ہے، نواب صاحب کی زندگی
نا پاکیزہ اور دلکش تھی، وہ اپنے عہد کی ہر علمی و اجتماعی بزم کی رونق اور تمام علمی و تعلیمی تحریکوں
روح رواں تھے، اور اس دور کے اکثر اعیان واکابر سے ان کے تعلقات تھے، اس حیثیت
اب گویا اس عہد کی بڑی دلچسپ سبق آموز اور قابل مطالعہ تاریخ ہے،

تصورات بیدل:- از پنڈت کیلاش نرائن کول دہلوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ
کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۹۱، مجلد مع گردپوش، قیمت صر پتہ: ناشر محل، امین آباد، لکھنؤ
یہ آنجہانی پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل کا مجموعۂ کلام ہے جسکو ان کے فرزند پی، این کول صاحب نے
مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے، اسکے شروع میں چند رباعیات و قطعات
آخر میں نظمیں ہیں، مصنف کو زیادہ مناسبت غزلوں سے تھی، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر
ہے، بیدل صاحب شاعری کی قدیم، صالح روایتوں اور اسکے جدید انداز سے واقف تھے، ان کے دردمند دل میں
نیت کا درد وغم، وطن کی الفت و محبت اور موجودہ گراوٹ اور بناوٹ کے خلاف نفرت کا جذبہ موجزن ہے،
انھوں نے غزلوں میں رمز و کنایہ کے پردہ میں غم زمانہ کی حکایت سنائی ہے، مصنف کی زبان کی سادگی،
زبیان کی سلاست اور طبیعت کے سوز و گداز نے انکے تغزل میں بڑی کیفیت اور لطافت پیدا
ی ہے، اور یہ مجموعہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔ "ض"

جلد ۱۱۰ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۲ء عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

دارالمصنفین اس وقت مالی مشکلات سے دوچار ہو رہا ہے، اس کا سالانہ بجٹ تقریباً ایک لاکھ روپے کا ہوتا ہے، اس کے مختلف شعبوں میں چالیس آدمی کام کرتے ہیں، ان سب کی تنخواہیں عام معیار کے لحاظ سے بہت کم ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے خدمتگذار ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے، ان کی قناعت پسندی ضرور قابلِ قدر ہے مگر ادارہ کی طرف سے اُن کو قوتِ لایموت کا جو سامان ہوتا تھا، اس کا بھی اب فراہم کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

دارالمصنفین کو یو.پی یا مرکز کی حکومت کی طرف سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں حکومت کشمیر سے پانچ ہزار سالانہ کی امداد مقرر کرائی تھی، انھوں نے ازراہِ سرپرستی وعدہ فرمایا تھا کہ آیندہ یہ رقم اور بھی زیادہ بڑھوا دی جائے گی، مگر وہ اس رقم کے جاری ہونے کے بعد جلد ہی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ پانچ ہزار کی سالانہ امداد اب تک مل رہی ہے لیکن ہر سال یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں بند نہ ہو جائے نظام ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے پانچسو روپے ماہانہ کی رقم گذشتہ دو سال سے مل رہی ہے لیکن یہ مستقل نہیں ہے، اس ٹرسٹ کو مسلسل امداد دینے کا شاید قانونی حق بھی نہیں، ان قلیل رقموں سے تھوڑا سہارا ضرور مل جاتا ہے، ورنہ اور تمام اخراجات کا بار ادارہ کو خود اٹھانا

پڑتا ہے جو مطبوعات کی فروخت سے اب تک پورے ہوتے رہے ہیں لیکن اس کی فروخت اب بہت کم ہوگئی ہے، اس کے بہت سے اسباب ہیں تقسیم سے پہلے پاکستان میں اب جو علاقے ہیں، وہاں بکثرت وی پی کے ذریعہ سے کتابیں جایا کرتی تھیں تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں وی پی اور منی آرڈر کا بھیجنا بند ہوگیا، تو ایک بڑی آمدنی جاتی رہی، پھر وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ سے کتابیں منگوانے لگے، اس طرح بھی ہماری کتابیں پہلے کی طرح تو نہیں پھر بھی وہاں بہت کافی تعداد میں جایا کرتی تھیں جس سے تقریباً پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی، ۱۹۶۵ء سے جب دونوں ملکوں کا تجارتی لین دین بند ہوگیا، تو گذشتہ سات سال سے ادارہ کو تقریباً اتنی ہی رقم کا سالانہ خسارہ ہو رہا ہے، جو اب تک محض رحمتِ ایزدی سے پورا ہوتا رہا لیکن اب اس ادارہ کی قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے،

ہندوستان میں ہماری مطبوعات کی فروخت اتنی نہیں ہوتی، کہ اس سے ہمارے اخراجات پورے ہوں، ایک تو یہاں کے اردو پڑھنے والوں کی قوتِ خرید کسی زمانہ میں زیادہ نہیں رہی وہ کتابوں کو شوق سے ضرور پڑھتے ہیں لیکن خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتے، پھر جو اصحابِ ذوق خریدنا بھی چاہتے ہیں، تو ان کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی، کہ اپنے اور اخراجات پورا کرکے کتابیں بھی خرید سکیں جن کے پاس کافی دولت ہے وہ کتابوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے ادارہ کی طرف سے اچھی خاصی تنخواہ پر ایک نمایندہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مختلف شہروں میں جاکر اس کی مطبوعات کی فروخت و اشاعت کی کوشش کرے، مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے، اس کی تنخواہ کی گرانباری سے مالی مشکلات کا اور اضافہ ہوگیا ہے،

ہمارے اخراجات دو قسم کے ہیں، ایک تو یہاں کے خدمت گذاروں کو پابندی کے ساتھ ہر مہینہ تنخواہیں ادا کرنا، کیونکہ ان کو جو تھوڑی بہت تنخواہ مل جاتی ہے، وہ بھی نہ ملے تو محض خدمت و ایثار کا جذبہ اب زیادہ کارگر نہیں بنایا جا سکتا، دوسرے نئی مطبوعات میں اضافہ کرنا اور پرانی مطبوعات کو چھاپتے رہنا، الحمد للہ اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے ہر سال کچھ نہ کچھ کتابوں کا پرانا اڈیشن ختم ہوتا رہتا ہے، اگر یہ نہ چھاپی جائیں تو تجارتی آمدنی پر اثر پڑ جاتا ہے، کوشش اب تک یہی رہی کہ پرانی کتابوں کے ساتھ ہر سال کم سے کم دو نئی کتابیں بھی ضرور شائع ہوتی رہیں، ہماری کتابوں کی اوسطاً ضخامت چار سو سے کم نہیں ہوتی، بعض کی ضخامت تو نو نو سو صفحے کی بھی ہے، نئی اور پرانی دونوں کتابوں کی طباعت میں کافی اخراجات ہوتے ہیں جنکو اب پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے،

دار المصنفین اپنی امداد کے سلسلہ میں کسی سے کوئی چندہ یا عطیہ نہیں مانگتا ہے، آج تک اس نے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، وہ صرف اس کا خواستگار ہے کہ اسکی کتابیں زیادہ سے زیادہ خرید کر پڑھی جائیں، اسکے علاوہ اسکی طرف سے دو قسم کی دائمی رکنیت بھی ہے، ایک ایک ہزار کی، اور ایک پانچسو کی، جو صاحب ایکہزار کی رقم دیتے ہیں، اُن کی خدمت میں گذشتہ مطبوعات میں سے پانچسو قیمت کی کتابیں فوراً بھیج دیجاتی ہیں، پھر تاحیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف ہدیۃً بھیجا جاتا ہے، جو صاحب پانچسو کی رقم دیتے ہیں، اُن کے پاس ڈھائی سو کی کتابیں فوراً بھیج کر تاحیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف جاتا رہتا ہے، ہماری اپیل ہے کہ لوگ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کر یا کافی تعداد میں اس کے رکنِ دوامی بن کر اسکی مالی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کریں، ورنہ خدانخواستہ یہ مالی پریشانیوں سے ختم ہو گیا تو جہاں اسکے وابستگان پر یہ الزام آئیگا کہ وہ اس شاندار علمی ادارہ کو برقرار نہ رکھ سکے، وہاں اُردو داں طبقے بھی موردِ الزام قرار پائیں گے کہ وہ ایک مفید ادارہ کو قائم رکھنے میں مدد نہ پہنچا سکے، اس کو برقرار رکھنے میں اُن کی حمیت اور علم دوستی کا بھی امتحان ہے،

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

موجودہ دور میں دنیا کے مسلمانوں کی جو المناک سیاسی حیثیت ہو رہی ہے اس سے کون ایسا مسلمان ہے جس کا دل نہ دکھتا اور کڑھتا ہوگا، خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں میں جو سیاسی اور مذہبی بدحالی بلکہ کردار شکنی اور ضمیر فروشی پیدا ہوتی جا رہی ہے، اس کو سوچ کر عام مسلمان تحیر، اضطراب اور مایوسی کے دور سے گزر رہے ہیں، وہ مڑ کر اپنی پچھلی تاریخ کو دیکھتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ انھوں نے ہندوستان میں رہ کر اپنی حکومت کے زمانے میں اس کو سیاسی، اقتصادی اور تمدنی حیثیت سے کس طرح سنوارا، وہ دورِ غلامی میں بھی بیسویں صدی کے شروع کے زمانہ کو اپنے لیے بڑا تابناک پاتے ہیں، کیسے اچھے اچھے دماغ اس وقت موجود تھے، علامہ شبلی، حالی، نذیر احمد، آزاد سر آغا خاں، سر امیر علی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، خواجہ کمال الدین، سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسین احمد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی،

یہ دور اسلامی جذبہ، اسلامی غیرت اور اسلامی حمیت میں سرشار رہنے کا تھا، شبلی، حالی اور

نذیر احمد کی تحریروں میں اسلام کی رجز خوانی اور حدی خوانی تھی، سر آغا خاں اپنے تعیش اور ڈربی کے گھوڑ دوڑ کی دلچسپی کی وجہ سے بدنام تھے لیکن ان میں جیسی اسلامی غیرت رہی، وہ بھی قابل قدر سمجھی جاتی ہے، سر امیر علی جیسے انگریز نما ہندوستانی مسلمان نے اسلام کی اسپرٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ترکوں کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے، خواجہ کمال الدین نے تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ آئیڈیل پر افق لکھ کر شاید اپنی عاقبت بھی سنوار لی، مولانا حسین احمد مدنی نے سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ حدیث کی سند میں حرف آخر سمجھے جاتے، مولانا شبیر احمد عثمانی سیاسی رہنما بھی بنے لیکن کلام پاک کی تفسیر کے بہت بڑے نکتہ ور عالم بھی تصور کیے جاتے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے لیکن اسی کے ساتھ جو یکتائے علوم اسلامیہ کے فرد بھی قرار دیے گئے، اقبال حکیم الامت اور شاعر مشرق بن کر اسلامی دنیا کے افق پر بھی چمکے، مولانا ظفر علی خاں کی نظموں میں اسلامی اخوت کی للکار اور پکار رہی، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ تو اسلام کی برتری کے مغرورانہ احساس کا صور پھونکا، اور بڑے اذعان ویقین کے ساتھ مسلمانوں کو یہ پیام دیا کہ اسلام ایک روحانی انقلاب تھا جو اس لیے ہوا کہ دنیا تغیر کے لیے بیقرار اور تبدیلی کیلیے تشنہ تھی، وہ سرچشمۂ ہدایت وفیضان الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا، وہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک ظہور الٰہی تھا جس نے نسل آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانے کو یکجا کیا، اور زمین کی امنیت اور سعادت واپس دلایا، مولانا نے اپنی مختلف تحریروں سے مسلمانوں کو یہ کہکر جھنجھوڑا کہ وہ اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتے ہیں، وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ وہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا شیطانی قوتوں کی اسناؤں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری

یر کو خود اپنی گردن کا زیور بنالیں، وہ دنیا میں اس لیے آئے ہیں کہ حاکم ہوں نہ اس لیے کہ
م ہوں، وہ خود ایسی قوت ہیں کہ دوسری قوتیں اس کے آگے جھک کر روحانی وجسمانی
ت پاسکتی ہیں، وہ کسی کے آگے جھکنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے۔

الہلال کے ساتھ مولانا محمد علی کا کامریڈ یاد آجاتا ہے۔ اور پھر ان کی پرشور اور ہنگامہ خیز
ندگی نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے، جس میں صرف توحید کے اذعان اور ایمان کے
اسخ عقیدے ہی کے جلوے نظر آتے ہیں، کچھ روز پہلے اُن کی یادوں کی شمع میرے ذہن
ں کچھ ایسی روشن ہوئی کہ ایک چھوٹا سا مضمون ان پر لکھنے بیٹھا لیکن قلم چلا تو چلتا گیا اور
یک لمبی تحریر کے بعد رکا، جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہے، یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے،
بلکہ میرے ذاتی تاثرات وخیالات کے اوراق پریشاں ہیں، ان میں شاید کوئی نئی بات
نظر آئے صرف پرانی باتیں یاد دلادی گئی ہیں، مولانا محمد علی کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ
سچے اور پکے مسلمان ہونے کے ساتھ سچے اور پکے ہندوستانی بھی تھے ان پر خواہ کتنی ہی
نکتہ چینیاں کی جائیں لیکن ان کی اسلامیت اور ہندوستانیت میں کوئی شبہ نہیں
کرسکتا، ان کی ذات اب بھی یہ پیام ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کی قوس وقزح
سے ملک کی سیاست میں رنگین اور حسین بہار لائی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی یہ بہار نہیں
لاسکتا ہے تو اس کی وجہ اس کی ناقص ذات ہوسکتی ہے، اسلامیت اور ہندوستانیت
مورد الزام نہیں قرار پاسکتی ہے۔

مولانا محمد علی کا اصلی وطن کہاں تھا، مرادآباد یا بجنور، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت
نہیں، اتنا کافی ہے کہ وہ یو۔ پی کے تھے، ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں یتیمی کا داغ
لگ گیا لیکن ان کی والدہ نے جو بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، ان کی تعلیم وتربیت

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی. گھر پر اردو فارسی کی تعلیم دلا کر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کیا، وہاں سے تعلیم کیلیے اپنے بڑے بھائی شوکت علی کی نگرانی میں علی گڑھ بھیجدیے گئے. وہ ایم اے او کالج میں تعلیم پا رہے تھے، تب ہی انکے ساتھیوں کو ان کی عبقریت اور سیمابی کیفیت کا اندازہ ہوگیا تھا، ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چاہتے تھے کہ وہ آئی سی ایس ہو کر خاندان کا نام روشن کریں لیکن خداوند تعالیٰ کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا، انھوں نے لندن جاکر سول سروس کا امتحان تو دیا لیکن اس میں ناکام رہے، ہندوستان واپس آکر پھر آکسفورڈ گئے، جہاں بی اے کی ڈگری حاصل کی، ہندوستان واپس ہوئے، تو رامپور کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے، جس کے بعد بڑودہ کے محکمۂ افیون کے ایک اعلیٰ افسر مقرر ہوئے، یہاں رہ کر اپنی قابلیت دکھائی تو مہاراجہ بڑودہ نے ان کو ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کیا، اس کے بعد بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے، اسی ملازمت کے دوران میں نواب صاحب جاورہ نے ان کو اپنے یہاں وزارت پیش کی، اور بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سکریٹری کا عہدہ دینا چاہا لیکن انھوں نے ان عہدوں سے منہ موڑا، اور طے کیا کہ وہ ایک اخبار نکال کر مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی خدمت کرینگے، چنانچہ ملازمت کی آلائشوں سے نجات حاصل کرکے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ نکالنا شروع کیا، اس کے اجراء سے انکی انگریزی دانی کا سکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی بیٹھا، ان کو اپنی ذہانت کی بدولت انگریزی زبان کے طرز ادا اور طریقۂ بیان کے ہر پیچ و خم سے واقفیت تھی، ان کو انگلستان کے جاہلوں، عالموں، گنواروں، شہریوں، فقیروں، امیروں، مزدوروں اور وزیروں کی گفتگوؤں کے ادا کرنے پر یکساں قدرت اور مہارت حاصل تھی، انگلستان کے ملاحوں

کے نغمے، انّاؤں کی لوریاں، آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں یاد تھیں، انگریزی زبان کے ہر دور کے شاعروں اور ادیبوں کے جواہر پارے ان کی زبان پر تھے، انجیل کی عبارتیں ان کو ازبر تھیں، انگلستان کے لطیفے برجستہ بیان کر سکتے تھے، ان تمام چیزوں کا استعمال وہ کامریڈ میں کرتے رہے، اسی لیے کامریڈ کی اشاعت کے زمانے میں کہا جاتا کہ کوئی ہندوستانی انگریزی زبان پر اُن کی قدرت و مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا آگے چل کر انگریزی زبان کے مشہور مصنف ایچ، جی، ویلس نے کہا کہ ان کا قلم میکالے کا قلم ہے، اسی قلم سے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور سیاسی خیالات کو برانگیختہ کیا، مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کا رنگ کچھ اور تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ کامریڈ نے اپنے مضامین سے جس طرح مسلمانوں کو جگایا، وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں الہلال ہی کی طرح بھلایا نہیں جا سکتا، اس انگریزی ہفتہ وار کے ساتھ مولانا نے اردو کا ایک روزانہ اخبار ہمدرد بھی فروری ۱۹۱۳ء میں نکالنا شروع کیا، خود کہا کرتے کہ ہمدرد تو مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے لیے ہے اور کامریڈ حکومت تک مسلمانوں کی آواز پہنچانے کے لیے ہے۔

کامریڈ کی صحافتی زندگی سے مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی بھی شروع ہوئی، ان کو اپنے زمانہ میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ سے بڑا دکھ ہوا، پھر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو مولانا آزاد ہی کی طرح وہ بھی بے چین ہو گئے اور کامریڈ کے صفحات میں انکی اس بیچینی کا اظہار ہوتا رہا اور جب ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ شروع ہوئی اور ترکوں کی شکست کی خبریں آنے لگیں، تو وہ جذبات سے اتنا مغلوب ہو گئے کہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے، جیسا کہ وہ اپنی ناتمام خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں اس غیر شرعی فعل سے تو وہ باز رہے لیکن ترکوں کی حمایت میں جان

کی بازی لگا دی۔"

ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ان کے یہاں خلافت قائم تھی، تو وہ گویا اسلامی ممالک کے ضمیر کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا اقتدار بلقانی ریاستوں کے علاوہ پورے مشرق وسطیٰ پر بھی تھا، اس لیے وہ ایک امپائر کے مالک تھے، اور اس امپائر کی وجہ سے دنیا میں اسلام کو بڑا وزن اور وقار حاصل تھا، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان سے بڑا لگاؤ تھا، مولانا محمد علی بھی ان کی محبت میں سرشار اور مخمور رہے، اسی لیے انھوں نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکوں کی مدد کے لیے ایک طبی وفد بھی بھیجا، یہ بظاہر ایک طبی وفد تھا لیکن اس کی تشکیل سے بڑا مذہبی اور سیاسی جوش ابھرا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہو رہا تھا تو لکھنؤ بھی آیا، علامہ شبلی بھی لکھنؤ اسٹیشن پر اس کو الوداع کہنے کے لیے پہنچے، اور جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری ٹرین کے ڈبہ کے دروازہ پر آکر کھڑے ہوئے تو مولانا شبلی نے ان کے بوٹ کا بوسہ لیا، اور اپنے آنسوؤں سے اس کے گرد و غبار کو دھویا، مولانا محمد علی اس وفد کے کارناموں کو اپنے اخبار کامریڈ میں برابر چھاپتے رہے، اور جب یہ وفد واپسی میں بمبئی پہنچا تو اس کے استقبال میں مسلمانوں نے ترکوں سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا علامہ شبلی اس وقت بمبئی ہی میں تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کے خیر مقدم کے لیے ان کے پاس پہنچے، تو ان کے پاؤں کا پھر بوسہ لینا چاہا، اور فرمایا یہ تمھارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں، خود علامہ نے ترکوں کی حمایت میں بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھیں، ان میں سے ان کی نظم شہر آشوب اسلام بہت مقبول ہوئی، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے ۔۔۔ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی ۔۔۔ دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے ۔۔۔ عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے ۔۔۔ تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے ۔۔۔ تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی حمایت میں دل کھول کر مالی قربانیاں کیں، انکی امداد و اعانت کے لیے بڑے بڑے شہر میں ہلال احمر کے نام سے ایجنسی قائم تھی، اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات کا خیال رکھتے ہوئے بلقانی ریاستوں کی سیاسی مدد کرنے سے باز رہے، لیکن یوروپین طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا،

مسلمانوں کے مشتعل جذبات ابھی تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی، ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان عجیب کشمکش میں پڑ گئے، ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ حکومت برطانیہ کی حمایت کریں جس کے اندر رہ کر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یا ترکوں کے حامی بنیں جن سے ان کو بڑی محبت اور عقیدت تھی، کیونکہ ترکی ہی میں خلافت قائم تھی، اور ترک ہی پرستارانِ کعبہ اور اسلام کے تمام مقاماتِ مقدسہ کے نگراں و نگہبان تھے، لیکن اس زمانہ کے برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے یقین دلایا کہ وہ اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دار السلطنت یا ایشیائے کوچک کے مشہور اور زرخیز سرزمین یا تھریس سے محروم کر دیں یا مقاماتِ مقدسہ میں عراق، عرب اور جدہ پر قبضہ کریں۔ اس یقین دہانی پر ہندوستان کے مسلمان حکومت برطانیہ کے ساتھ ہوگئے، اور مسلمان سپاہی بھی فوج میں بھرتی ہوئے، لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو لندن ٹائمس

نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ میں دور کے تماشائی ہوں، اس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مضمون بہت ہی حقارت آمیز لب ولہجہ کے ساتھ لکھا گیا تھا، اس کو پڑھ کر مولانا محمد علی بے قابو ہوگئے، اور انھوں نے چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد کامریڈ کے لیے ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے لکھا، جو انگریزوں کے بالکل خلاف تھا، جب یہ مضمون شائع ہوا تو کامریڈ کی ضمانت ضبط کرلی گئی، اس کے بعد مولانا محمد علی اور شوکت علی پہلے رامپور پھر مہرولی دہلی میں نظربند کر دیے گئے، وہاں سے لینسڈون پھر چھندواڑہ منتقل کر دیے گئے، اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا تو دونوں بیتول جیل خانہ میں قید کر دیے گئے۔

اس اثناء میں برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بہت سے ناروا سلوک کیے، رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا، اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اور قانون میں جو عام طور پر احتیاط ہوتی ہے اس میں اس کا نام تک نہ تھا، اس کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، گاندھی جی نے اس کو انسانی آزادی کے بالکل منافی قرار دیا، اور اسکے خلاف اپریل ۱۹۱۹ء میں اپنی ستیہ گرہ کی مہم چلائی، اس سلسلہ میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ہو جہاں بے دردی سے برطانوی حکومت نے گولیاں نہ چلائی ہوں، سب سے زیادہ دردناک حادثہ امرت سر کے جلیان والا باغ میں پیش آیا۔

امرت سر میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی کوششوں سے ہندو مسلمان بہت ہی شیر و شکر ہو گئے تھے، وہاں رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، تو اس میں پچاس ہزار آدمی شریک ہوئے، پھر اس کے بعد رام نومی کا جلوس نکلا تو مسلمان اس میں کثرت سے شریک ہوئے، حکومت کو یہ فضا پسند نہ ہوئی، پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے ڈاکٹر

ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کرکے کسی نا معلوم جگہ پر بھیج دیا۔ اس سے امرت سر کے لوگوں کو بڑا دکھ ہوا، اور وہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر آکر احتجاج کرنے لگے حکومت نے ان پر گولیاں چلا دیں جس سے کچھ آدمی ہلاک ہوئے، یہ مجمع مشتعل ہوکر واپس ہوا، تو بینکوں اور دوسرے سرکاری دفتروں کو لوٹ لیا، اور اُن میں آگ لگا دی، کچھ انگریزوں کو بھی قتل کر ڈالا، اور بعض میموں پر حملے کیے، جس کے بعد جنرل ڈائر نے آکر شہر پر قبضہ کرلیا، ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ میں ایک جلسہ کا اعلان ہوا، جنرل ڈائر نے اسے ممنوع قرار دیا، لیکن اس روز ہندوؤں کا بیساکھی کا تہوار تھا اور میلہ بھی، اس لیے جلیانوالہ باغ کا چھوٹا سا میدان عورتوں، بچوں اور مردوں سے بھر گیا، جنرل ڈائر اس جلسہ کو منتشر کرنے کے لیے وہاں پہنچ گیا، اس نے فوراً اپنے فوجی دستہ کو گولی چلانے کا حکم دیدیا، اور اور اُس وقت تک برابر گولی چلواتا رہا جب تک کہ ان سپاہیوں کے پاس گولی چلانے کیلیے کارتوس باقی رہے، کہا جاتا ہے کہ ۱۶۵۰ گولیاں چلائی گئیں، پانچ چھ سو آدمی ہلاک اور بے شمار اشخاص زخمی ہوئے، یہ جگہ چاروں طرف سے مکانوں سے گھری ہوئی تھی، اس لیے کوئی شخص جان بچا کر بھاگ نہ سکا۔

امرت سر کی جس گلی میں میموں پر حملہ کیا گیا تھا، اس میں سے ہندوستانیوں کے گزرنے کی یہ شرط مقرر کردی گئی کہ وہ وہاں سے گزریں تو زمین کے کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزریں، شہر میں مارشل لا جاری رہا جس کے ذریعہ بڑی سفاکیاں عمل میں آئیں، سر مائیکل او ڈائر اور ڈایر کے وحشیانہ مظالم کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بڑی نفرت پھیلی، اسی کے بعد ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا ایک نیا باب شروع ہوا، برطانوی حکومت کی پالیسی نرم پڑی تو تمام سیاسی قیدی غیر مشروط طور پر

رہا کر دیے گئے، علی برادران جیسے شیرانِ وطن اور فدائیانِ ملت بھی کم وبیش پانچ سال کے بعد نظربندی اور اسیری سے رہا ہوئے، گاندھی جی نے ان کی رہائی سے پورا فائدہ اٹھایا، برطانوی حکومت نے ترکوں کے ساتھ ناروا رویہ اختیار اور علی برادران کو قید کرکے مسلمانوں میں ایسا اشتعال پیدا کر دیا تھا کہ انگریزوں سے ان کی نفرت انتہائی درجہ تک پہنچ گئی تھی، جلیانوالہ باغ کے حادثہ سے عام ہندوستانیوں کو بھی حکومت کے خلاف بڑا غصہ تھا، اس نفرت اور غصہ سے آزادی کی جنگ کے سپاہیوں نے پورا فائدہ اٹھایا، گاندھی جی نے ہندو مسلمان دونوں کے جذبات سے واقف ہو کر ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اس سال امرتسر میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کے ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی رکھے گئے، علی برادران کو بیتول جیل سے رہائی کے بعد امرتسر ہی سیدھے آنے کی دعوت دی گئی، اور وہاں جس شاندار طریقہ پر ان کا استقبال کیا گیا، اس وقت تک کسی اور رہنما کا نہیں ہوا،

پنڈت مدن موہن مالوی جی نے علی برادران کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا، اس کے بعد سے کانگریس کی سرگرمیوں میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا، جیسا کہ جواہر لال نہرو بھی لکھتے ہیں

> "علی برادران اسی زمانہ میں نظربندی سے رہا ہوئے، اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لیے امرتسر پہنچ گئے،۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی" (ص ۴۸ جلد اول)

اسی زمانہ میں لندن میں صلح کانفرنس ہونے والی تھی جس میں ترکی اور جزیرۃ العرب کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے جو فضا قائم ہو گئی تھی، اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ جرمنوں کے ساتھ ترکوں کو بھی شکست ہو جائیگی تو اس شکست کی وجہ سے ترکی کے حصے بخرے کر کے اس کو بالکل کمزور کر دیا جائے گا، اور اس کے امپائر میں سے جزیرۃ العرب

اور دوسرے اسلامی ممالک پر انگریزوں اور یورپی قوتوں کا تسلط ہو جائے گا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اتحادیوں اور انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے، اس لیے مولانا محمد علیؒ نے ہندو مسلمان لیڈروں کا ایک مشترکہ وفد ترتیب دیا جو اُس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملا، اور وائسرائے کو ہندوستان کی مسلم رعایا کے جذبات سے مطلع کیا۔ اس وفد کے ارکان میں مسلمان لیڈروں کے علاوہ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو بھی تھے۔ اس کے بعد یہ طے ہوا کہ جنگ عظیم کی صلح کانفرنس سے پہلے ایک وفد یورپ خصوصاً انگلستان جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو وہاں کی حکومت اور لوگوں کے سامنے پیش کرے، تاکہ وہ خلافت ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابو القاسم صاحب اور سکریٹری جناب حسن محمد حیات صاحب منتخب ہوئے۔ جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہوا تو لوک مانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالویہ، گاندھی جی کی بھی نیک خواہشات اس کے ساتھ تھیں، اور تمام ہندو رہنما بھی اس کی کامیابی کے خواہاں تھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ یہ وفد ہندوستان سے نہ صرف سات کروڑ مسلمانوں کی زبان بن کر گیا بلکہ جب کہ لوک مانیہ تلک آنجہانی نے وفد خلافت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا "وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر فرنگستان گیا تھا، اور حقیقت میں وہ یورپ کی سرزمین میں متحیر، خاموش، ساکن لیکن مضطرب و متقلب دنیائے اسلام کے جذبات و احساسات کا ترجمان تھا۔ اس طرح یہ وفد خلافت دنیائے تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی تنبیہی صدا، توحید

کی جانب سے تثلیث کو نرائے رجز ملکہ جیسا کہ پوپ آنجہانی نے وفد خلافت کے جواب میں کہا کہ وہ مذہب کی طرف سے الحاد کو اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا۔

یہ وفد ۱۹۲۰ء میں انگلستان پہنچا۔ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے وفد کے سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیے وہ اُن کے مکاتیب کے مجموعے برید فرنگ سے معلوم ہوں گے، پھر برادر محترم جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی لکھی ہوئی حیات سلیمان میں بھی تفصیلات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تقریروں کا تعلق تھا، اس کا بار زیادہ تر مولانا محمد علی پر پڑا۔ افسوس یہ ہے کہ یہ تقریریں اردو کی کسی کتاب میں قلمبند نہیں ہوئیں ۱۹۳۹ء میں کلکتہ گیا ہوا تھا، تو وہاں فٹ پاتھ پر کتابوں کے ایک ڈھیر میں All about The Khilafat delegation مل گئی۔ اس کے مطالعہ سے وفد کی ساری سرگرمیاں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

انگلستان پہنچکر اس وفد نے پہلے اُس زمانہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو سے ملنا چاہا، مسٹر مانٹیگو تو خود نہ ملے کہ وہ علیل تھے، لیکن ان کی طرف سے مسٹر فشر، سر ولیم ڈیوک مسٹر جے، ای شاک برگ اور مسٹر ایس، کے براؤن ملے، اس ملاقات میں مولانا محمد علی اور سید حسن نے بڑی مدلل تقریریں کیں، ان کا مطالبہ تھا کہ خلیفہ کے ماتحت اسلام کے تمام مقدس مقامات برقرار رکھے جائیں، جزیرۃ العرب پر بھی خلیفہ کا تسلط ہو، اور وہاں اتحادیوں کا کوئی حلیف اور پٹھو حکمراں نہ بیٹھایا جائے، خلیفہ کو مضبوط اور طاقتور برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سلطنت سیاسی، بحری، اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہو، اس لیے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے نہ کیے جائیں، مولانا

محمد علیؒ نے ان مسائل کو اپنی ایک پرزور تقریر میں پیش کیے جس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اس تقریر کا اصلی لطف تو انگریزی ہی میں پڑھنے سے مل سکتا ہے کہ مولانا اس زبان پر غیر معمولی قدرت رکھنے کی وجہ سے اپنی تقریر میں کیا کیا رنگ ڈھنگ پیدا کرسکتے تھے۔ جملوں کے اندر جملے لاکر اپنے مطلب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے تھے، پھر اس میں ایسی روانی ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ ایک بہتا ہوا چشمہ ہے جو بہتا چلا جاتا ہے، تقریر کے اردو ترجمے میں وہ لطف نہیں مل سکے گا۔ لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا تقریر کرتے وقت کس طرح ابلتے، امنڈتے، پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے، جو کچھ کہتے نڈر ہوکر کہتے، اور اپنے ایمانی جوش، مذہبی غیرت اور ملی حمیت کا اظہار کرتے وقت بالکل نہ جھجکتے۔ اس کے اظہار ہی کو اپنی دنیاوی اور اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے، ان کی تقریروں سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ پہلے مسلمانوں کی قیادت کا کیا رنگ تھا، اور موجودہ دور میں کیا ہوکر رہ گیا ہے، مولانا نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ غالباً اس بات سے واقف ہیں کہ امرتسر میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس اس سال کے شروع میں ہوا جس میں دوسری بار یہ تجویز منظور ہوئی کہ پہلے ایک وفد یورپ اور امریکہ جائے تاکہ مسلمانوں کے نقطہ ہائے نظر بادشاہ سلامت کی حکومت، اتحادیوں اور صلح کانفرنس کے سامنے پیش کیے جائیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی احساسات اور جذبات سے آگاہ کرکے انکی پوزیشن کی وضاحت کیجائے، اور یہ بھی ظاہر کیا جائے کہ ہندوستان کی کثیر رائے عامہ ہندوستانی مسلمانوں کی تائید میں ہے،

"ہم لوگوں کو صحیح طور پر اس کا علم نہیں تھا کہ صلح کانفرنس کب شروع ہو گی اور ترکوں سے کیا معاہدے ہوں گے، وائسرائے نے تو ہمارے سپاسنامہ کے جواب میں اپنے اس خطرہ کا اظہار کیا تھا کہ ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں اتنی تاخیر سے پہنچیں گے کہ مشکل سے ہماری شنوائی ہو گی، اسی لیے جب ہم ۲۲ فروری کو وینس پہنچے تو وہاں سے ہم نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور وزیر اعظم کو تار بھیجے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو کہنے سننے کا موقع دیا جائے، اب ہم یہاں ہیں، ہم اس کے شکر گذار ہیں کہ مسٹر مانٹیگو کی طرف سے ہمارا استقبال ہو رہا ہے، اگرچہ مسٹر مانٹیگو کی علالت کی خبر پا کر ہم لوگوں کو افسوس ہوا،

اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے پہلے ہم یہ ظاہر کر دیں کہ جب ہم یہاں پہنچے، بلکہ یورپ کے سفر کے دوران ہی میں ہم نے محسوس کیا کہ آرمینیوں، یونانیوں اور ترکوں کے دوسرے مخالفوں کی طرف سے یہ پروپگنڈا ہو رہا ہے کہ ترکوں کی طرف سے بہت ہی ہولناک اور اشتعال انگیز جرائم سرزد ہوئے، ہم صاف طور پر یہ کہدیں کہ ہم اس طرح کے پروپگنڈے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ اس کے لیے نہ ہمارے پاس سرمایہ ہے نہ وہ اخلاق ہے اور نہ ایسے پروپگنڈے کے ذرائع ہیں، اس کے علاوہ اس وقت ترکوں کے بارے میں براہ راست معلومات کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس لیے ہم ان شدید الزامات کی تصدیق بھی نہیں کر سکتے جو ان پر عائد کیے جا رہے ہیں، لیکن فروری ۱۵، ۱۶ کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا جو آخری اجلاس ہوا تھا، اس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد ایشیائے کوچک، اور خلافت کے اندر جو علاقے ہیں وہاں جائے، اور جب یہ وہاں پہنچ جائے تو وہاں کے قتل عام کی جو خبریں ہیں، انکے سچ اور جھوٹ ہونے کی تصدیق کرے،

"ہمارے لیے یہ ایک مذہبی سوال ہے، ہم تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ واضح کر دیں کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بڑا اہم مذہبی معاملہ ہے، کہیں کہیں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی حکومت اور اتحادیوں پر اپنا فیصلہ نافذ کرائیں، جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں فیصلہ نافذ کرانے یا دھمکی دینے کا کوئی شائبہ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ترکی کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا، اس کا تعلق امپیریل پالیسی سے ہے یا صرف برطانیہ سے ہے، اگر اس کا تعلق صرف برطانیہ سے ہے تو پھر ہم کو کچھ کہنے کا حق نہیں رہتا، لیکن اس کے برخلاف اگر پورے برطانوی امپائر سے ہے اور بظاہر ہے، تو پھر اگر ہندوستانی مسلمان اپنا فیصلہ نافذ کرانے کا حق نہیں رکھتے، تو یہ حق برطانیہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا، یہ پورے امپائر کا ایک مشترکہ معاملہ ہونا چاہیے، ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اب صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ بادشاہ سلامت کی رعایا کی حیثیت سے ہم اپنے فرائض میں کوتاہی کریں گے اگر ہم یہ ظاہر نہ کریں کہ اب معاملہ کی صورت کیا ہے،

یہ محض مسلمانوں کے جذبات کا سوال نہیں جو کسی کی خواہش کے مطابق بدل کر رکھ دیا جائے، یہ ایک مذہبی سوال ہے جس کا تعلق مذہبی عقیدہ سے ہے، خلافت کا سوال ہمارے عقیدہ کا نہ صرف ایک حصہ ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سراسر ہمارا مذہبی عقیدہ ہے، خلافت ان دنیاوی اور روحانی سرگرمیوں کو متحد کرتی ہے، جو اسلام کی تعلیم ہے، ہمارے رسولؐ کی وفات کے بعد سے خلافت قائم ہے، اور اس کو ہر زمانہ میں قائم رہنا چاہیے، اسلام میں صرف روحانی پیشوائی کی قسم کی کوئی چیز نہیں، اسلام اتھکس کا حرف آخر ہے، یہ ہمارے تمام کاموں کی رہنمائی کرتا ہے، مسلمانوں کی زندگی کا ہر کام ایک مذہبی کام ہے

ہم بادشاہ سلامت کے ساتھ جو خدمات انجام دیتے ہیں، ان میں بھی مذہبی احساسات ہوتے ہیں، ہم اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں، وہ بھی مذہبی فرائض میں سے ہے، اس لیے دنیاوی اور روحانی قیادت کی تفریق کرنا درست نہیں، خلیفہ پوپ سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے، اس سلسلہ میں جو غلط فہمی ہے، اس کو دور کرکے ہم خلافت سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں،

"ایک ایسا ادارہ جو دنیاوی اور مذہبی دونوں ہو، اس کو برقرار رکھنا اسلام کے لیے لازمی ہے، خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ اسکو دنیاوی اقتدار بھی حاصل ہو تاکہ وہ ہمارے مذہب کی مدافعت کر سکے۔ یہ اقتدار وقتاً فوقتاً اس کے دشمنوں کی قوت کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ اقتدار اتنا کم نہ ہو کہ یہ بے اثر ہو جائے، ہمارا خیال ہے کہ بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کے اقتدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو وقار کے ساتھ نہ برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ وہ موثر طریقہ پر اپنے دین کا حامی بن سکتا ہے، اسی لیے ہم اس کو پہلے جیسی پوزیشن پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے بغیر وہ امیر المومنین نہیں ہو سکتا، اور نہ ہمارے دین کو خطرے کے وقت بچا سکتا ہے،

"ہم سیاسی اور علاقائی تبدیلیوں کے مخالف نہیں ہیں، ہم کو اس پر اعتراض نہ ہوگا اگر صلح کانفرنس کے رو سے ٹرکش امپائر کے غیر ترکی فرقوں کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان یا یہودی خود مختاری دیدی جائے۔ یہ صدر ولسن کے چودہویں نکات کی بارہویں دفعہ کے مطابق ہوگا، لیکن ایسی خود مختاری دیتے وقت عثمانی سلطنت کے وقار اور اقتدار اعلیٰ کو ضرور قائم رکھا جائے،

"خلافت کو دنیاوی اقتدار کے ساتھ برقرار رکھنے کے علاوہ جزیرۃ العرب کا بھی سوال ہے،

یورپ کے جغرافیہ دانوں کے لیے عرب محض ایک جزیرہ نما ہے، جو چاروں طرف سے زمین سے گھرا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک جزیرہ ہے جس کی چوتھی سرحد کی طرف دجلہ اور فرات ہے، اس میں حجاز، یمن، نجد اور عرب کے دوسرے صوبے ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ اس میں شام، فلسطین اور اس کے ملحق علاقے بھی داخل ہیں، اور یہ ہمارے رسول کا حکم صریح ہے کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کا تسلط نہ ہو، یہ خیال کیا جارہا ہے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے عیسائیوں کو ان علاقوں کا اقتدار سپرد کر دیا جائے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے ہم ہندوستان کی حکومت، پھر برطانیہ کی حکومت پر یہ واضح کر دیں کہ کوئی مسلمان اس کے لیے رضامند نہیں ہوگا، کسی مسلمان کا ضمیر یہ گوارا نہیں کرسکے گا،

مولانا محمد علی کی تقریر کے درمیان مسٹر فشر بول اٹھے کہ اگر مسلمانوں کا ضمیر فلسطین اور شام پر عیسائیوں کا تسلط نہیں گوارا کرسکتا ہے، تو پھر مسلمانوں کا ضمیر ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کیسے گوارا کیے ہوئے ہے، اس کا جواب مولانا محمد علی کے ساتھی سید حسین نے دیا کہ دونوں جگہوں میں فرق ہے، عرب میں مقامات مقدسہ ہیں، اسی لیے ان پر غیر مسلموں کا قبضہ گوارا نہیں کیا جاسکتا،

اس کے بعد مولانا محمد علی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھکو افسوس ہوگا اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے قسطنطنیہ کی اہمیت کم ہو، کیونکہ یہ پانچ صدیوں سے خلافت کا مرکز رہا ہے، اس کی اہمیت کو کم کرنا مسلمانوں کے جذبات کو اس لحاظ سے مجروح کرنا ہے کہ وہ دارالاسلام کے کسی حصہ کو ہاتھ سے جانے دے سکتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا جائے تو اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو جزیرۃ العرب پر غیر مسلموں کے تسلط سے ہوگا، یہ علاقہ غیر آباد سہی لیکن قرآنی آیتوں کی رو سے یہ پیغمبروں

کی سرزمین ہے۔ اسی لیے اس پر اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار ہونا چاہیے ہم اپنے کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا روحانی وارث سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اس علاقہ کو مقدس سمجھکر اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، ہم اس کے تقدس کو برقرار رکھنا لازمی تصور کرتے ہیں، اور یہ بھی کہ یہ علاقہ پرامن ہو، مومنوں کا مرکز ہو، اور یہاں مذہبی حکومت آسانی سے قائم ہوتی رہے، اس کے تقدس اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہے، وہ دن ہمارے لیے بہت ہی خطرناک ہوگا جب اس کا کوئی حصہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہے گا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے خدائی احکام کی پابندی ہونے نہیں دی، اس لیے مسلمان کسی حال میں اس کو پسند نہ کریں گے کہ جزیرۃ العرب پر کسی غیر مسلم کا تسلط ہو۔

"مقامات مقدسہ کے بہت سے مذہبی احکام ہیں، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس ہمیشہ خلیفہ کے زیر اقتدار ہوں کسی اور کا تسلط مسلمانوں کا ضمیر گوارا نہیں کرسکتا مسلمانوں کا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ نجف، کربلا، کاظمین سامرا اور بغداد کا بھی نگران خلیفہ ہی ہو، ان پر غیر مسلموں کا اقتدار تو کسی حال میں بھی جائز نہیں، اس لیے مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور تمام مقدس مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہییں، جیسا کہ جنگ سے پہلے تھے، کیونکہ یہ سب جزیرۃ العرب میں واقع ہوئے ہیں جسکے ہر حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار ہونا ضروری ہے، اگر یہ خلیفہ کی نگرانی میں ہو جائیں تو نہ صرف ایک مذہبی ضرورت پوری ہو جائے گی، کیونکہ اس طرح خلافت کو وہ دنیاوی قوت بھی حاصل ہو جائے گی جو ہمارے دین کی مدافعت کے لیے ضروری ہے بلکہ اسی کے ساتھ وزیر اعظم کا وہ وعدہ بھی پورا ہو جائے گا جو انھوں نے جنوری ۱۹۱۸ء کو کیا تھا، اور صدر ولسن کے چودہ نکات کی بارہویں دفعہ کی آبرومندانہ تکمیل بھی ہو جائیگی

جس کی بنیاد پر ترکی سے صلح کی گئی تھی، پھر مسلمان بھی خوش ہوں گے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا احترام باقی رکھ کر خلافت کی پہلی جیسی پوزیشن قائم رکھی گئی، ہمارا یہ وفد پھر مطمئن ہو جائے گا، کہ خلافت دنیاوی اقتدار اور کافی علاقے کے ساتھ باقی رکھی گئی، اگر ضرورت سمجھی جائے تو خلیفہ سے اچھی حکومت، زندگی کے تحفظ، مذہب میں رواداری اور علاقوں میں خودمختاری کی ضمانت بھی لی جائے، بشرطیکہ یہ خلیفہ کے وقار اور آزادانہ اقتدار اعلیٰ کے عین مطابق ہو،

"یہاں پر میں یہ عرض کروں گا کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ اتحادیوں اور انکی حکومتوں کی رعایا کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سے وفاداری کا ثبوت دیں، لیکن ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خلافت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیں، ہم یہ نہیں چاہتے اور نہ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم جس سیاسی پوزیشن میں ہیں، اس سے دور ہو جائیں، لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم حکومتوں کی غلط روش کی وجہ سے ایسے پریشان کن حالات میں ڈال دیے جائیں کہ خلیفہ کی حکومت کی طرف سے ہم پر جو فرائض ہیں ان کو انجام نہ دے سکیں، اگر ہم سے ایسے مطالبے کیے جائیں گے جو ہماری نجات کے منافی ہونگے تو پھر ہم اپنی پوزیشن پر از سرنو غور کریں گے،

"جہانتک اس ملک میں ترکوں کے خلاف پروپگنڈا کا سوال ہے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترکوں پر ان کے جرائم عائد کرتے وقت بہت سے ایسے مذہبی اور نسلی تعصبات بروئے کار آجاتے ہیں جو صدیوں سے ان کے خلاف ہیں، اس پروپگنڈا میں اس حریصانہ خواہش کو بھی دخل ہے جس کی بنا پر ترکوں کے ہمسائے عثمانی علاقوں کو زیادہ سے زیادہ ہضم کرنا چاہتے ہیں، ہم کم سے کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترکوں کے جرائم کو پیش کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے،

عیسائی دنیا کے بعض حصوں میں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے اس لیے نکال دینا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف ترک ہیں بلکہ مسلمان ہیں، اسلام ان کے لیے ایک ناگوار چیز ہے، ہم کو ان گہرے تعصبات کو دور کرنا چاہیے، اور اسلام کے ساتھ جو مجرمانہ رویہ ہے، اس کو بھی بدلنے... کی ضرورت ہے۔ ہم مسلمان کی حیثیت سے اسکے بھی خواہاں ہیں کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کسی قسم کے شکوک نہ ہونے چاہئیں یہاں تک ترکوں کے کردار کا یقین ہے، وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو پیش کیجاتی ہے۔ ہم یہاں پہ گرجاگھروں کے ان فتنہ انگیز اور تعصب آمیز پروپگنڈا کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو ترکوں کے خلاف عرصہ سے جاری ہے۔ ہم یہاں آکر کوئی تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ترکوں کو غیر جانبدارانہ طور سے مطالعہ کرنے کی خاطر ان سازشوں کی تفتیش کرنے کی ضرورت ہے جو ترکوں کے دشمن ان کے خلاف دو صدیوں سے ان کی عیسائی رعایا میں اس لیے کر رہے ہیں کہ یورپ اور ایشیا میں عثمانی امپائر کے حصوں کو کاٹنے میں کامیابی حاصل ہو، یہ بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترکی میں رہنے والی عیسائی آبادی کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ہمسائگی کا ہے یا اشتعال انگیز ہے، اور اگر ترک قابل الزام تھے تو ان کو کافی سبق مل چکا، اور جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کیا گیا اور ترکوں سے ان کی توقع کے مطابق سمجھوتہ کیا گیا تو پھر وہ ترکوں پر اثر انداز ہوں گے کہ وہ حکومت برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے اچھے تعلقات رکھیں، ہندوستانی مسلمان ترکوں پر یہ دباؤ بھی ڈالیں گے کہ جن ہولناک جرائم کے الزامات ان پر رکھے جاتے ہیں، وہ نہ صرف ان سے سرزد ہوں، بلکہ دوسروں کے دلوں میں ان کے شکوک بھی پیدا نہ ہوں مسلمانوں کی حیثیت سے

ہمارا یہ فرض ہے کہ اسلام کی نیک نامی پر غیر انسانی حرکتوں کا داغ نہ لگنے پائے، برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسلام کے اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کریں گے، ہندوستانی مسلمانوں کے ان اثرات سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، ہمارے مشن دو قسم کے ہیں، ہم بادشاہ سلامت کی حکومت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں، اور ہم پھر اپنے خلیفہ کو بھی معاملات سے آگاہ کریں کیونکہ وہ ہمارے امیر المومنین ہیں، ہم ان دونوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں، اگر خلافت کے معاملہ میں ہماری خواہش کے مطابق سمجھوتہ ہوا تو ہمارے اثرات اچھے قائم ہوں گے جو برطانوی امپائر اور انسانیت کے مفاد کی خاطر استعمال کیے جاسکتے ہیں، لیکن اگر ایسا سمجھوتہ ہوا جو ہمارے جذبات اور مذہبی احساسات کے خلاف ہوا تو ہم کوئی ایسے الفاظ تو استعمال نہیں کریں گے جو دھمکی پر محمول کیے جائیں لیکن ہم صاف طور پر کہدیں کہ ہم اپنے مذہبی فرائض کو پہلے اہمیت دیں گے۔

”بادشاہ سلامت کی حکومت ہندوستان سے دور واقع ہوئی ہے، اس کا مذہبی اور سیاسی ماحول بھی مختلف ہے، اس لیے ہندوستان میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اسکا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل ہے، میں حکومت ہند اور اس کے حکام کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا، انھوں نے ہمارے وفد کا خیر مقدم بڑے اخلاق سے کیا، اور انھوں نے ہم کو ہندوستان سے یہاں تک پہنچنے میں سہولتیں فراہم کیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ سرکاری حکام ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہمارے دلوں کے اندر کیا ہے، میری زندگی کے اوراق اس طرف کم و بیش سادہ اس لیے رہے ہیں کہ میں نے قید اور نظر بندی کی زندگی گزاری ہے، لیکن جناب عالی! میں آپ کو یقین

دلاتا ہوں کہ جب ہم جیل سے باہر آئے اور اپنی آنکھوں سے حالات دیکھے تو ہم پر شاق گزرا کہ رہائی کے بعد اب حالات کیا ہو گئے ہیں، ہندوستان میں اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں کہ جس نے اس کو پانچ سال پہلے دیکھا تھا وہ اس کو مختلف صورت میں پائیگا، یہاں ایسے تغیرات ہو گئے ہیں کہ جو معاملات برسوں میں طے ہوتے تھے اب مہینوں میں طے پائیں گے، ہندوستان کے سرکاری حکام یہاں کے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ترکوں کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے میں مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال نہیں رکھا گیا تو پھر معاملہ بہت ہی خطرناک ہو جائیگا، میں انگریز نہیں ہوں اور نہ انگریزوں کی طرح انگریزی جاننے کا دعویٰ کرتا ہوں، اس لیے مجھکو ڈر ہے کہ جو میں الفاظ استعمال کروں، ان سے ایسے مطالب نکالے جائیں جو میرے ذہن میں نہ ہوں، میرے لیے اپنے خیالات کی تصریح کرنا تو مشکل ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب ہم لوگ یہاں آئے تو دارالعوام میں قسطنطنیہ پر مباحثہ سننے کے لیے گئے، کرنل ویجوڈ نے اپنی بحث میں کہا کہ تم انگریزوں کو قائل کر کے ان سے بہت کچھ لے سکتے ہو لیکن ان کو دھمکی نہ دو، جناب عالی! یہ بات ہر خوددار قوم کے لیے ضروری ہے، اور جب انگریزوں کے لیے ضروری ہے تو جناب عالی! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے بتائیں کہ سخت سے سخت انتباہ کس طرح کیا جائے کہ وہ دھمکی پر محمول نہ ہو۔"

مولانا محمد علی کے بعد سید حسین نے تقریر کی، جس میں انھوں نے اپنے رنگ میں وہی ساری باتیں کہیں جو مولانا محمد علی کہہ چکے تھے، انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کے ہندو بھی خلافت کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، پھر مولانا محمد علی اور سید حسین دونوں نے اس منشور کی تفصیل بتائی جو گاندھی جی کی نگرانی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس میں منظور ہوا تھا، دونوں نے یہ بتایا کہ جس وقت یہ منشور

پیش ہوا تو گاندھی جی نے علماء سے جرح کرکے اپنے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کا یہ مذہبی مسئلہ ہے لیکن ہندوؤں کو اپنے ہموطن مسلمانوں کے اس مسئلہ میں اس لیے ساتھ دینا چاہیے کہ اگر ہندوؤں پر اسی قسم کا مشکل وقت آیا تو مسلمان بھی ان کا ساتھ اسی طرح دیں گے، اس کے بعد برطانوی حکومت کے نمایندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جو اس لیے یہاں پر پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ انگریز اپنی فتنہ انگیزیوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر کیسے خوبصورت انداز سے پردے ڈال کر اپنی مطلب برآری کر سکتے ہیں، اور پھر کیسے میٹھے اور ملائم الفاظ میں سخت سے سخت باتیں بھی کہنے کے عادی رہے ہیں، وہ الفاظ اور جملوں کے جال میں اپنے مخاطبین کو پھنسا کر رکھ دینے میں کیسے ماہر ہوتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مسلمانوں کے تمام مقاماتِ مقدسہ پر جزیرۃ العرب کا کیسے تسلط ہو سکتا ہے، کیونکہ میرے تصور میں یہ بات ہے کہ مسوپوٹومیا کے مقامات مقدسہ تو صرف شیعوں کے لیے مقدس ہیں اور شیعے خلیفہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

مولانا محمد علی نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان مقامات مقدسہ کا احترام مسلمانوں کے تمام فرقے کرتے ہیں، سنی مسلمان بھی ان کی زیارت کو جایا کرتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ لیکن یہاں زائرین میں زیادہ تر شیعے ہی ہوتے ہیں، سنی مسلمان وہاں جانا شیعوں کی طرح ضروری نہیں سمجھتے،

اس کے بعد رائٹ آنریبل مسٹر فشر بولنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا آپ لوگ بہت دور دراز کی مسافت طے کرکے اپنے معاملات کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، آپ نے اپنی انگریزی دانی پر معذرت کی، لیکن اس

معذرت کی ضرورت نہ تھی، آپ نے اپنے معاملے کو پوری وضاحت کے ساتھ اچھی طرح پیش ملکہ میں یہ کہوں گا کہ بڑے اعتدال سے پیش کیا ہے، برطانوی حکومت کو اس کا احساس ہے کہ گذشتہ جنگ میں دس لاکھ ہندوستانی سپاہیوں نے بڑی قیمتی مدد پہنچائی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان سپاہیوں میں بہت سے مسلمان تھے، برطانوی حکومت کو ان مسلمان فوجیوں کے جذبات کا بھی احساس ہے، جو ان کی خاطر جنگ میں لڑے۔ ہندوستان کی وفادار مسلمان رعایا کے احساسات کا بھی خیال ہے، اور آپ یقین جانیں کہ ہم لوگ آپ کے ہم مذہبوں کے مذہبی جذبات و احساسات کو پورے طور پر ملحوظ رکھیں گے، اور جو بھی بین الاقوامی سمجھوتہ ہوگا، اس میں ہندوستان کے لوگوں کے خیالات بھی سامنے رکھے جائینگے، اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ حال ہی میں اتحادیوں اور ان کی حکومتوں کی طرف سے قسطنطنیہ پر ترکوں کے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرنے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، اس میں ہندوستان کی مسلمان رعایا کے مذہبی جذبات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ یہ مسئلہ اہم ہے، برطانوی حکومت بھی اس مسئلہ کو نظرانداز نہیں کرے گی لیکن برطانوی حکومت کے وزراء کے سامنے یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم نہیں ہے، ان کو اور بھی دوسری پیچیدگیوں کو سامنے رکھنا ہے، اس مسئلہ کے ساتھ اور بھی مسائل ہیں، آپ خود اچھی طرح واقف ہیں، ترکی امپائر کی رعایا کا خیال بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں کہ اس ملک پر سلیشیا کے قتل عام پر بڑا تکلیف دہ ردعمل ہوا ہے، اسی لیے یہ مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے، پھر بھی برطانوی حکومت جس نتیجہ پر پہونچے گی، اس میں ہندوستان کی مسلم آبادی کی خیرسگالی کا خیال ضرور رکھے گی، اور آپ یقین جانیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے حکومت اس پر مناسب طور پر غور کرے گی، مسٹر محمد علی! آپنے اپنی تقریر کے الفاظ میں بڑی خوبی سے اس کی احتیاط کی ہے کہ دھمکی کی زبان استعمال نہ کیجائے، اور

آپ نے اس طرح دانشمندی سے کام لیا ہے، آپ کو قومی کاموں کے سلسلہ میں اس کا پورا تجربہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنی حکمت عملی میں تمام معاملات کو سامنے رکھتی ہے اور اس میں دھمکی سے ایک انچ کی تبدیلی نہیں کرسکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ برطانوی امپائر کی وفادار رعایا مخلصانہ اور ایماندارانہ طور پر کوئی بات کہتی ہے تو حکومت اس پر پورے طور پر غور کرتی ہے، مجھکو افسوس ہے کہ اس دفد سے سکریٹری آف اسٹیٹ کی ملاقات نہیں ہوسکی، وہ ملنے کی خواہش رکھتے تھے، اور نہ ملنے سے ان کو مایوسی ہوئی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ اس وقت علیل ہیں، اسی لیے میں انکی نمایندگی کررہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کے ہندوستان جانے سے پہلے آپ کو وزیراعظم سے ملنے اور ان کے سامنے معاملات کو پیش کرنے کا موقع ملے گا، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ایک کانفرنس ہورہی ہے، وزیراعظم ڈاوننگ اسٹریٹ میں اتحادیوں کے مدبروں سے مل رہے ہیں اور بہت سے اہم معاملات زیربحث ہیں، مسٹر لائڈ جارج اس وقت بہت مشغول ہورہے ہیں، میں وعدہ نہیں کرسکتا ہوں کہ وہ آپ سے ملیں گے لیکن مجھکو امید ہے کہ وہ آپ سے مل سکیں گے۔

حضرات: میں صرف ایک بات کہنے کو آیا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ایک فلسفی نے کہا ہے کہ تاریخ دوسری بہتر چیز کو قبول کرنے کا نام ہے، ہم جو کچھ چاہا کرتے ہیں، وہ تو سب نہیں حاصل ہوا کرتا، لیکن آپ یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ان خیالات پر مناسب طور پر ضرور غور کرے گی جو برطانوی امپائر کی رعایا کی طرف سے وفادارانہ اور مخلصانہ طور پر ظاہر ہوں گے،

مولانا محمد علی اس جواب سے خوش نہ تھے، بلکہ شاید تلملا اٹھے، اور وہ ان قائدین میں تھے جو اپنی تلملاہٹ کو ضبط نہیں کرسکتے تھے، اس لیے اس کا جواب دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی انگریزوں ہی کی طرح انگریزی زبان کے لفظوں، فقروں اور جملوں سے کھیل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ماہر تھے، اس لیے مسٹر فشر کو مخاطب کرکے بولے :-

"کیا مجھکو اس شکریہ کے ادا کرنے کی اجازت ہے جو اس وفد کے استقبال میں وسعتِ قلب دکھائی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں. میرا خیال ہے کہ ہم میں ہر شخص سمجھتا ہے، ہندوستان کا ان پڑھ بھی سمجھ سکتا ہے کہ صرف ہماری خواہشات اور جذبات ہی کو اس قسم کے مسئلہ کو طے کرنے میں ملحوظ رکھا جائے گا، لیکن ایک بات ہے جس کی طرف بالکل توجہ نہیں دیجارہی ہے اور ہم لوگ اسی پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے بعض مذہبی اعتقادات ہیں جنکی نوعیت ایسی ہے کہ ہم ان ہی کو اولیت دینا پسند کرینگے، اور چونکہ ہماری وفاداری کا تعلق ان ہی مذہبی اعتقادات سے ہے اسلیے بادشاہ سلامت کی حکومت کو بھی ان مذہبی اعتقادات کو اولیت دینا چاہیے، یہ سچ ہے کہ زندگی دوسری بہتر چیز کے انتخاب کا نام ہے اور مفاہمت سیاست کا اہم جز ہے، اس کا احساس رکھتے ہوئے ہم نے اپنے مطالبات پیش کیے ہیں، اتحادیوں اور اُنکی حکومتوں کے بیان سے ہم کو امید ہو چلی تھی کہ ایک نئی دنیا اور نیا آسمان قائم ہونے والا ہے اور جن علاقوں پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کرلیا گیا ہے، ان کو ان کے جائز حقداروں کو واپس کر دیا جائیگا، اس طرح ہم یہ مطالبہ کرتے کہ مصر، طرابلس، بوسنیا، ہرزگووینا، کریٹ اور ترکی کے وہ علاقے جو بلقان کے علاقوں سے کاٹ لیے گئے ہیں، واپس کیے جائیں لیکن ہم نے ایسا مطالبہ نہیں کیا ہے، اگرچہ ہم کو ان علاقوں کے اپنے ہم مذہبوں سے پوری ہمدردی ہے، ہم نے اس طرح دوسری بہتر چیز کے انتخاب پر عمل کر دکھایا ہے لیکن جہانتک مذہبی معاملات و اعتقادات کا سوال ہے، ان میں کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی، ان چیزوں پر مذکورہ فلسفہ کا اطلاق نہیں ہوتا، ان معاملات میں ہم اسی چیز کا انتخاب کرینگے جو بہترین ہے، ورنہ دوسری بہتر چیز کا انتخاب نہ صرف بد بلکہ بدترین چیز کے انتخاب کے برابر ہوگا،

"جہانتک وزیر اعظم سے ملاقات کی ہماری خواہش کا سوال ہے، اُنکی مشغولیت سے ہم اچھی طرح

…فت ہیں، اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کیلیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے لیکن احترام بحرف لائے بغیر
…دیہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مشروے نی زیلوز بار بار آتے ہیں اور بادشاہ سلامت کی حکومت کو
…باتوں پر کان دھرنے کا موقع مل جاتا ہے، تو پھر یہ بالکل مناسب ہوگا کہ ہندوستان اور ہندوستانی
…لمانوں کے نمایندوں کو جو بقول آپکے اتنی دور دراز سے آئے ہیں، کہنے سننے کا موقع دیا جائے ،
…بادشاہ سلامت کے وزرا فیصلے کرنے سے پہلے ہمارے جذبات سے بھی واقف ہو جائیں۔

"جہاں تک سلیشیا کے قتل عام کا تعلق ہے ہم لوگوں کو یقین ہے کہ اسکی خبروں کے آنے کے ذرائع قابل
…تماد نہیں ہم تو اسکے قائل ہیں کہ اس قتل عام کی مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے، ایک
…بشن مقرر کیا جائے تاکہ اصلیت کا پتہ لگایا جائے، یونانیوں، یہودیوں اور آرمینیوں نے اپنے اپنے
…یشن بھیجدیے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا کمیشن بھیجنے سے روکا جا رہا ہے، انکو بھی ایک کمیشن بھیجنے
…جازت دیجائے، اور اگر انکی غیر جانبداری قابل شبہ سمجھی جائے تو اس کمیشن میں انگریز اور ہندوستانی
…ی شریک کیے جائیں، اور اس میں شریک ہونے میں بڑا سا بڑا آدمی بھی اپنے رتبہ سے فروتر نہ سمجھے گا، ہز
…نز الشڈ ہائنس نظام اور ہندوستان کے دوسرے والیان ریاست، علما جن میں مولانا عبدالباری
…ور مولانا محمود الحسن بھی ہوں گے، ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں رہنما بھی خوش ہونگے
…ر اس کمیشن کے ذریعہ صداقت کا اظہار ہوا، پہلے مکمل تحقیقات تو ہونے دی جائے اگر ترک ویسے
…ہی ثابت ہوئے جیسا کہ وہ بدنام کیے جا رہے ہیں، تو ہم لوگ ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، ہماری
…خواہش کبھی یہ نہ ہوگی کہ اسلام پر یہ داغ آئے کہ وہ قاتلوں کا حامی ہے،

"میں آپ کی اجازت سے آپ کی توجہ ایک بات کی طرف اور دلاؤں، وزیر اعظم
اور دار العوام کے لیڈر کی تقریروں میں خلیفہ اور اس کے دار الخلافت اور آبنائے
میں اتحادیوں کی فوجوں کے قیام کا ذکر آیا ہے اس کا ہم کو احساس ہے کہ پارلیمنٹ کے مہیا سے

میں خصوصاً اور سیاست میں ..... مدبروں کو ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں کہ مختلف رائے رکھنے والے مطمئن رہیں، یہ مدبرین اپنی رائے کے اظہار میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو نجی طور پر کہنا پسند نہ کریں گے، لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ کو اتحادیوں کی بندوقوں کے سایہ میں قسطنطنیہ میں رکھا جائے گا، جہاں اس کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق رہے گا، تو پھر اس کی پوزیشن ڈیکن کے پوپ سے بھی بدتر ہوگی، وہ اوگینون کا پوپ بلکہ اس سے بھی بدتر بن کر رہے گا، اور ایک غیر مذہب اور غیر عقیدہ والوں کا قیدی ہوگا، اگر یہ اصلیت ہے تو پھر ہم اس کو بار بوسہ یا قونیہ میں جلا وطن ہو جانا زیادہ پسند کریں گے، لیکن اسلام کی جو تذلیل اس سے ہوگی اسکا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کے نتائج کو نظر انداز کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا،"

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موقع ایک مختصر تقریر کی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنی بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاید پہلا ہندوستانی مولوی ہوں جو یہاں آیا ہوں، میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، مولانا عبدالباری صاحب نے جو لکھنؤ کے فرنگی محل کے مشہور خاندان سے ہیں، مجھکو خاص طور پر اپنی نمایندگی کرنے کے لیے بھیجا ہے، تاکہ میں بادشاہ سلامت کی حکومت پر واضح کردوں کہ ہم لوگوں کے لیے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ خالص ایک مذہبی معاملہ ہے،

رائٹ آنریبل فشر سے وفد کی یہ پہلی ملاقات ختم ہوگئی، اسکے بعد انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں مولانا محمد علی نے جس جرأت اور مذہبی جوش سے تقریر کی، وہ بھی مطالعہ کے لائق ہے، یہ تقریریں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں لیکن انکے اندر جو چنگاریاں ہیں وہ آج بھی مسلمانوں کے عز[illegible] کو سلگانے میں کام دے سکتی ہیں۔ (باقی)

کیا علامہ ابن حبانؒ پر زندقہ کا الزام صحیح ہے؟

از

از ضیاء الدین اصلاحی

امام ابو حاتم محمد ابن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) اکابر محدثین میں ہیں، وہ علوم حدیث خصوصاً فن جرح و تعدیل کے ماہر اور متعدد فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں:-

"فقہ و لغت و طب و نجوم و فلک و ہندسہ را نیک می دانست[1]"

لیکن بعض نامور علماء و ائمہ حدیث کی طرح ان پر بھی کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا الزام زندقہ اور بدعقیدگی کا لگایا گیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلا وطن کر دیئے گئے تھے، اس مضمون میں اس کا جائزہ لیا جائے گا، اور اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس الزام کا دارو مدار ان دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:-

---

[1] بستان المحدثین

قال سألت یحییٰ بن عمار عن
ابی حاتم بن حبان فقال رأیتہ
ونحن اخرجناہ من سجستان
کان لہ علم کثیر ولم یکن لہٗ
دین کبیر قدم علینا فانکر الحد
للہ فاخرجناہ[1]

ابو اسماعیل ہروی کا بیان ہے کہ
میں نے یحییٰ بن عمار سے ابو حاتم بن حبان
کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے
کہا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے، اور
ہم ہی لوگوں نے ان کو سجستان سے
جلا وطن کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے
مگر ان کا دینی پایہ زیادہ بلند نہیں
تھا، وہ ہمارے پاس آئے، اور اللہ
کے بارہ میں حد کا انکار کیا، تو ہم نے
اُن کو شہر بدر کر دیا،

دوسری روایت ہے:-

قال ابو اسماعیل الانصاری
سمعت عبد الصمد بن محمد
ابن محمد یقول سمعت ابی یقول
انکروا علی ابن حبان قولہ
(النبوۃ العلم والعمل) و

ابو اسماعیل انصاری کہتے ہیں کہ
میں نے عبد الصمد سے اور انھوں نے
اپنے والد محمد سے یہ سُنا کہ لوگوں نے
ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم و
العمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کی وجہ
سے ان پر نکیر کی، اکا دو زندقہ کا الزام[2]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و ۱۳۵، و میزان الاعتدال ج ۳ و طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ [2] اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵ پر دیکھئے)

حكموا عليه بالزندقة وهجروه	لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ
وكتب فيه الى الخليفة فامر بقتله	سے اُن کی شکایت کی، خلیفہ نے اُن
وسمعت غيره يقول لذلك اخرج	کے قتل کا حکم دیا (ابو اسماعیل کہتے
الى سمرقند	ہیں، مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ
	دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس
	کی وجہ سے وہ جلا وطن کئے گئے تھے

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے پہلی روایت میں ابن حبان کی دینی فضیلت و برتری میں کلام کیا گیا ہے، اور دوسری روایت میں اُن کے الحاد و زندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلا وطنی کا تذکرہ ہے، اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعۃً قتل کئے گئے تھے یا نہیں[۱] پھر فرمانِ قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک و تذبذب ظاہر کر کے روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، اس سے اس کا سوءِ حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے،

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں اُن کا کمال مسلّم ہے، مگر روایت و درایت میں ضبط و تیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے، علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں، ان

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) نبوت کا جز علم و عمل ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہو سکتا ہے، گویا نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہے[۱] میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۳۹ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۵ و لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۳

[۱] شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعۃً قتل نہیں کئے گئے تھے، بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرا دیا تھا،

احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان، چالیس بیالیس سال کا فرق ہے، اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہو چکا ہوتا، اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے، کیونکہ ان کا شمار ائمہ حدیث اور جرح و تعدیل میں ہوتا ہے، اس لئے دوسرے ارباب فن اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی اُن کی شہرت و اہمیت، وثوق و اعتبار اور عظمت و بلند پایگی میں فرق نہ آنا اور اُن کی ذات کا محدثین اور ائمہ فن کا مرکز توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا اُن کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں[۱]،

ان روایتوں کے ناقابلِ یقین ہونے ہی کی بنا پر اُن کو بعض ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، اور جن مورخین نے اُن کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے،

درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کئے جاسکتے جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے انکی پوری تصدیق نہ ہوجائے دونوں روایتوں کے اختلاف و اضطراب اور ان میں خطا و تحریف کے احتمالات کو نظرانداز کرکے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے، تو ابن حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوسکتا، اس کی تفصیل یہ ہے:-

---

[۱] اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے وہ ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے،

اوپر گذر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت وجلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے حد وحیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد ومکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطۂ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں۔

انظر ما اجهل هذا الجارح	ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا
وليت شعري من المجروح	بھی کس قدر ناواقف ہے، کاش میں
مثبت الحد لله او نافيه،	بھی جانتا کہ دونوں میں قابل جرح والزام کون شخص ہے؟ آیا وہ جو اللہ کے لئے حد کو مانتا اور ثابت کرتا ہے یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے؟

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے۔

يالله العجب من احق بالاخراج والتبديع وقلة الدين؟	مجھے سخت تعجب ہے، آخر جلاوطنی کی سزا اور بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے؟

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

و قوله (بدت) من ابن حبان هفوة طعنوا فيه بها ان	معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہوگئی جس کی

اما د القصة الا ولی التی صدر	وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے،
بھا کلامہ فلیست ھذہ بھفوۃ	اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت[1]
والحق ان الحق مع ابن حبان	والا قصہ ہے تو دراصل اس میں کوئی
فیھا،	لغزش نہیں ہے، بلکہ انصاف کی بات
	یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف
	برحق ہے،

ان اقوال سے ظاہر ہو گیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابلِ اعتراض بات نہ تھی، بلکہ ان ہی کا نقطۂ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیونکہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور و خوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدا کی صفات وغیرہ میں بحث و تدقیق فضول اور لایعنی بات تھی، اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال و تفتیش اور بحث و جستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

انکارہ الحد واثباتکم للحد نوع	ابن حبان کا اللہ کے لئے حد ہونے
من فضول الکلام والسکوت	کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کیلئے
عن الطرفین اولی اذ لم یأت	حد کو ثابت کرنا دونوں ہی فضول
نص بنفی ذلک ولا اثباتہ و	باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی
اللہ تعالی لیس کمثلہ شیئ فمن	افضل و اولی ہے، اس لئے کہ نفی و

[1] یعنی وہ روایت جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے،

۵۲ لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴

اثبته قال له خصمه جعلت لله حدا برأيك ولا نص معك بالحد والمحدود مخلوق تعالى الله عن ذلك علوا كبيرا وقال هو لنا في ساويت ربك بالشيء المعدوم اذ المعدوم لا حد له فمن نزه الله وسكت سلم وتابع السلف[1]

اثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے، اور اللہ کا یہ حال ہے کہ اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں پس جو شخص حد کا قائل ہے، اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے وقیاس سے اللہ کے لئے حد بنائی ہے، اس کے لئے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے، (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے حالانکہ) محدود مخلوق ہوا کرتا اور اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم چیزوں کے برابر کر دیا ہے[2] کیونکہ معدوم چیزوں کے لئے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھے اور ان امور

---

[1] حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد اس کے لئے حد کی نفی اس کو معدوم اشیاء کے برابر کر دینا نہیں ہو سکتا۔ [2] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۲، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۹۳۔

کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں

وہی سلف صالحین کے متبع ہیں، اور

اور انہی کا طریقہ احتیاط اور سلامتی

پر مبنی ہے،

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت و منکر دونوں ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط و تورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں،

کلا قسمًا مخطی اذ لم یات نص	اثبات و انکار دونوں کے قائلین
باثبات الحد ولا بنفیہ ومن	غلطی کرتے ہیں، کیونکہ حد کی نفی و
حسن اسلام المرء ترکہ	ثبوت کے متعلق کوئی نص نہیں ہے،
مالا یعنیہ[1]	اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا
	یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے،

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا،

(۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بحث بنایا جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا، لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں،

مگر مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلا ضرورت اس مسئلہ میں کلام

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵،

نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے،

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور و خوض نامناسب اور خلاف احتیاط ہے لیکن اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور و خوض اور بحث و کلام کیا جائے لیکن ضرورةً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، اُن کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا تھا، اور کچھ لوگ شد و مد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے حد و حیز ثابت کر رہے تھے، اس لئے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا، اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی، اس لئے انھوں نے کوئی خلاف احتیاط نہیں کام کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمد کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارہ میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث و تفتیش فضول، سوال و تجسس بدعت، اور خاموشی افضل و اولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہی جواب دیا، اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے اس کے بارہ میں دریافت کیا، تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا، اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا[1] مگر جب معتزلہ کے استیلاء و تسلط اور خلفاے عباسیہ کے جبر و تشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا، اور ابتلا و آزمایش کی پرواہ کئے بغیر بڑی جرأت و بے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے قید و بند اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا،

---

[1] احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۳۳،

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد و زندقہ کا ضرور ذکر ہے، مگر اس کی جو توجیہ بیان کی گئی ہے، اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر و ایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف اور تامل سے کام لیتے ہیں، اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے، اور جہاں تک ممکن تھا، توجیہ و تاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا ہے، اُن کی توجیہ و تاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کئے جاتے ہیں :-

علامۂ ذہبی رقمطراز ہیں :-

وهذا ايضاً له محمل حسن و	(دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے
لم يرد حصر المبتدا في الخبر	کیونکہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے،
ومثله الحج عرفة فمعلوم ان	درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو
الرجل لا يصير حاجاً بمجرد	خبر میں محصور و محدود کرنا نہیں ہے
الوقوف بعرفة وانما ذكر	جس طرح کہ رسول اکرمؐ کے ارشاد
مهم الحج ومهم النبوة اذا	الحج عرفة یعنی حج عرفہ ہے، کا یہ مطلب
كمل صفات النبي العلم و	نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لئے صرف
العمل ولا يكون احد نبياً	عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے، اور
الا ان يكون عالماً عاملاً (نعم)	نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام
النبوة موهبة من الله تعالى	ارکان و مناسک ادا ہو جائیں گے،
لمن اصطفاه من اولى العلم	بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب اہم،
والعمل لاحيل للبشر في اكتسابها	ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے

ابداً او بهاً يتولد العلم النافع و العمل الصالح ولا ريب ان اطلاق ما نقل عن ابي حاتم لا يسوغ و ذلك نفس فلسفي[1]

(اسی طرح ابن حبان کے قول کا منشاء یہ ہے کہ) نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و امتیاز ہے، اور کوئی شخص ان میں درجہ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبت الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے جس کے لئے اللہ اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے، اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جا سکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے (اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آئیگی) البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے، وہ صحیح نہیں ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ سے و خیال کی ہے۔

حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:-

ولقوله هذا محمل سائغ ان ابن حبان کے اس قول کی ایک

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۵،

كان عندہ ای عماد النبوۃ
العلم والعمل لان الله
لم یؤت النبوۃ والوحی
الا من اتصف بھذین
النعتین وذلک لان النبی
یصیر بالوحی عالما ویلزمہ
من وجود العلم الالٰہی العمل
الصالح فصدق بھذا الاعتبار
قولہم النبوۃ العلم اللدنی و
العمل المقرب الی الله فالنبوۃ
اذا تفسر بوجود ھذین الوصفین
الکاملین ولا سبیل الی تحصیل
ھذین الوصفین بکمالہما
الا بالوحی الالٰہی اذ الوحی
الالٰہی علم یقینی ما فیہ ظن
وعلم غیر الانبیاء منہ
یقینی واکثرہ ظنی، ثم
النبوۃ ملازمۃ للعصمۃ
ولا عصمۃ بغیرھم ولو بلغ

مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر ان کی مراد
یہ ہو کہ نبوت کا دارومدار علم وعمل پر ہے
کیونکہ اللہ تعالیٰ نبوت و وحی سے اسی
شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں
اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی
وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الٰہی عمل
صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے
ان کا قول صحیح ہے کیونکہ نبوت علم لدنی
اور ان اعمال کا نام ہے جو قربِ الٰہی کا
ذریعہ ہیں پس نبوت ان دونوں چیزوں
کے تمام وکمال پائے جانے کا نام ہے
اور وحی الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجۂ
کمال حصول نہیں ہو سکتا، کیونکہ وحی
الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن وتخمین
کو دخل نہیں ہوتا، مگر غیر انبیاء کا علم
یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت
عصمت کو مستلزم ہے اور انبیاء کے علاوہ
کسی شخص کے لئے عصمت نہیں خواہ وہ
علم وعمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب

في العلم والعمل ما بلغ والخبر	کیوں نہ ٹکرلے، (دوسری بات یہ ہے
عن الشيئ يصدق ببعض	کہ جب) کسی چیز کے بارہ میں خبر دیجاتی ہے
ارکانه واهم مقاصده	تو وہ اُس کے ضروری مقاصد اور اہم
غيرانا لا نسوغ لاحد اطلاق	اجزاء کے لحاظ سے دیجاتی ہے جس طرح
هذا الا بقرينة كقوله عليه	کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ (الحج عرفة) تاہم
الصلوٰة والسلام الحج عرفة	کسی کے لئے اس طرح کی بات (جیسی ابن
وان كان عنى الحصرای ليس	حبان نے کہی ہے) مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا
هی الا العلم والعمل فهذه	درست نہیں ہے، اور اگر ابن حبان کا مقصد
زندقة وفلسفة،[1]	حصر ہو یعنی نبوت صرف علم و عمل ہی کا
	نام ہے، تو یہ بلا شبہ زندقہ اور فلسفہ ہے

اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تقریر بھی قابلِ ملاحظہ ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

لیکن انصاف آنست کہ این کلامِ	مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان
چنداں دور از عقائد حقہ نیست چہ مرادِ	کا یہ قول عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف
آن نیست کہ نبوت کسبی است بریاضت	نہیں ہے کیونکہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا
در علم و عمل حاصل تواں کرد، چنانچہ	کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم و عمل کی
مذہب فلاسفہ ہست بلکہ غرض آنست	ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ
کہ نبوۃ را لازم است کہ نفس ناطقہ انسان	فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ اُن کی غرض

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳، ۱۱۴۔

در علم و عمل زیادتی بین داشته باشد
بعد ازاں بطریق موہبت او را نبوت
عطا می شود چنانچه در قرآن مجید اشارہ
بآں معنی می فرمائید جائے که فرموده است
الله اعلم حیث یجعل رسالته و
اعتقاد آں که انبیاء را هیچ مرتبه در قوت
علمیه و عملیه بر سائر افراد نمی باید که باشد
و بطریق تحکم محض یکے را از میان افراد
متساویه به نبوت سرافراز میفرمایند
اصلا از شریعت و دین ثابت نمی شود
یا مرادش آنست که انبیاء را بعد از بخشش
نبوت تفوق در ہر دو جانب علم و
عمل حاصل می کرد، و لهذا معصوم
می باشند از خطا و گناه و این معنی
مجمع علیه جمیع اہل اسلام است،[۵۱]

یہ ہے کہ نبوت کے لئے انسان میں اس
نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم
و عمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو اس
کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا
کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت
میں اسی مفہوم کی جانب اشارہ کیا
گیا ہے، (الله اعلم حیث یجعل رسالته
یعنی الله خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت
و نبوت سے کسی کو سرفراز کرے) رہا
یہ عقیدہ کہ انبیاء علیہم السلام کو علمی و
عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری
حاصل نہیں ہوتی، بلکہ خدا تعالی محض اپنے
حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے
والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو
زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ
بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے،
یا ابن حبان کا یہ بھی منشا ہو سکتا ہے کہ
کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت عطا کئے

---

۵۱ بستان المحدثین ص ۴۰

جانے کے بعد علم و عمل دونوں اعتبار
سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی
ہے اس لئے وہ معصوم اور گناہوں سے
محفوظ رہتے ہیں، تو یہ ایسی بات ہے[۵]

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام و اعتراض اور الحاد و بدعقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوء تعبیر کہا جا سکتا ہے۔ البتہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوء تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم و فن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین و طباع شخص تھے، اُن کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا، اور وہ اُن کو مطعون و متہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے انکے لئے اس کا موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے اُن کی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق و سباق سے جدا کر کے اسے اُن کا الحاد و زندقہ قرار دیا، حاکم فرماتے ہیں:

"ابو حاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا"[۱۵]

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:-

"بجز عناد و تعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، وہ یگانۂ روزگار اور غیر معمولی ذہین و طباع تھے، اُن کا حافظہ بے مثال تھا"[۱۵]

۲۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فلسفہ و کلام کے ماہر اور فلسفیانہ و متکلمانہ مذاق رکھتے تھے، اور فلسفہ و کلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد و خیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے، اس بنا پر متقشف علماء کو ابن حبان سے بدگمانی ہو گئی، اور وہ ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے، علامہ

سیوطی کا بیان ہے کہ "وہ فلسفہ و کلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لئے ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے" حالانکہ فلسفہ و کلام سے فساد عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود دینی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ و کلام میں انہماک نے ان کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لئے ابن حبان کے فلسفہ و کلام کی دلچسپی کو بھی ایمان وعقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، تاآنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو،

۳- ابن حبان پر اتہام و الزام کی روایت کرنے والے ابو اسماعیل انصاری ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے، اس لئے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ و کلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فرو گذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا، اور انھوں نے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگا دیا، اس لئے یہ الزام درحقیقت ان کے غایت تورع کا نتیجہ ہے، جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے،

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم ماخذ

از
جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۴)

(۴) ہندی قرونِ وسطیٰ کے شعرا اور انکا کلام ہندی قرونِ وسطیٰ کے فارسی شعراء کا جہانتک تعلق ہے، امیر خسرو ان میں سرفہرست ہیں، ان کے اشعار میں تیرہویں صدی کے ہندوستان کے جو حالات ملتے ہیں وہ مستند مورخوں کے تاریخی بیانات سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں، خسرو کی تاریخی مثنویوں میں نہ سپہر، قران السعدین، دولرانی خضر خاں، تغلق نامہ اور مفتاح الفتوح وغیرہ شعر و سخن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کے سماجی اور تاریخی واقعات کی آئینہ دار ہیں، جنکو سید حسن برنی نے "تاریخی نقاشی" کے نام سے تعبیر کیا ہے، ان مثنویوں کو گہری نظر سے پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو نے اپنے عہد کے تمدن کی جزئیات تک کو نہیں چھوڑا ہے ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی　　　ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

ان کے تاریخی کارناموں کے متعلق مورخین اور محققین کے خیالات ملاحظہ ہوں،

(۱) پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:

"انھوں نے دلی کا ہر رخ سے معائنہ کیا، یہاں کے واعظین کی خطابت اور صوفیہ کے پُرکیف مکالمے ہوں یا یہاں کی رقاصاؤں کے دلربایانہ عشوے، انکی نظر سے نہیں بچے، جب انھوں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو گہرے سے گہرے انسانی جذبات

سے ان کا دل مملو تھا، شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم زہر گوشۂ خرمنے یافتم

خسرو نے اپنے پیشرو کی تقلید کی اور دربار سے لیکر مزدور کی گلیوں تک خانقاہوں سے لیکر خرابات تک معاشرت انسانی کی تمام تہ بہ تہ حالتوں کا مطالعہ کیا۔"[۱]

(۲) ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں :

"شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے، اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے، خسرو اس قوم کے بہترین نمونوں میں سے ہیں، انکے کلام میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا ستھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے، راہ عشق کے پیچ وخم، محبت کے متوالوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ، پند ونصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے، جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔"[۲]

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :۔

"آج کا مورخ جب ہندی قرون سے اسکے بہترین تہذیبی نمونے کے متعلق سوال کرتا ہے تو جواب میں "امیر خسرو" ہی کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔"[۳]

(۴) تغلق نامہ کے دیباچہ نویس لکھتے ہیں :۔

---

[۱] سوانح حیات امیر خسرو (اردو ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۸ء ص ، [۲] امیر خسرو اور ہندوستان، خسرو اکیڈمی، نئی دہلی ص ۱۳ [۳] تاریخی مقالات، دہلی، ۱۹۶۶ء ص ۸۰

"شاید دنیا کی کسی قوم نے ایسا شاعر نہیں پیدا کیا جس نے طویل اور اہم تاریخی واقعات کو شاعرانہ حسن گفتار کے ساتھ اتنی صحت سے نظم کا جامہ پہنانے میں کامیابی پائی ہو، جیسے کہ یہ دہلی کے اس درباری شاعر کے حصے میں آئی۔"[1]

(۵) ڈاکٹر وحید مرزا نے صحیح فرمایا ہے:

"انکے زمانے کی تقریباً مکمل تاریخ ان ہی کی تصانیف سے مرتب کی جاسکتی ہے۔"[2]

یہی نہیں بلکہ تاریخ کے بعض واقعات صرف خسرو ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً خان شہید کا مرثیہ جس کو فارسی شاعری کا "ڈیتیم" کہا جاتا ہے، اسکے بارے میں پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:

"شہزادہ شہید کی فوج کشی، مغلوں سے مقابلہ اور پھر اسکی شہادت، امیر خسرو کی گرفتاری اور رہائی، ان تمام واقعات کا تفصیلی علم ان کے زمانے میں عوام و خواص دونوں کو اور ہمارے زمانے میں تاریخ کے طلبہ کو صرف اسی مرثیہ سے ہوا ہے۔"[3]

خسرو کے علاوہ ہندی قرون وسطیٰ کے فارسی شعراء میں بہاء الدین اوشی، امیر روحانی، محمد عوفی، ناصری خراسانی، بدرچاچ، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، شمس دبیر، مولانا مطہر کڑہ، شیخ جمال الدین ہانسوی، امیر حسن علا سجزی، مولانا ضیاء الدین نخشبی مولانا عصامی اور شیخ جمالی کے اشعار میں بھی ہندی قرون وسطیٰ کے تمدنی، ادبی اور سیاسی حالات ملتے ہیں،

وہ گمنام شعراء جن کا سرمایۂ حیات مفقود ہو چکا تھا، مگر اب دستیاب ہو گیا ہے، عجب نہیں کہ ان میں بھی تاریخی و سماجی واقعات کی داستانیں ہوں، ان شعراء میں سراجی، عمید تولکی، برہان الدین بزاز، تاج الدین بخاری، اعز الدین علوی، حکیم تاتاری اور محمود خطاط جو سلطان دہلی

---

[1] تغلق نامہ، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء ص ۳-۴ [2] امیر خسرو (ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۴

[3] سوانح حیات امیر خسرو دہلوی (ترجمہ) ص ۲۱

کے عہد کے شعراء تھے، قرون وسطیٰ کی تاریخ میں انکے کلام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے،

۵- تاریخی اور ادبی مخطوطات کی اشاعت | اسلامی ہندوستان میں ساڑھے چھ سو سال کے عرصہ میں سیکڑوں تاریخی اور ادبی کتابیں تصنیف کی گئیں، ان میں سے بہت سی ضائع ہوچکی ہیں اور ضائع ہو رہی ہیں لیکن اب بھی ایک بڑی تعداد ان قلمی کتابوں کی ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے کتب خانوں میں محفوظ ہے، گو اہم تاریخی ماخذوں کی اچھی خاصی تعداد شائع ہوچکی ہے، پھر بھی دنیا کے مختلف کتبخانوں میں ایسے بہت سے مخطوطے موجود ہیں جنکی اشاعت ہندی قرون وسطیٰ کے تاریخی معلومات کے لیے نہایت ضروری ہے، چند اہم تاریخی مخطوطات جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ظفرنامہ فیضی یا فتحنامہ گجرات، برٹش میوزیم لندن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ،
(۲) شاہجہان نامہ، محمد امین قزوینی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۳) تاریخ حقی یا ذکر الملوک شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ایضاً (۴) فوائد فیروز شاہی، مولانا شرف محمد العطائی، ایضاً، بانکی پور، (۵) طبقات شاہجہانی، شیخ محمد صادق، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۶) ذخیرۃ الملوک، سید علی ہمدانی، ایضاً (۷) مآثر جہانگیری، کامگار حسین، انڈیا آفس لندن (۸) اخلاق جہانگیری، نور الدین محمد، ایضاً، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۹) تکملہ سیر المتاخرین یا تاریخ سلاطین بنگالہ منشی غلام حسین خاں جونپوری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۰) بادشاہ نامہ، محمد امین قزوینی، برٹش میوزیم لندن (۱۱) افسانہ شاہان، محمد کبیر بن شیخ اسمٰعیل، ایضاً (۱۲) تذکرۃ الواقعات[۱] جوہر آفتابچی، ایضاً (۱۳) تاریخ چغتائی، محمد شفیع، ایضاً (۱۴) زبدۃ التواریخ محمد نور الحق محدث، ایضاً، آصفیہ حیدرآباد (۱۵) ہفت گلشن محمد شاہی، ہادی کامور خاں، برٹش میوزیم،

[۱] ڈاکٹر معین الحق نے اس کا اردو ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے شائع کردیا ہے۔

(۱۶) واقعات مشتاقی، مولانا رزق اللہ مشتاقی، برٹش میوزیم (۱۷) تاج المآثر حسن نظامی نیشاپوری، آصفیہ لائبریری حیدرآباد (۱۸) سیرت فیروزشاہی، مصنف گمنام، بانکی پور لائبریری (۱۹) فتحنامہ نورجہاں، ملا کامی شیرازی، کتبخانہ ملی پیرس (۲۰) سے الاخبار، محمد شریف وقوعی، انڈیا آفس لائبریری (۲۱) تذکرۃ الامراء، کیول رام، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲۲) تاریخ ہند محسنی، میر محمد محسن، ایضاً (۲۳) قواعد سلطنت شاہجہانی، چندربھان برہمن، ایضاً (۲۴) تاریخ مظفری، محمد علی خاں انصاری، ایضاً (۲۵) تاریخ عالمگیری، احمد علی صفوی، ایضاً (۲۶) تاریخ وتائع زمان شاہی، مرزا ابوالحسن خاں ایضاً (۲۷) تاریخ حسینی، امام الدین، ایضاً (۲۸) تزک شاہ شجاع دفتر اول، دوم، سوم دفتر اول و دوم مرتبہ شاہ شجاع، دفتر سوم مرتبہ محمد حسن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، (۲۹) تاریخ احمد شاہ (حالات احمد شاہ عالمگیر ثانی) مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، (۳۰) تاریخ محمد شاہی یا نادرالزمانی، منشی خوشحال چند، ایضاً (۳۱) تاریخ محمد (عادل شاہی) محمد ظہور پسر ملا ظہوری، ایضاً (۳۲) مظفرنامہ تاریخ بنگالہ، کرم علی خاں، ایضاً

ان تاریخی قلمی نسخوں کے علاوہ ان ادبی اور مذہبی کتابوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، جن کے قلمی نسخے لندن، پیرس، برلن اور روسی ترکستان کے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں اس کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان ادبی و مذہبی قلمی نسخوں سے بڑا اہم تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے، مثلاً ہم ہندوستان کے لسانی اور ادبی ارتقا سے آگاہ ہوتے ہیں، مذہب اور تمدن کی حقیقی صورت ہمیں نظر آتی ہے، خانقاہوں اور مساجد کے آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، ان کا انداز گفتگو، ان کی نیک صحبتیں اور ان کا طرز سخن معلوم ہوتا ہے، غرض ان سے

یخی اور تمدنی معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند غیر مطبوعہ ادبی اور مذہبی نسخوں کے نام یہ ہیں:

(۱) سراج الہدایت، احمدی علوی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲) مرآۃ الاسرار بد الرحمٰن چشتی، ایضاً (۳) ریاض الاولیاء، بختاور خاں، برٹش میوزیم لندن (۴) ن الاقوال، خواجہ عماد بن حماد کاشانی، ذخیرہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم (۵) تحفۃ المجالس یخ احمد کھٹو، انڈیا آفس لائبریری (۶) مخ المعنی[1] امیر حسن علا سجزی، مولانا آزاد ئبریری علی گڑھ (۷) طوالع الشموس، قاضی حمید الدین ناگوری، ایضاً (۸) بحر المعانی، بد محمد بن جعفر مکی الحسینی، ایضاً (۹) مبلغ الرجال، عبداللہ عبید اللہ بن خواجہ باقی باللہ، ایضاً، ۱۰) فتاوائے جہانداری، ضیاء الدین برنی، انڈیا آفس لائبریری (۱۱) فتاوائے فیروز شاہی ولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۲) نقرا بری، نور الدین بن قطب الدین، کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ (۱۳) نظم گزیدہ، ناظم تبریزی، مولانا آزاد لائبریری لی گڑھ (۱۴) خلاصۃ الاشعار، تقی کاشی، ایضاً (۱۵) مخزن الغرائب، علی احمد خاں سندیلوی، یضاً (۱۶) دیوان مولانا مطہر کڑہ، ایضاً (۱۷) دیوان نور العین، مسعود بک، برٹش میوزیم ندن (۱۸) عرفات عاشقین، تقی بن معین الدین حسینی اوحدی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲۰) مثنوی مہر و ماہ، شیخ جمالی، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (۲۱) چہار گلشن، منشی چتر من کایستھ، نڈیا آفس، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ (۲۲) سفینۂ خوشگو، بندرا بن خوشگو، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

حرفِ مدعا

یہ کہہ کر آتے آتے رک گئی صبح بہار اپنی ‏ ‏ ‏ ابھی تو راہ میں ہنگامۂ شیخ و برہمن ہے

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جب ہم نے اپنی قومی املاک کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا

[1] تاریخی مقالات مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۶۶

کہ ہمارے بہت سے قیمتی ذخائر یہاں سے منتقل کیے جا چکے ہیں، مغلوں کے محلوں اور مقبروں کے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء انگلستان کے خزانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، ہمارے فنون لطیفہ کے شاہکار انگلستان کے گھروں کی زینت ہیں، اور ہماری لاتعداد قیمتی قلمی کتابیں انڈیا آفس لائبریری کے نام سے ملک بدر کی جا چکی ہیں،

آیئے اب اپنے نقصانات کی فہرست مرتب کریں، جو انگریزوں کے ظالمانہ تدبر سے ہم ہندوستانیوں کو پہنچے،

(۱) ہندو مسلم درویشوں کا وہ مشن جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچ رہا تھا، اور اس سرزمین کو مہر و محبت کا گہوارہ بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا انگریزوں نے اس کو ناکام بنا دیا،

(۲) ہمارے ملک کی وہ قومی اور سیاسی تحریکیں جن کو سلطان ٹیپو اور جھانسی کی رانی نے اپنے خون سے سینچا تھا، سرد پڑ گئیں،

(۳) ہندو مسلم عوام کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی،

(۴) ہمارے سماج کی تمام خوبیاں جو بہادری، ایمانداری، حق گوئی، رواداری اور سچائی پر مشتمل تھیں، خوشامد، بزدلی، جھوٹ، مکاری اور قوم فروشی میں تبدیل ہو گئیں،

(۵) اس منافرت سے ہمارے ملک کو اتنا نقصان پہنچا کہ شاید سو برس کی مسلسل جنگ سے بھی اتنا نقصان عظیم نہ پہنچتا اور آج بھی ہم اپنی نادانی اور غفلت سے اپنے قومی اثاثے کو آگ لگانے اور تباہ کرنے میں مصروف ہیں،

اسلیے اپنے ہندوستانی مورخوں، استادوں اور اسکالروں سے ہماری استدعا ہے کہ موجودہ دور ہماری قومی اور ملی زندگی کا بڑا نازک دور ہے، ہم کو اس وقت

انگریز مورخوں کی لگائی ہوئی آگ کو حق و انصاف سے اور سچائی و رواداری سے بجھانا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اپنے ایک خطبہ میں مورخین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنانا ختم ہو چکا ہے، آج بھی یہی رجحان باقی ہے، اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی، اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے، آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جد و جہد کرنی ہے، تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے لیکن ان میں ایک مشترک قطعہ بھی تھا، جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے، جسے تاریخی نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں

ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں، ....

آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے، کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے، جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے، اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹایئے جس کے صدر دروازہ پر حالیؔ کی یہ رباعی رقم ہو ؎

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں　　شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ　　وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں[1]

آخر میں ڈاکٹر تاراچند کی تقریر کا ایک حصہ سنا کر گفتگو ختم کرتا ہوں، ڈاکٹر صاحب خسرو اکیڈمی نئی دہلی کے ایک جلسہ (۱۹۶۲ء) میں فرماتے ہیں :۔

"آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا، اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں، اسی شک و شبہہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ

---

[1] خطبۂ افتتاحیہ جشن طلائی شبلی اکیڈمی، دار المصنفین اعظم گڈھ، معارف جولائی ۱۹۶۵ء ص ۶۰-۶۲

خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں، چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے، تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیے غور نہیں کیا، تاریخ قوم کی لمبی اور ہیجانی سرگذشت کی یاد ہے، اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے، جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں، اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وجدانی سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے تاریخ دانوں کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے، اپنی روایتوں کی غلط تفسیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر سکتی ہے، اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لیے بدبختی کا باعث ہوئے اور اگر اب بھی ہم نہ چیتے تو آیندہ کے لیے سخت نقصان پہنچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔"[1] (امیر خسرو اور ہندوستان ص۶-۵)

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

اس میں امیر خسرو کی تمنویوں اور دواوین سے اُن کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق اُن کے تمام تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور آخیر میں اُن کی مثنویوں اور دواوین کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں، جن سے اس عہد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے،

ضخامت: ۱۳۶ صفحے - قیمت: - ۲/۵۰

منیجر

کلکتہ کا ایک علمی سفر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس سال ۱۲ ستمبر کو کلکتہ کی ایران سوسائٹی میں ڈاکٹر محمد اسحاق میموریل لکچر کے سلسلہ میں ایک مقالہ پڑھنے کی عزت حاصل ہوئی، اس سوسائٹی نے گذشتہ پچیس ۲۵ سال میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں، اس بنا پر اب اس کا شمار ملک کے مفید اور اہم اداروں میں ہونے لگا ہے، اس کو ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا، ان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے اسی ادارہ کو پدرانہ شفقت کے ساتھ پرورش کرکے پروان چڑھایا، ان کو فارسی زبان سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا، ان کے اس عشق کا اظہار ان کی تصنیف "سخنورانِ ایران درعصر حاضر" سے خاص طور سے ہوگا جس کی دو جلدوں میں ایران کے موجودہ شعراء پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں، وہ زندگی بھر فارسی کے کسی نہ کسی پہلو پر کام کرتے رہے، کبھی فارسی شاعری پر لکھتے، کبھی کسی فارسی تذکرہ کے ایڈٹ کرنے میں مشغول رہتے، اور جب ایران سوسائٹی قائم کی تو علم، فن اور فارسی زبان سے متعلق ان کے سارے خفتہ جذبات بیدار ہوتے گئے ایران سوسائٹی کی طرف سے انڈو ایرانیکا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، تو اس کے لیے مضامین فراہم کرنے، ان کے ترتیب دینے، چھپوانے اور شائع کرنے ہی میں ان کو زندگی کی تمام لذتیں ملنے لگیں، جب اس رسالہ کی تعریف ان کے کانوں میں پڑجاتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ انکی زندگی کا علمی اور واحد مقصد پورا ہوگیا، ان ہی کے بزرگانہ اور پُر اصرار خطوط پر مجھکو بھی اس میں

بہت سے مضامین لکھنے کا موقع ملا، اس سے پہلے میں اسلامک کلچر حیدرآباد کا مستقل مضمون نگار تھا،
لیکن اب جب کبھی کوئی انگریزی مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کھڑے نظر آتے ہیں،
اور پھر قلم سے انگریزی میں ایسی ہی تحریر نکلتی ہے جو انڈو ایرانیکا ہی کے لائق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء کو اچانک اللہ کو پیارے ہوگئے، وفات سے پہلے انھوں نے
اپنی ساری دولت علم و فن ہی کے فروغ کے لیے وقف کردی تھی جس میں کلکتہ، علی گڑھ اور پٹنہ
یونیورسٹیوں کو بھی حصہ ملا لیکن اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ ایران سوسائٹی ہی کو دیا، اپنا قیمتی کتبخانہ بھی اسی کو عطا کیا، اسکی عمارت
کڈ اسٹریٹ میں ہے، یہ سڑک اب ڈاکٹر اسحاق مرحوم ہی کے نام سے موسوم کردی گئی ہے، کلکتہ میں کسی
علمی ادارہ کے لیے کوئی بڑی عمارت بنوانا آسان کام نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی مخلصانہ
کوششوں سے اس کے لیے ایک بہت بڑی عمارت بھی حاصل کرلی تھی جو اب لاکھوں روپئے کی ہے۔

انکی وفات کے بعد ان ہی کے سرمایہ سے ان کے عقیدتمندوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان
ہی کے نام سے سالانہ میموریل لکچر کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ گذشتہ سال اس کا پہلا لکچر تھا جس کیلیے
فارسی زبان و ادب کے ممتاز محقق ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مدعو کیے گئے تھے،
ان کے لکچر کا عنوان *Mohamad Sadiq Isfahani an official of Shah Jahan's Time* تھا،
معلوم نہیں ایران سوسائٹی والوں کے لیے میری کونسی تصنیف یا تحریر لائق توجہ تھی کہ اس سال اس لکچر
کے لیے مجھکو طلب کیا، یہ لکچر انگریزی ہی میں ہوتا ہے، میرے مقالہ کا عنوان یہ تھا *Love and adoration for India in Indo-Persian literature with special reference to Bengal.* - "ہندوستان کے فارسی لٹریچر میں ہندوستان اور خاص طور سے بنگال سے محبت و تحسین کا اظہار"

اس مقالہ کے لیے میں ۱۷ ستمبر کی صبح کو ہوڑہ اسٹیشن پہنچا، تو اسٹیشن ہی پر ایران سوسائٹی کے

بعض عہدیداروں سے ملاقات ہوئی، مسٹر آر۔ ٹی سکالت ایران سوسائٹی کے صدر ہیں، دبلے پتلے نستعلیق سے ہیں، عمر کی کافی منزلیں طے کر چکے ہیں لیکن ان میں جوانوں کی سرگرمیاں نظر آئیں، مذہباً پارسی ہیں، ایران سوسائٹی سے گہری دلچسپی لینے کے سبب اس کے ارکین ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، مجھ سے بھی بڑے اخلاق سے ملے، عبد المجید صاحب ایران سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، سرکاری ملازم بھی ہیں، لیکن کسی ادارہ سے وابستہ ہو کر اس کو سنوارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، ایران سوسائٹی کے حسن انتظام میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انگریزی میں فارسی زبان کے بعض پہلوؤں پر مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اپنی زندگی ہی میں ایران سوسائٹی کے لیے اپنے جانشینوں میں سے ان کا بھی انتخاب کر لیا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی کے مختلف عہدوں پر رہ چکے ہیں، آجکل اس کے ٹریزرر ہیں، کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ بھی ہیں، جسم کا وزن بڑھ جانے کی وجہ سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں، لیکن کام انجام دینے میں بڑے چست اور سرگرم ہیں، انکی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، اسی عمر میں کلکتہ کے تمام علمی حلقوں میں مقبول ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کا بس چلتا تو اپنے سینے اور سفینے کا سارا علم ان ہی کو دے جاتے، اور بہت کچھ دے گئے، ان کو اپنی زندگی میں انڈو ایرانیکا کا اڈیٹر بنا گئے، جس کا اونچا معیار وہ ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں، اپنی پیشہ ورانہ مشغولیت کی بدولت انڈو ایرانیکا کو سلیقہ سے اڈٹ کرنے اور اس میں مضامین لکھنے کے علاوہ اسٹیٹسمین، ہندوستان اسٹنڈرڈ، امرت بازار پتریکا، السٹریٹیڈ ویکلی اور دوسرے انگریزی جرائد میں بھی برابر لکھتے رہتے ہیں، قہقہوں میں باتیں کرنے کے عادی ہیں،

ان حضرات کی معیت میں امینیہ ہوٹل ۱۔ کورپریشن اسٹریٹ پہنچا، جہاں ایک بہت آرام دہ کمرہ میں میرے قیام کا انتظام تھا، اسکے مالک حاجی عبد القیوم صاحب ہیں، دریا باد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، لیکن اب کلکتہ ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں، کلکتہ کے مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی

اور معاشرتی کاموں میں شوق سے حصہ لیتے رہتے ہیں، اپنے اخلاص اور حسن اخلاق کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ایران سوسائٹی سے بھی ان کو گہری دلچسپی ہے،

شام کو خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی لے گئے، اس کو میں نے ۱۹۶۹ء کے ستمبر میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس تین برس کے اندر اس میں پہلے سے زیادہ رونق دیکھی، خصوصاً اس کے کتب خانہ میں ڈاکٹر محمد اسحٰق کے کتب خانہ کے آجانے سے اس کی زینت میں اضافہ ہوگیا ہے، وہاں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی سے ملاقات ہوئی، جو اس وقت کلکتہ مدرسہ میں حدیث اور تفسیر کے قابل اور مقبول استاد ہیں، ان سے پرانی ملاقات ہے، اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی بے تکلفی سے ملے۔

شام کو ساڑھے چھ بجے مقالہ پڑھنا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب نے وقت سے پہلے وہاں ایک چائے رکھی تھی، وہاں مجھکو لے گئے، بہت سے معززین سے تعارف ہوا، مگر مجھکو جادو یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر جگدیش نراین سرکار سے مل کر خاص طور سے خوشی ہوئی، وہ پٹنہ یونیورسٹی کے بڑے ممتاز اور مشہور طالب علم رہے ہیں، یہ میری بھی مادر درسگاہ رہی ہے، وہ مجھ سے دو سال آگے تھے، انھوں نے میٹرک سے ایم، اے تک اول پوزیشن حاصل کی، طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے سنجیدہ، خاموش اور الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے، ہم لوگ دور سے ان کو ایک ہیرو کی حیثیت سے دیکھا کرتے تھے، ان سے تقریباً چالیس برس کے بعد ملاقات ہوئی، اس اثنا میں انھوں نے سرجدو ناتھ سرکار کی نگرانی میں بھی کام کیا، جادو یونیورسٹی کے ایک لائق اور قابل استاد ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، آجکل ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر انگریزی میں کتاب لکھ رہے ہیں، اس موضوع پر میری بھی ایک کتاب نکل چکی ہے، یہ انکی نظر سے گذری ہے، اسکا ذکر دیر تک کرتے رہے، ان ہی کی صدارت میں جلسہ ہونے والا تھا جس سے مجھے اندرونی مسرت ہوئی انھوں نے بیگ سے اپنا ایک انگریزی مضمون نکال کر دیا، جس کا عنوان یہ ہے:

Islam in Bengal (13Th To 19Th Centuries) ۔ اس کو میں نے بعد میں پڑھا، تو مجھکو بہت پسند آیا، اب اس کا ترجمہ معارف کی کسی قریبی اشاعت میں شائع ہوگا،

مقالہ خوانی کے جلسہ میں سامعین کی تعداد عموماً بہت کم ہوتی ہے، مگر میری توقع کے خلاف کافی لوگ اس میں شریک ہوئے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے کہا کہ ایران سوسائٹی کے جلسہ میں لوگ شوق سے آتے ہیں، پھر یہ بھی کہہ کر شاید مجھکو خوش کرنے کی کوشش کی کہ آج کا موضوع کچھ ایسا دلچسپ ہو کہ لوگوں کو اس کے سننے کا بڑا اشتیاق ہے، جو حضرات اس میں شریک ہوئے ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کا ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہاں کے علمی حلقہ کی ایک جھلک معارف کے ناظرین کے سامنے بھی آجائے گی،

مسٹر آر. بی سرکار صدر ایران سوسائٹی، مسٹر جے . ان تعلقدار، آئی سی ایس (ریٹائرڈ) نائب صدر سوسائٹی، خواجہ محمد یوسف صاحب ٹریژرر سوسائٹی، جناب عبد المجید صاحب جنرل سکریٹری، مسٹر اے کور ساہنی اسسٹنٹ جنرل سکریٹری کے علاوہ معززین شہر میں مسٹر ایس، بی رائے، کمشنر سپلائی حکومت مغربی بنگال، الحاج جناب امیر حسن صاحب، مالک سامہ موسی شوگر ورکس مل، الحاج عبد القیوم صاحب، مالک امینیہ ہوٹل، جناب احمد سعید صاحب اڈیٹر آزاد ہند، جناب عبد المجید صاحب پروپرائٹر رسل اکسچینج، جناب خلیل الرحمن صاحب مجسٹریٹ سیالدہ پولیس کورٹ، مولانا عبد الفتاح قیم جماعت اسلامی مغربی بنگال و آسام، اور جناب ایس، آر سالک، اور مسٹر ہاشم عبد الحلیم (ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے بھتیجے) تھے، تعلیمی حلقوں سے مسٹر ڈی، پولاڈون پرنسپل آرمینس کالج، ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی، پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صدر شعبۂ فارسی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج، جناب ایس، ایم شاہ القادری، استاد عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جناب عبد الرؤف صاحب استاد اردو کلکتہ یونیورسٹی،

جناب محمد اسمعیل صاحب استاد عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جناب محمد سمیع اللہ اسد صاحب استاد عربی مولانا آزاد کالج، جناب جاوید نہال صاحب استاد اردو مولانا آزاد کالج، جناب شاہ وصی الدین احمد صاحب انندا موہن کالج، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاد تفسیر و حدیث کلکتہ مدرسہ، جناب علقمہ شبلی صاحب، استاد کلکتہ مدرسہ اور ڈاکٹر مجیب الرحمن صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج شریک ہوئے،

مقالہ کا لکھنا میرے لیے بہت صبر آزما ثابت ہوا تھا، جب اسکو لکھنے کا ارادہ کیا تو اتنے مواد ملے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی تھی، اس کو سمیٹ کر ایک ایسا مقالہ لکھنا تھا جو ایک گھنٹہ کے اندر پڑھ کر ختم ہو جائے، مقالہ پھیلا، سمٹا، سمٹ کر پھیلا اور پھر پھیل کر سمیٹا گیا، میں خود خوش تھا کہ فارسی لٹریچر میں اس ملک سے حب الوطنی اور عقیدت کے کیسے کیسے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، اگر ان کو برابر پیش کیا جاتا رہے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں، فارسی نثر اور شاعری دونوں میں ایسے مواد کی بڑی فراوانی ہے، میں نے تاریخ یمینی، تاج المآثر، برنی اور عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، تزک تیموری، تزک بابری، آئین اکبری، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، بادشاہ نامہ، سیر المتاخرین، ریاض السلاطین وغیرہ سے نثر کے جو ٹکڑے جمع کیے ان کو یہاں پر پیش کرنا ممکن نہیں،

اسی طرح فارسی زبان کے مصنفوں نے ہندوستان کے مختلف علوم و فنون سے جو دلچسپی لی، اسکا ذکر بھی مقالہ میں کیا گیا ہے، باغبانی، مصوری، موسیقی، فن تعمیرات اور دوسرے تمدنی کارناموں کے ذریعہ سے ہندوستان کو جس طرح جنت نشان بنا کر اس کو خلد بریں اور بہشت ہشتمیں بنانے کی کوشش کی گئی، اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی، ان تمام چیزوں کا ذکر یہاں پر طوالت کا باعث ہوگا، البتہ ہندوستان اور اس کے مختلف حصوں پر شعراء نے جو مدحیہ اشعار لکھکر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان میں سے کچھ معارف کے ناظرین کی خدمت میں بھی ہدیہ کرنے کو جی چاہتا ہے،

مولانا منہاج سراج مولف طبقات ناصری شاعر بھی تھے، ان کو فخر تھا کہ سلطان شمس الدین التمش

کے دور میں دلی میں اسکے ادنیٰ غلام قیصر و کسریٰ اور خان چین سے زیادہ اچھے تھے۔

کمیں بندۂ او بہ از قیصر و کسریٰ ۔۔۔ کمیں چاکر او بہ از خان چین تتار

عصامی نے فتوح السلاطین میں اسی دور کے دہلی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

دراں شہر یک رو نقے شد پدید ۔۔۔ بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیدانِ صحیح النسب ۔۔۔ رسیدند دروے ز ملکِ عرب
بسے کاسبانِ خراساں زمیں ۔۔۔ بسے نقشبندانِ اقلیم چیں
بسے عالمانِ بخارا نژاد ۔۔۔ بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک ہر جنس صنعت گراں ۔۔۔ ز ہر شہر ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدانِ جواہر شناس ۔۔۔ جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیمانِ یوناں طبیبانِ روم ۔۔۔ بسے اہلِ دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند ۔۔۔ چو پروانہ بر نور شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد ۔۔۔ دیارش ہمہ دار اسلیم شد

امیر خسرو تو اس کے قائل تھے کہ ملک کی محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا ہے،
کہتے ہیں:

ویں ز رسول آمدہ کایں زمرۂ دیں ۔۔۔ حب وطن ہست ز ایماں بیقیں

وہ تو اسی محبت میں ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے بہتر سمجھتے رہے،
اس کے لیے اپنی مثنوی نہ سپہر میں بہت سے دلائل دیے ہیں، اور پھر اسی مثنوی میں بڑی مسرت
اور فراخدلی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان تمام ممالک سے بہتر اور برتر ہے، وہ
کہہ اٹھے ہیں کہ

حکمت و دانائی و علم و ہنر وانچہ کہ در ہند معاینست دگر

وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں ع کشور ہند است بہشتے بزمیں

وہ یہ بھی کہتے ہیں

ہند چو از خلد نشاں بود درو زادم خدایش قدم آسود درو

وہ ہندی اور سنسکرت کی خوبیوں کے بھی معترف رہے

زبان ہندیم تازی مثال است کہ آمیزش در انجاکم مجال است

لکھتے ہیں کہ سنسکرت عربی سے تو کمتر لیکن فارسی سے برتر زبان ہے، اس میں فارسی سے کم شیرینی اور مٹھاس نہیں،

آنست زبانے بہ صفت در دری از عربی کمتر و برتر از دری

گرچہ کہ شیرینست دری شکریں ذوق عبارت کم ازاں نیست دریں

وہ تو ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جو جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی متاثر رہے، کہتے ہیں ؎

ہست عجب مردن ہندو بوفا مرد نش از تیغ و ز آتش بجفا

زن زپے مرد بسوزد بہوس مرد ز بہر بت و با منعم و بس

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں لیک چو بس کار بزرگ است ببیں

گر بشریعت بود ایں نوع روا جاں بدہند اہل سعادت بہوا

وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری ہم ز وے آموز پرستش گری

وہ تو ہندوستان کے نسوانی حسن کے اس طرح قائل رہے کہ اپنی مثنوی دول رانی

میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان کی حسین عورتیں مصر، روم، قندھار، سمرقند، خطا، ختن، خلخ اور تمام حسینانِ عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں، اس کے لیے طرح طرح کے دلائل دیے ہیں، وہ تو نہ صرف یہاں کے حسینوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، بلکہ انکی شاعری کا آرٹ پان، آم، ہندوستانی پھولوں، پھلوں، جانوروں، کپڑوں اور یہاں کی تمام چیزوں کی مدح میں پورے طور پر دکھائی دیتا ہے، دہلی تو ان کا وطن ہی ہوگیا تھا، اس لیے اسکی تعریف میں ان کا قلم کیوں نہ نشاط انگیز ہو جاتا، کہتے ہیں:

حضرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن ست کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات
گر شنود قصۂ ایں بوستاں — مکہ شود طائف ہندوستاں
شہر بنی را لب ہر دو قسم — شہر خدا گشتہ ز عیبش اصم
قبۂ اسلام شدہ در جہاں — بستہ او قبۂ ہفت آسماں

امیر خسرو کے یار غار امیر حسن سجزی کو بھی ہندوستان، دہلی اور اس کے ہر شہر سے اسی طرح محبت رہی، وہ اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کے حکم سے دولت آباد منتقل ہو گئے تو دہلی کو یاد کرکے لکھتے ہیں،

کجاست حضرت دہلی و خوبرو یانش — یکے بہشت دروں و بروں او پُر حور

لیکن جب دولت آباد ان کا وطن ثانی ہو گیا تو اس کی محبت میں لکھتے ہیں:

زہے خرم بنائے دولت آباد — کہ ہم بر پائے دولت باد بنیاد
خداوندا ازیں ایں مکاں را — بدہ قدرے کہ وادی آسماں را

اپنی ایک نظم میں ناگور کا ذکر اس طرح کیا ہے،

سوادش چو خط معشوق دلکش — درو آبے چو اشک عاشقاں وش

وہاں کی عورتوں کے متعلق کہتے ہیں:

زبان نسیم سا سیاہ سمن ساق	نہ چوں مہ بل چو خورشید از بتان طاق

وہاں کے حسن و عشق کی ایک سچی داستان لکھتے ہوئے اس معشوقہ کی قلمی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

بت ہندو نسب چوں ترک خوں ریز	بلب شکر بہ غمزہ شور شش انگیز
چہ کبکی از کدامین کوہساری	کہ چوں رفتار خوش گفتار داری
بہشتت با ہمہ حوران غلامست	اگر حوری بہشت تو کدامست

اس کے سو کر اٹھنے کی تعریف اس طرح کی ہے

بت ہندو سرشت از خواب برخاست	نقاب ابر از مہتاب برخاست

سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں چنگیز خاں کے پوتے نے اپنا ایک ایلچی بھیجا، تو اس کو مرعوب کرنے کے لیے ہر قسم کی شان و شوکت دکھائی گئی، اس موقع پر مولانا منہاج سراج کہہ اٹھے کہ دھلی تو بہشت ہشتمیں اور ہندوستان خوشتر زچین ہوگیا

ز ترتیب نہاد و رسم و آئین نشاط او	تو گفتی عرصۂ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ
مبارکباد بر اسلام ایں بزم شہ عالم	کزیں ترتیب ہندوستاں بسے خوشتر ز چیں گشتہ

تاتاریوں کے مختلف حملوں کا ذکر عصامی نے فتوح السلاطین میں کیا ہے، ہندوستان کی فوج کی برتری اور تاتاریوں کی پسپائی کی مرقع آرائی کرنے میں عصامی نے فردوسی کے قلم کا زور دکھانے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں اس کے قلم سے غالباً ہزاروں اشعار نکلے ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے

سپہ راند صفدر ہندوستاں	بگشت از شکوہش سر آسماں
ز ہندی سواران بل سی ہزار	ہمہ تر وپیں انداز و نیزہ گذار
بدشمن شکارے ہمہ چیرہ دست	خروشان و جوشان تر از پیل مست
ز آہن قبا و کلاہ ہمہ	کمر بستہ گرگاں بقصد رمہ

ستادند پیش سپاہ مغل ٭ ہر سو گرفتند راہِ مغل
مغل بیشتر زانکہ راند سپاہ ٭ جہاں دید از گرد گشتہ سیاہ

ایک دوسری جگہ ہندوستانی فوج پر فخر کرتا ہوا لکھتا ہے

ندارد کسے یاد اندر جہاں ٭ چنیں شاہ و لشکر بہ ہندوستاں
گماں می برم بلے شیر نامور ٭ کز آلِ کیانی بدیں کروفر
چنیں آید از خسروان دلیر ٭ کہ باشند در بیشۂ خود چو شیر

اور جب تاتاری پسپا ہو جاتے ہیں تو اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتا ہے

چو بشنید صفدار ہندوستاں ٭ کہ باد خزاں رفت ازیں بوستاں
نرفتند شیران شرزہ شکار ٭ بدنبال سگ خاصہ وقتِ فرار
بمعنی مغل راز ہندوستاں ٭ بروں کردہ چوں بوم از بوستاں

عصامی نے ایک جگہ ہندوستان کی تعریف دل کھول کر کی ہے جس میں سے چند اشعار یہ ہیں

خوشا رونقِ ملک ہندوستاں ٭ کہ جنت برد رشک ازیں بوستاں
سوادش شدہ زیب روئے زمیں ٭ چو خالے بہ رخسارِ ہر نازنیں
چو کبریت احمر درو خاک گشت ٭ بہ ہر چار فصلش ہوائے بہشت
سرشتہ ہمہ خاکِ او با گلاب ٭ در و شبنمے دادہ نفعِ سحاب
کشا یش ہمہ گلبن و میوہ دار ٭ زمیں سایہ در سایہ از شاخسار
معطر شدہ خاکش از بوئے گل ٭ معطر شدہ آبش از روئے گل
زخاکش قوی گشتہ اصل بشر ٭ ز بادش شدہ خوش ہوائے سحر

بدر چاچ نے نگرکوٹ کے قلعہ پر ایک قصیدہ کہہ کر گویا ہندوؤں کے فن تعمیرات کو خراج تحسین پیش کیا ہے

زہے حصار کریبی ز حلقہ درا دست	محیط نہ ز بعض سخت قلعہ مین
چہ قلعہ ایست کہ فرشی بود ز رفعت او	فضائے عرصۂ بام رواق او دانا

فیروز شاہ تغلق کے ساتھ مطہر سندھ کے شہر ٹھٹھہ گیا تو اس پر ایک لمبی نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

نے نے کہ شہر نیست بہشتی ست دلپذیر	آراستہ بسندس و استبرق و حریر
آبش ہمہ گلاب و گلابش ہمہ عبیر	خشتش ز زر سرخ و زمینش ز سیم ناب

فیروز شاہ نے جب فیروز آباد بسایا تو مطہر نے اس پر ایک ترکیب بند کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

حبذا شہر گزیں حضرت فیروز آباد	کہ در و جوی خلد واست دیناہا بہ عداد
ہر طرف طرفہ عمارات ارم ذات عماد	ہر سوئے نزہت صحراے و تماشای سواد
آفریں باد بریں شہر و بدیں شاہ جواد	کایں چنیں شہر جہانگیر ازو شد بنیاد

ابوالفضل اور فیضی کو تو ہندوستان سے عشق رہا، ابوالفضل کی آئین اکبری تو ہندوستان کا قصیدہ معلقہ ہے فیضی بھی ابوالفضل ہی کی طرح ہندوستان کی محبت کا دم بھرتا رہا، کہتا ہے

ہند است و ہزار عالم عشق	ہندست و جہاں جہاں غم عشق
بے نقش و فا خط جبیں نیست	بے رنگ جگر گل زمیں ہست
خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہرست	ہر ذرہ چراغ نہ سپہرست
عشق عرب و عجم شنیدم	از ہند بگویم انچہ دیدم
ایں شعلہ بہ ہند گرم خیزست	اینجاست کہ آفتاب تیزست

شاہجہانی دور کا ملک الشعراء ابو طالب کلیم تو ہندوستان کا راگ مختلف طریقے سے الاپتا رہا،

خوشا ہندوستاں ماوائے عشرت	سواد اعظم اقلیم راحت
ز خاک پاک او برداشتن کام	چناں آساں کہ برداردکسے کام

کلیم کو ہندوستان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ ایک بار اس کو اپنے عزیزوں کے ساتھ ایران جانا پڑا تو روتا دھوتا گیا اور ہندوستان کی یاد میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا ،

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم — کجا خواہد رسانید پرفشانی مرغ بسمل را
بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہی — بپائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را
ز شوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم — کہ رو ہم گر براہ آرام نمی بینم مقابل را

مختلف علاقوں اور شہروں پر بھی محبت بھرے اشعار بکثرت ملیں گے، کشمیر پر تو اتنی نظمیں کہی گئی ہیں کہ یہ کئی جلدوں میں شائع ہو سکتی ہیں ، ابوطالب کلیم نے اکبرآباد پر بڑے اچھے قصیدے کہے ہیں ، ملا محمد صوفی مازندرانی (المتوفی ۱۰۳۵ھ) ہندوستان آئے اور گجرات میں سورت میں متوطن ہوئے تو اسکی تعریف میں کہتے ہیں ،

بہ گجرات آرند باخود مبر دل — کہ آنجا دل ربا بیش از شمار است
مقرِ من از آں شد شہر سورت — کہ دانستم کہ ایں دار القرار است
جمال ایں جاندار و باوفا جنگ — صباحت با ملاحت نیز یار است

داراشکوہ کے مرشد ملا شاہ نے اپنی ایک مثنوی نسبت میں ہر جگہ کا ذکر اسکی خصوصیت کے ساتھ کیا ،
جعفر بیگ بینش کشمیری شاہجہانی عہد کا شاعر تھا، اس نے اپنی مثنوی بینش ابصار میں دہلی ، لاہور اور پنجاب وغیرہ کی تعریف کی ہے ، بنارس کے متعلق وہ کہتا ہے ،

بنارس را عجب آب و ہوائیست — برائے عشق بازی طرفہ جائیست
زن و مرد از محبت گشتہ مفتوں — چو زلف لیلے و زنجیر مجنوں
بتانش از نمک نیکو سرشتند — کہ موج سبزۂ باغ بہشتند
دریں کشور کہ از عشق فسوں ساز — ہم کفر و مسلمانیست ہمراز

بنارس پر تو علی حزیں (المتوفی ۱۱۸۰ھ) نے بہت سے اشعار کہے ، ان ہی کا یہ شعر ہے

از بنارس نروم معبد عام است اینجا — ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

غالب نے تو بنارس پر چراغ دیر کے نام سے پوری ایک مثنوی کہہ ڈالی ہے، جس میں ۱۰۴ اشعار ہیں، اس کا ایک شعر یہ ہے:

گر گوئی بنارس شاہدے است — ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ان اشعار کو سنکر سامعین محظوظ تو ضرور ہو رہے تھے، مگر کلکتہ میں بیٹھکر بنگال کی مدح سننے کے لیے زیادہ بیچین تھے، مقالہ میں ابوالفضل کی آئین اکبری، غلام حسین طباطبائی کی سیرالمتاخرین اور غلام حسین سلیم کی ریاض السلاطین سے بنگال، لکھنوتی، بوگلا، بارک آباد، بڑوہا، مداران، ندیا، مرشدآباد کے متعلق دلچسپ اور تعریف آمیز ٹکڑے جمع کیے گئے تھے، اس خطہ سے اس لحاظ سے بھی دلچسپی دکھلائی گئی کہ ایک نامعلوم مورخ نے عبرت ارباب بصر، منشی سلیم اللہ نے تواریخ بنگالہ، یوسف علی خاں نے تاریخ بنگالہ مہابت جنگی، غلام حسین طباطبائی نے سیرالمتاخرین، کرم علی نے مظفر نامہ، غلام حسین سلیم نے ریاض السلاطین اور کلیان سنگھ نے واردات قاسمی لکھ کر بنگال کے مختلف ادوار کی تاریخ مرتب کرکے اس کو محفوظ کر دیا، شعراء بھی بنگال کی مدح میں اشعار کہتے رہے، بنگال کی برسات سے غالباً بنگال کے لوگ بھی پریشان رہتے ہیں، لیکن شاہجہانی دور کے ایک شاعر مرزا صادق (المتوفی ۱۰۶۱ھ) کو وہاں کی برسات بہت پسند آگئی، اس نے اس کو موضوع بناکر جو اشعار کہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

خوشا ملک بنگالہ در برشگال — سوادش بروے زمیں ہمچو خال

زمیں پر ز آب و ہوا پر ز تیغ — نہاں آب در سبزہ چوں آب میغ

سیہ ابر پیوستہ در ہائے و ہوئے — تو گوئی بلا یست تکبیر گوئے

ز گلہا زمیں گنج پر پیشنگ — نگہبان او اژدہا سے چو گنگ

ز کوہ آبشار آنچناں ریختہ — تو گوئی فلک کہکشاں ریختہ

جہانگیر کے دور میں محمد قاسم خاں مینجہ بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو اسکی تعریف میں

جو شعر کہا، اس سے بڑھ کر مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔

سواد سبزۂ بنگالہ را ہر کس کہ دریابد ۔۔۔ بود او در زمیں گر با بہشتی کار می ماند

منیر لاہوری نے تو بنگال پر پوری مثنوی لکھ دی جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شائع بھی ہو گئی ہے۔ انیسویں صدی میں ایک شاعر آزاد نے ڈھاکہ پر اور خان بہادر مولوی حمید اللہ نے چاٹگام کی تعریف میں نظمیں کہیں، کلکتہ پر ریاض السلاطین میں ایک لمبی نظم ہے جسکے کچھ اشعار یہ ہیں:

زہے شہر کلکتہ در ملک بنگ ۔۔۔ کہ ہست آں نمودار چین و فرنگ

عمارات آں دلکش و جانفزا ۔۔۔ ہمہ سر کشیدہ با وج ہوا

صنائع دراں کرد استاد کار ۔۔۔ ہمہ رنگ رنگ و ہمہ خوش نگار

ہر کوچہ اش مہ رخاں در طواف ۔۔۔ ببر کردہ پوشاک رنگین و صاف

رخ شان چو ماہ منور بتاب ۔۔۔ تو گوئی زمیں سیر شد ماہتاب

یکے چوں مہ و آں دیگر مشتری ۔۔۔ یکے ہمچو زہرہ بہ جلوہ گری

زبس شد چو سیارہ ہر سو چنان ۔۔۔ شدہ کوچہ ہا نقشۂ کہکشاں

بہ بینی کنی گر بہ بازار رو ۔۔۔ متاع نفیس جہانی در و

بود ہر چہ در ربع مسکوں قماش ۔۔۔ بیابی ببازار او بے تلاش

گر از اہل صنعت نمایم رقم ۔۔۔ چناں نقش صورت نہ بندد قلم

ولی ہست مشہور در خاص عام ۔۔۔ کہ صنعت بچین و فرنگ است تمام

بہ گلگشت مردم چوں آں نور دند ۔۔۔ چو سیارہ در سیر باہم شوند

چنیں شہر در ملک بنگالیاں ۔۔۔ ندیدست کس نے شنیدہ چناں

غالب کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات بھی دیے گئے جن میں کلکتہ کی تعریف ہے،

اور پھر ان کے اشعار بھی پیش کیے گئے۔

حالِ کلکتہ باز جستم بایداقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد در وے گفت از ہر دیار و از ہر فن

اسی سلسلہ میں غالب کے وہ مشہور اردو اشعار سنائے گئے، جس کا پہلا شعر یہ ہے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

آخر میں ایران کے سابق سفیر ہند حکمت علی اصغر کے یہ اشعار بھی سنائے گئے

چو تیر نگاہت بہ جگر منہ ندیدم چو ناوکِ مژگان تو البتہ ندیدم
دیدم بہ جہاں شہر بسے خرم و آباد شہرے بدلآرائی کلکتہ ندیدم

کلکتہ میں بیٹھ کر بنگال اور کلکتہ کی تعریف سنکر وہاں کے لوگوں کا محظوظ ہونا ناگزیر تھا،

جلسہ میں بظاہر شعر و شاعری کے بزم کی فضا قائم ہوگئی تھی، ۴۵ صفحے کا مقالہ بعض حصے کو حذف کرنے کے باوجود ۵۰ منٹ میں ختم ہوا، اوپر صرف خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ جب یہ مقالہ ختم ہوا، تو حاضرین نے بہت سے سوالات کیے، جن سے اندازہ ہوا کہ یہ طویل مقالہ ان کے لیے صبر آزما ثابت نہ ہوا بلکہ انھوں نے دلچسپی سے سنا۔ پروفیسر جگدیش سرکار اپنی اختتامی تقریر کے لیے ایک پُر مغز تحریر لکھ کر لائے تھے، مگر انھوں نے اس کو پڑھنا پسند نہیں کیا اور اپنی انتہائی شرافت و اخلاق میں کہا کہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد وہ آج رات کے مقالہ نگار کے سامنے محض ایک ڈوارف (بونا) نظر آئیں گے، یہ کہکر انھوں نے محض اپنی خاکساری کا ثبوت دیا، ورنہ ان کے قلم سے جو بھی تحریر نکلتی ہے اس سے ان کی علم کی گہرائی اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنی تحریر پڑھتے تو ہم سب مستفید ہوتے،

آخر میں ایران سوسائٹی Iran Society کی طرف سے صدر جلسہ کے ہاتھوں Silver Jubilee Souvenir (1944-1969) کی ایک جلد مجھکو دے کر میری عزت بڑھائی گئی،

ایران سوسائٹی کا تازہ علمی کارنامہ ہے، ۴۰۰ صفحے پر مشتمل ہے، بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ تیار کی گئی ہے، اس میں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے تقریباً تیس مشہور اہل قلم کے بڑے بلند پایہ اور گرانقدر مقالات ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم ایران سوسائٹی کی پچیس سالہ جوبلی کی خوشی میں اس کو مرتب کر رہے تھے، اس کا کچھ حصہ انکی نگرانی میں چھپ بھی چکا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات ہوگئی، تو پھر یہ کام ایک اڈیٹوریل بورڈ کے ذریعہ طے پایا، جس میں ڈاکٹر اے، کے برق، مسٹر ڈی پولیسٹر جناب خواجہ محمد یوسف اور جناب ام، اے، مجید صاحبان تھے، یہ جلد ایران سوسائٹی کے بہت ہی اہم کاموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، معارف میں آیندہ اس پر تفصیلی ریویو شائع ہوگا، جلسہ کی کاروائی جیسے ہی ختم ہوئی تو جناب الحاج امیر حسن صاحب میری طرف بڑھے، ان کی داڑھی سرسید احمد خاں کی یاد تازہ کرتی تھی، ان کا چہرہ بڑا منور اور متدین نظر آیا، انگریزی سوٹ پہنے ہوئے، جس کے اندر سے ان کی مذہبیت اور بھی زیادہ نکھری اور ستھری معلوم ہو رہی تھی، جلسہ کے اور معزز حاضرین سے بے تکلفانہ انداز سے ملنے ملانے کے بعد یہ دلچسپ صحبت ختم ہوئی۔

اسی کے بعد خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی طرف سے امینیہ ہوٹل میں ایک ڈنر رکھا تھا جس میں جلسہ کے بہتیرے شرکاء کے علاوہ کالکتہ ہائی کورٹ کے آنریبل جسٹس ایس، اے، مسعود اور وہاں کے مشہور رہنما خان بہادر جان محمد صاحب بھی شریک ہوئے، مسٹر جسٹس مسعود اب حکومت ہند کے فنانس کمیٹی کے رکن ہو گئے ہیں، بہت ہی اخلاق سے ملے، ان کی مادری زبان بنگالی ہے، لیکن گفتگو اردو ہی میں کی، خان بہادر جان محمد صاحب کے اسم گرامی سے اچھی طرح واقف تھا، اخباروں میں ان کا ذکر برابر آتا ہے، میری ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی، وہ شروانی، داڑھی اور منور چہرہ کے ساتھ بہت بھلے اور باوقار نظر آئے، ان کے علاوہ کلکتہ کے دو ممتاز ایڈوکیٹ جناب شہادت حسین اور جناب سید

ابو المنصور حبیب اللہ بھی تھے۔ ڈنر ختم ہوا تو میری توقع کے خلاف جناب خلیل الرحمن صاحب مجسٹریٹ ایک نظم پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جس میں کچھ میرا ذکر کرکے یہ بھی پڑھا ؎

بزم ایران میں ہو ہمیشہ بہار — لگے اس کو نہ کبھی باد سموم

اس کے بعد جناب علقمہ شبلی صاحب نے ایک نظم بہار سلیمانی کے عنوان سے پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

گلشن شبلی نعمانی سے آئی بوئے نسیم — دوش پر اپنے لیے ملک سلیماں کی بہار

اس کے بعد جناب احمد سعید اڈیٹر آزاد ہند نے ایک تقریر کی جس میں دار المصنفین کے کارناموں کو سراہا، اس کے جواب میں مجھ سے بھی جو کچھ بن پڑا، تھوڑی دیر تک بولتا رہا، یہ صحبت بھی دلچسپ رہی، اور تقریباً بارہ بجے رات کو ختم ہوئی، صبح کے وقت میں سو کر جیسے ہی اٹھا تو جناب احمد سعید صاحب میرے کمرے میں آئے، ان کے ہاتھ میں آزاد ہند تھا، جس میں رات کے جلسہ اور کھانے کی روداد بھی موجود تھی، اس عاجلانہ رپورٹنگ سے آزاد ہند کی کارکردگی کا اچھا اثر پڑا، ابھی احمد سعید صاحب باتیں ہی کر رہے تھے کہ جناب شاہ مقبول احمد صاحب صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج ملنے آگئے جو محض ان کی محبت کا ثبوت تھا، وہ بہار ہی کے ہیں، اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ دار المصنفین سے بہار کی تاریخ شائع ہونی چاہیے، میں نے ان سے کہا کہ بہار کے اہل قلم بہار میں رہ کر تاریخ مرتب کر دیں تو دار المصنفین اس کو ضرور شائع کر دے گا، انھوں نے مجھ سے لکھنے کو کہا، مگر میں نے ان سے ہنس کر کہا، اب تو میں چالیس برس کے بعد خالصتہً یو۔ پی کا ہو چکا ہوں، اس کے بعد جناب عبد المجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور پروفیسر عطا کریم برق آگئے۔ میں برق صاحب کے ساتھ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب سے ملنے چلا گیا، انھوں نے ۶۔ سہروردی ایونیو میں ایک بڑا مکان بنا لیا ہے، اس میں ہر طرح کی خوش سلیقگی، صفائی اور ستھرائی دکھائی دیتی ہے، ان سے

پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی وہ میرے استاد بھی رہ چکے ہیں، انکی نگرانی میں پی، ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھنا شروع کیا تھا، جو ہندوستان کے صوفیائے کرام کے حالات اور علمی کارناموں پر مشتمل تھا، جب یہ ختم ہوا تو ان بزرگان دین کو دنیاوی کاموں میں استعمال کرنا اچھا نہ سمجھا، اسلیے یہ بزم صوفیہ کے نام سے دارالمصنفین سے شائع ہوگئی ہے، مگر اسکے محرک ڈاکٹر صاحب ہی تھے، جس کیلیے ان کا ابتک شکر گذار ہوں، وہ حسب معمول بڑی شفقت سے ملے، اس مرتبہ انکو بہت ضعیف پایا، پھر بھی کچھ نہ کچھ علمی کام کرتے رہتے ہیں، اپنے ایک تازہ مقالے کی مطبوعہ کاپی دی، جو دہلی کے رسالہ اسٹڈیز ان اسلام میں اطراف الحدیث کے عنوان سے شائع ہوا ہے، شام کو جناب احمد سعید صاحب کے یہاں ایک دلچسپ صحبت رہی، وہ اپنے فلیٹ پر بہت ہی سلیقہ سے رہتے ہیں، تقسیم ہند سے پہلے وہ کچھ دنوں دارالمصنفین میں قیام کر چکے تھے، میں انکے والد مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے دہلی میں برابر ملتا رہا، بلکہ ایک بار انکے یہاں نردولا ہوٹل میں کافی دنوں تک مقیم بھی رہا، اسی لیے ہم دونوں عزیزانہ طور پر ملے، اس نشست میں زیادہ تر انکے والد مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گہرے تعلقات کا ذکر رہا، کچھ رات گذرے اپنے کمرہ میں پہنچا تو مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی اور حسن زماں صاحب وہاں موجود تھے، مولانا معصومی بارہ بجے رات تک دینی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے جس سے متاثر ہوا، حسن زماں صاحب کلکتہ کے ایک مخلص اور علم دوست نوجوان ہیں، انکے گھر میں بنگالی اور اردو دونوں بولی جاتی ہے، مگر انکو ہندوستان کے تمام اہل علم اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی تمام خانقاہوں سے گہری دلچسپی ہے، دوسری صبح کو دہلی کی واپسی تھی، جناب عبدالمجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور جناب احمد سعید صاحب ساتھ اسٹیشن چلے، اسی صبح کو احمد سعید صاحب نے اپنا سفرنامہ "ڈھنڈ کے گھر میں" پڑھنے کو دیا، اور جب گاڑی چلنے کو تھی تو ایک صاحب حسن زماں صاحب کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے، انکے ہاتھ میں بزم صوفیہ تھی، تصنیف کے ساتھ شاید اسکے مصنف کو دیکھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی جلدی سے میرے ہاتھ میں دیا، اسکا نام "مان تھا" اسی میں انکا نام حسین وارثی سہسرامی صاحب پڑھا، گاڑی چلی تو "ڈھنڈ کے گھر" پڑھنا شروع کیا، جو اس قدر دلچسپ اور پُرتاثیر تھی کہ دن بھر کا سفر اسی کو لطف و لذت سے پڑھنے میں گذر گیا، مرتب کی گہری مذہبیت سے متاثر ہو کر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں،

مطبوعات جدیدہ

نقد ابوالکلام مرتبہ ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب صدر شعبۂ اردو، عربی، فارسی، سری وِنکٹیشور یونیورسٹی، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت غنیمت صفحات ۵۱۱ مجلد قیمت درج نہیں، شائع کردہ رجسٹرار سری وِنکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی (آندھرا)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں زیر نظر کتاب ان سب میں زیادہ ضخیم ہے، اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم "یہ تصنیف کہنے کو "نقد ابوالکلام" ہے لیکن حقیقتاً اردو کے انانیتی ادب کا تفصیلی اور تقابلی مطالعہ ہے"، یہ چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں انانیت کی حقیقت و ماہیت اور اس کے خط و خال اجاگر کئے گئے ہیں، اور آخری باب میں مولانا کے افکار و تصورات کا جائزہ لیکر انانیتی ادب کے بارہ میں ان کی جدت و انفرادیت اور امتیازی کمالات و خصوصیات دکھائے گئے ہیں، درمیان کے چار ابواب میں بالترتیب میر، غالب، سرسید احمد خاں اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے انانیتی رجحانات و میلانات کا ذکر کرکے ان سے مولانا کی انانیت کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا اردو کے انانیتی ادب کی تاریخ اور اس کا مفصل تجزیہ ہے، اور اس میں تنہا مولانا ہی کے کارنامے اور انانیتی رجحانات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اردو کے مذکورۂ بالا چاروں مشاہیر کے علاوہ اور اساطین شعر و ادب کے انانیتی میلان و نقطہ نظر پر بھی سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، ابھی تک

اردو کے انانیتی ادب کے بارہ میں اس قدر مفصل اور پُر از معلومات کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی،
لائق مصنف نے اردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں اور مبصروں کے
خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس لئے یہ بڑی قابل قدر اور ضخیم ہونے کے باوجود دلچسپ اور
پُر از معلومات کتاب ہے، لیکن غالب و ابوالکلام کے تقابلی مطالعہ کے ضمن میں مولانا کی انانیت
کی برتری دکھاتے وقت دونوں کے عہد کے فرق کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جبکہ سرسید اور مولانا کے
موازنہ میں مولانا کے ترجیحی پلڑے کو عہد کے فرق کا نتیجہ بتایا گیا ہے، سرسید اور مولانا کے مواز
کے باب میں "تفریق ملت اور تقسیم انسانیت" کے زیر عنوان سرسید مرحوم کی جو تحریریں نقل
کی گئی ہیں، ان میں مسلمانوں کے نقلی و فروعی اختلافات کا ماتم ہے، حالانکہ مولانا نے بھی مختلف
مذاہب کے تفرقے کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح سرسید نے "وحدت دین" کے پہلو کو صرف نمایاں
کیا ہے، لیکن مولانا "وحدت ادیان" کے داعی معلوم ہوتے ہیں، ظاہر ہے ان دونوں کی نوعیتو
میں بڑا فرق ہے، مولانا کی طرح سرسید کو بھی "متحدہ قومیت" کا حامی ثابت کرنا زبردستی کی بات
ہے، اور ان کی تفسیر کو مولانا کی تفسیر کا اصل ماخذ ثابت کرنا بھی زبردستی ہے، دونوں کی آزادی
فکر اور عقلیت کے سلسلہ میں مصنف کے قلم سے بعض اور غیر معتدل باتیں بھی نکل گئی ہیں ص ۵۰۲
پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن کی وجہ سے ان کے پیچھے تلوار لے کر دوڑنے کی بے سروپا روایت بھی
درج ہے، مولانا کی اصول پسندی اور شان بے نیازی کو ان کی عظمت کے بجائے سلبیت پر محمول
کرنا تعجب انگیز ہے، اس قسم کی اور بھی بعض باتیں کھٹکتی ہیں، لیکن ان سے کتاب کی قدر و قیمت
اور مصنف کی محنت و کاوش میں فرق نہیں آتا، انھوں نے اس کو بڑے اعتماد و جرأت کے ساتھ
لکھا ہے، اور اس سے ان کی ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے،

مجلہ علوم الدین مرتبہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ

صفحات ۸۰ قیمت درج نہیں، پتہ فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح فیکلٹی آف تھیالوجی نے بھی اب پہلی دفعہ اپنا مجلہ شائع کیا ہے، اس کی ترتیب و ادارت کی ذمہ داری فیکلٹی سے وابستہ ایک باذوق صاحب علم و قلم مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے حصہ میں آئی، جو حق بحقدار رسید کے مصداق ہے، اُن کا نام ہی مجلہ کی خوبی کی ضمانت ہے، یہ مجلہ نو بلند پایہ دینی، علمی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین انہی لوگوں کے قلم کے ہیں، جو فیکلٹی سے متعلق ہیں، یا پہلے متعلق رہے ہیں، یوں تو سب ہی مضامین فیکلٹی کے معیار و مرتبہ کے شایانِ شان عالمانہ و محققانہ ہیں، لیکن فاضل مرتب کا مضمون "مولانا عبدالحی فرنگی محلی، اور اُن کی تاریخی خدمات" خاص طور پر قابلِ ذکر اور پُر مغز ہے، انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ فن رجال و تاریخ میں مولانا کی خدمات کا اس قدر مفصل جائزہ لیا ہے، ناسخ و منسوخ (ڈاکٹر قاری رضوان اللہ) چوتھی صدی ہجری کی ایک عظیم عہد ساز علمی و دینی شخصیت (ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن کامونپوری) بھی مفید مضامین ہیں "کچھ یادیں" (پروفیسر حمید اللہ خاں) نہایت دلچسپ اور شگفتہ و برجستہ مضمون ہے، لائق مرتب نے افتتاحیہ میں فیکلٹی کی گذشتہ خدمات اور موجودہ کارگذاری کی مفصل روداد بھی سنائی ہے جو دلچسپ بھی ہے، اور اس سے فیکلٹی کے متعلق مفید اور ضروری معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، شروع میں ملا نظام الدین محمد سہالوی بانی درس نظامی کے دو اصل خطوط کے عکس درج ہیں، گو فیکلٹی کا یہ پہلا نمبر ہے، مگر مضامین کے تنوع، معیار، ترتیب کے سلیقہ اور طباعت کی نفاست وغیرہ کے اعتبار سے بہت خوب ہے، اس کی اشاعت پر لائق مرتب اور فیکلٹی دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔

"ض"

جلد ۱۱۰   ماہ رجب المرجب ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۲ء عیسوی   عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک اہم یادگار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے گذشتہ مہینے انتقال کیا، وہ اس دور کے مشہور فاضل اور نامور محقق تھے، اُن کا موضوع عربی لسانیات تھا، اس کے متعلقات علم الاشتقاق، رسم الخط، حروف و اصوات وغیرہ پر اُن کی نظر بڑی دقیق تھی، اور اپنی تحریروں میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، اُن کی پوری زندگی علمی و تعلیمی خدمات میں گذری، مگر لکھتے کم تھے، اس لئے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مگر اُن کے یہ مضامین اُن کی محققانہ نظر کا ثبوت ہیں، عرصہ ہوا الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت سے رٹائر ہوئے تھے، اور الٰہ آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی، ایک زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے رکن رکین تھے، یونیورسٹیوں اور دوسری علمی مجالس میں ان کا بڑا وقار تھا، دارالمصنفین کی مجلسِ انتظامیہ کے بھی رکن تھے، ان کا رہن سہن تو جدید تھا لیکن شرافت و وضعداری اور شفقت و محبت میں مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہو گئے تھے، آخر میں ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، اسی حالت میں گذشتہ جولائی میں انتقال کیا، انتقال کے وقت ۸۰ سال کی عمر تھی، مسلمانوں میں ایسے محقق اب مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

......⁂......

نسلی، لسانی اور جغرافی عصبیت نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے مگر اس سے انھوں نے کوئی سبق نہیں لیا، ایک حد تک ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے لیکن اتنی نہیں کہ اس کے لئے وسیع ملی مفاد

کو قربان کر دیا جائے، بلکہ اپنے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیا جائے، اس عصبیت نے دولت عثمانیہ کو ختم کیا، اور عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کرکے ان کی قوت اتنی کمزور کر دی کہ وہ اپنا وجود قائم رکھنے میں دوسروں کی دست نگر ہیں، پھر جغرافی وطنیت نے ان میں بھی ایسا اختلاف پیدا کر دیا کہ وہ اب تک متحد نہ ہو سکیں، اور وہ اسرائیل جیسی چھوٹی اور نومولود حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اسی عصبیت نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور وحشت و بربریت کا ایسا برا نمونہ پیش کیا جس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی، اور اب یہی عصبیت مغربی پاکستان میں بھی ابھر رہی ہے،

....

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس مذہب نے ساری عصبیتوں کو مٹا کر ملت اسلامیہ کی بنیاد اسلامی وحدت و اخوت پر رکھی تھی، اور انصار نے اس کا یہ نمونہ پیش کیا تھا، کہ اپنی املاک تک مہاجرین میں آدھی تقسیم کر دی تھی، آج اس مذہب کے ماننے والے محض زبان، نسل، اور جغرافی وطنیت کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے، پاکستان کا ہر حصہ آزادی کا طالب ہے، مہاجرین پر جن کی قربانیوں کی بدولت پاکستان قائم ہوا، اور جنھوں نے اپنا سارا خانماں لٹا کر پاکستان میں پناہ لی تھی، اس کی سرزمین اتنی تنگ ہو رہی ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان مخالف حالات کے باوجود زیادہ امن و سکون سے ہیں، دوسری طرف ہندوستان ہے، جہاں اخوت و وحدت کی کوئی تعلیم نہیں، بلکہ اس کا پرانا نظام طبقاتی ہے، اور جہاں پاکستان سے کہیں زیادہ مذہبی، نسلی، لسانی، اور تہذیبی اختلافات ہیں، مگر ملک کی سالمیت اور وحدت پر سب متفق ہیں، اگر اس کے خلاف کوئی کمزور آواز اٹھتی ہے، تو وہ حقوق طلبی سے آگے نہیں بڑھتی، یہاں کے مقامی باشندوں اور شرنارتھیوں میں کوئی تفریق و مغائرت نہیں، یہ مسئلہ یہاں کب کا حل ہو چکا، شرنارتھی اپنے نئے وطن میں پورے اطمینان اور سکون کی زندگی

بسر کر رہے ہیں،

......ہ ⁂ ہ......

مذہبی اخوت سے قطع نظر خالص ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے یہ عصبیت پاکستان کے لئے انتہائی مہلک ہے، اگر سندھ اور بلوچستان جیسے چھوٹے صوبے جن کی آبادی ہندوستان کے بڑے ضلعوں کے برابر بھی نہیں ہے، آزاد ہو گئے تو ان کی حیثیت پرانی دیسی ریاستوں سے زیادہ نہ ہو گی، وہ اپنا وجود کس طرح قائم رکھ سکیں گے، مشرقی بنگال کی مثال سامنے رکھنا صحیح نہیں ہے، وہ مذہب کے علاوہ ہر حیثیت سے مغربی پاکستان سے الگ اور اس سے مختلف ہے، اگرچہ وہ مسلمان ملک ہے لیکن اس کا اسلامی تہذیب کا اثر اور دنیا کے مسلمانوں سے اس کا تعلق بہت کم رہا، اس لئے وہاں سے اسلامی وحدت کی مخالفت کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، لیکن سندھ وہ علاقہ ہے، جہاں اسلام کا پرچم سب سے پہلے لہرایا، اور سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی، اور شمالی ہند سے مدتوں پہلے وہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب کا مرکز رہا، یہاں کے علماء نے دنیائے اسلام میں سندھ کا نام اونچا کیا، سندھی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت ہے، اس کا رسم الخط بھی فارسی ہے، سندھ اور ملتان میں جتنے اسلامی آثار ہیں، دلی اور لاہور کے علاوہ اور کسی شہر میں مشکل سے ملیں گے، ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے وہاں سے جاہلی عصبیت کے نعروں کا بلند ہونا حیرت انگیز ہے، اگر یہ عصبیت قائم رہی تو مغربی پاکستان . . . کو بھی لے ڈوبے گی، ان حالات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم غلط تھی، اس سے ہندوستان کے مسلمان الگ برباد ہوئے، اور پاکستان کا تخیل بھی کامیاب نہ ہوا، ملت اسلامیہ کا جو حصہ بھی واعتصموا بحبل اللّٰہ کو چھوڑیگا اس کا انجام یہی ہوگا، بلکہ اس کو یستبدل قوماً غیرکم" کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

.......ہ ⁂ ہ.......

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

معاشی نظام

(۵)

از مولانا محمد تقی امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے، جو انسان کی طبعی زندگی (Physical) اور اس کے ذاتی مفاد تک محدود ہے، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں صرف ان ضرورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں اور حیوانی تقاضوں سے ہے، اور جن میں عقل کی رہنمائی کافی سمجھی گئی ہے، ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عقل نے پہلے نظام سرمایہ داری کو جنم دیا، جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو سوشلزم اور کمیونزم کو ایجاد کیا، جن کا ابھی تجربہ ہو رہا ہے،

تشکیل جدید ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے

تشکیل جدید ۔۔۔ کی بنیاد ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے جس نے زندگی کو دو حصوں مادی وغیرمادی میں تقسیم کیا، اور تکمیل انسانیت کیلئے دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں دونوں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تنہا عقل کی رہنمائی کو ناکافی سمجھا گیا،

تکمیلِ انسانیت کے لئے زندگی کا ماورائی حصہ کم اہم نہیں، بلکہ مقابلتہً زیادہ اہم ہے کیونکہ اصلاً یہی حصہ صفاتِ الٰہی کا مظہر اور اقدارِ حیات کا حامل ہوتا ہے، اگر اس کو نظرانداز کر دیا جائے تو انسان کی حیثیت گوشت پوست کے لوتھڑے سے زیادہ نہ رہے گی،

عقل ذاتی مفاد کی، اور وحی اقدارِ حیات کی حفاظت کرتی ہے،

صفاتِ الٰہی کے عکس سے زندگی میں جو صفات نمودار ہوتی ہیں ان کو "اقدارِ حیات" کہتے ہیں، ان میں تبدیلی اور زمان ومکان کی پابندی نہیں ہوتی، اُن کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے، جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے اس بنا پر ان کی رہنمائی کے لئے ایک بلند و برتر شے کی ضرورت ہے، اور وہ وحی ہے، اس طرح تشکیل جدید میں ذاتی مفاد کی حفاظت عقل کے ذریعہ ہوتی، اور ان اقدار کی حفاظت وحی کے ذریعہ، ظاہر ہے کہ جو نظام ان دونوں کی حفاظت پر مبنی ہو، وہی انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے،

اقدارِ حیات کی حفاظت سے نہ صرف ہر شخص دوسرے کی دست برد سے محفوظ رہے گا، بلکہ دوسرے کے مفاد کو اپنا مفاد اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان جاننے لگا، اور ضرورت کے وقت خود نقصان اٹھا کر دوسرے کے فائدہ کا سامان فراہم کرنے سے بھی دریغ نہ کریگا، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:-

وَيُؤثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَو كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[1]	وہ لوگ اپنے اوپر دوستوں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو فاقہ ہی کیوں نہ ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

---

[1] القرآن - حشر - ع - ۱،

لا یومن عبد حتی یحب
لاخیہ ما یحب لنفسہ[1]

بندہ پورا مومن اُس وقت تک
نہیں ہوتا، جب تک کہ اپنے بھائی
کے لئے وہی نہ پسند کرے، جو اپنی
ذات کے لئے پسند کرتا ہے،

اقدار حیات کی حفاظت سے سرمایہ داری کی لعنت ختم ہوجائیگی جس کو کارل مارکس نے تاریخی وجوب سے ختم کرنا چاہا

"اقدار حیات" کی حفاظت سے سرمایہ داری کی لعنت ختم ہو جائیگی اور معاشی استحصال سے نجات مل جائے گی۔ جس کے لئے کارل مارکس کو کوئی مضبوط بنیاد نہ مل سکی، اور مجبوراً اس کو تاریخی وجوب (Historical necessity) کا سہارا لینا پڑا، جیسا کہ L. Laura نے لکھا ہے :-

"مارکس اور انجلز نے اپنی اشتراکی تمناؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا، بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت تاریخی وجوب کا تقاضہ ہے، (یعنی تاریخ سے ثابت ہے کہ کوئی نظام ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، بلکہ کچھ دن کے بعد اندر سے ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو بڑی حد تک اس کی ضد ہوتا ہے،[1]

لیکن تاریخی وجوب کا سہارا اتنا مضبوط نہ تھا کہ وہ معاشی نظام کے لئے کوئی مستحکم بنیاد فراہم کرتا، یہی وجہ ہے کہ لینن اور پھر اس کے بعد اسٹالن نے اشتراکی تصورات میں کافی تبدیلی کر دی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

اقدار حیات کی حفاظت کے طریق کار میں حکومت کے اختیارات کافی وسیع ہیں

اقدار حیات کی حفاظت کا تعلق صرف وعظ و تبلیغ سے نہیں بلکہ حکومت کے قانون سے بھی ہے یعنی حکومت ذرائع پیدا وار کی تنظیم اور پیداوار کی

---

[1] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الاول ص۴۲۳

Karl Marx

Democracy

تقسیم اس طرح کرنے پر مامور ہے کہ ہر سطح پر ان کی حفاظت کا بندوبست ہوتا رہے، اس لئے قرآن میں صرف اصل مقصد پر زور دیا گیا ہے یعنی اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو، اور بدلے ہوئے کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں، اس کی تنظیم و تقسیم کی تفصیل سے بحث نہیں کی گئی ہے، ان میں حالات و زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے، بلکہ امانت و کے دو بنیادی اصول بتا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انفرادی و اجتماعی جو صورت بھی ہو، ہر چیز مالک اللہ تعالیٰ ہے، انسان کو ساری چیزیں نائب ہونے کی حیثیت سے بطور امانت استعمال دی گئی ہیں، اس سلسلہ کی چند آیتیں عمومی انداز کی یہ ہیں،

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا[1] — بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے اہل تک پہنچاؤ،

امانات سے تمام حقوق واجبہ اور فرائض مراد ہیں جس کی تفصیل پہلے گذر چکی

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ[2] — اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمھیں نائب بنایا ہے،

تنظیم و تقسیم سے متعلق سوالات کے مختلف جواب سے استدلال

تنظیم و تقسیم کے بعض احکام ذکر کرنے کے بعد ہے،

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ[3] — تاکہ دولت تم میں مالداروں کے درمیان سمٹ کر نہ رہ جائے،

صرف کے بارے میں ایک موقع پر سوال کا جواب یہ دیا گیا،

---

[1] نساء - ۲۸ - [2] حدید - ۱ [3] حشر - ۴

قُلِ الْعَفْوَ[1] — آپ کہدیجئے جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کردو

دوسرے موقع پر یہ جواب ہے،

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ[2] — آپ کہدیجئے جو بھی تم اپنے مال سے نکال سکتے ہو، نکالو، اس کے مستحق تمھارے ماں باپ عزیز و اقربا، یتیم مسکین اور مسافر ہیں،

جواب کا یہ اختلاف معاشی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کے فرق کو ظاہر کرتا، اور "العفو" سے تو اس حد تک ثبوت ملتا ہے کہ حالات کے زیادہ دباؤ کے وقت ضرورت سے زائد میں صاحب مال کا کوئی حق نہیں ہے، کل خرچ کر دینا چاہئے،

ان آیتوں کے علاوہ بہت سی آیات میں خرچ کرنے کی تاکید ہے، اور اسکے مستحقین کی تفصیل بھی کر دی ہے لیکن مقدار اور تقسیم کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے احکام حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں، اور ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے،

حالات کے لحاظ سے عدل و توازن پیدا کرنے، اور برقرار رکھنے کے قوانین مختلف ہوں گے

جس طرح معاشی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے، اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت قائم نہیں رہ سکتی، جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو، اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم اور نان جویں کا محتاج ہو، تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت

---

[1] بقرہ - ۲۷ [2] بقرہ - ۲۶

سے یقیناً مختلف ہوں گے جب قوم خوش حال ہو، اور معاشی عدم توازن کسی طبقہ کی محرومی تک نہ پہنچا ہو، ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کا کوئی ایک طبقہ متعین کر دیتا، یا مروجہ و اجتماعی ملکیت کو اصولی اور بنیادی قرار دیدیتا تو اس کی عالمگیریت کو نقصان پہنچتا، اور ہدایت کا مقصد پورا نہ ہوتا،

مقصد عدل کا قیام ہے جس طرح بھی ہو | ابن قیم کہتے ہیں:-

ان مقصودہ اقامۃ العدل	شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں
بین عبادہ و قیام الناس	کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے
بالقسط فای طریق استخرج	جس طریق کے ذریعہ عدل و انصاف
بھا العدل و القسط فھی	قائم کیا جائے گا، وہی دین ہوگا،
من الدین لیست مخالفۃ لہ[1]	اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا،

ایک اور جگہ اس حقیقت کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے،

فان الشریعۃ مبنٰھا واساسھا	شریعت کی بنیاد حکمتوں اور دنیاوی و
علی الحکم و مصالح العباد فی	اُخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے
المعاش و المعاد وھی عدل کلھا و	وہ تمام تر عدل و رحمت اور حکمت و
مصالح کلھا و رحمت حکمۃ کلھا فکل مسئلۃ خرج	مصلحت ہے، جو مسئلہ بھی عدل سے جور
من العدل الی الجور و عن الرحمۃ الی	کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف
ضدھا و عن المصلحۃ الی المفسدۃ	مصلحت سے مفسدہ کی طرف اور حکمت

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۴،

وعن الحکمۃ الی البعث	سے فعل عبث کی طرف لے جائے، وہ
فلیست من الشریعۃ وان	شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا، اگرچہ اس کو
ادخل فیھا بالتاویل۔[1]	تاویل کے ذریعہ شریعت میں داخل
	کر لیا جائے،

قانون میں اوسط درجہ کی طرز معیشت کا لحاظ رکھنا چاہئے	دنیوی مصالح کے تین درجے ہیں جن کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں تفاوت ہو سکتا ہے،

(۱) ادنیٰ (۲) اوسط (۳) اعلیٰ،

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے پینے لباس، مکان، نکاح، اور دیگر ضروریاتِ زندگی میں اتنی سہولت حاصل ہو کہ کام چلتا رہے، اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمدہ غذا، بہترین لباس عالی شان مکان، خوبصورت عورتوں سے شادی کے سامان میسر ہوں،

اوسط درجہ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی نہ اس قدر وسعت ہو کہ اعلیٰ تک پہنچ سکے، اور نہ اس قدر تنگی ہو کہ ادنیٰ کے درجہ میں رہ جائے،

معاشی زندگی میں عدل و مساوات کا اعتبار اوسط درجہ میں کیا جائے گا، اور اسی اعتبار سے قوانین بنانے کا اختیار ہوگا، فقہاء نے اس درجہ کو حاجات سے تعبیر کیا ہے،

تقدیر النفقات بالحاجات	نفقات (اخراجات) میں عدل و
مع تفاوتھا عدل وتسویۃ	مساوات کا اعتبار حاجات کے لحاظ
من جھۃ انہ سوی بین	سے ہوگا یعنی یہ ضروری ہے کہ اوسط
المنفق علیہم فی دفع حاجاتھم	درجہ کے معیار سے لوگوں کی ضرورتیں

---

[1] اعلام الموقعین جلد ۳۔ ص ۳۷۔

لا فی مقادیر ما وصل الیھم	پوری ہوں یہ ضروری نہیں ہے کہ
لان دفع الحاجات ھو	سب کو ایک مقدار میں دیا جائے،
المقصود الاعظم فی النفقات	کیونکہ اخراجات میں شریعت کا
وغیرھا من اموال المصالح[۱]	مقصود اعظم اوسط درجہ رحاجات)

کا لحاظ ہے،

وضع قوانین میں وسعت | اس اوسط درجہ کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی تنظیم و تقسیم درکا اور جیسے قوانین وضع کرنے ہوں گے، وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے، ان سب کا تعلق طریق کار سے ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ طریق کار کا ثبوت قرآن وسنت سے ہو۔ حا کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے کسی ایک طریقہ کار پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔

ابن قیم کہتے ہیں :-

فاذا ظھرت امارات الحق	حق کی علامتیں اور دلیلیں جس طریقہ
واد لتہ بای طریق فذلک	سے بھی ظاہر ہوں وہ سب شرع
من شرعہ ودینہ ورضاہ	اور دین ہوگا، اور اسی میں اللہ
وامرہ[۲]	کی رضا اور اس کا حکم ہوگا،

حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق تفصیلات | ذیل میں حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق بعض تفصیلا ذکر کی جاتی ہیں، جن سے وضع قوانین میں اس کے اختیارات کا بھی ثبوت ملتا ہے،

حضرت عمرؓ نے حکومت وعوام کے درمیان معاشی تعلق کو ایک مثال کے ذریعہ

---

[۱] قواعد الاحکام ج ۱ ص ۶۰، [۲] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۳۷۵

طرح سمجھایا ہے،

انما مثلنا کمثل قوم سافروا	ہماری (خلافت) مثال اور قوم کی
فدفعوا نفقاتھم الی رجل	مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے سفر
منھم فقالوا لہ انفق علینا	کیا، اور اپنے اخراجات کی رقم اپنے
فھل لہ ان یستاثر علیھم	میں سے کسی شخص کو یہ کہکر حوالہ کردی
بشیئ قال لا[1]،	کہ ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو، کیا
	ایسی صورت میں ان کے ساتھ کسی
	قسم کا ترجیحی سلوک روا ہو سکتا ہے؟
	فرمایا، ہرگز نہیں،

فتح قادسیہ کی خوشخبری سنانے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری یہ بیان کی تھی، :-

"جب تک لوگوں میں اس قدر وسعت ہے کہ اُن کے مال کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں۔ میں تمھاری ضروریات پوری کرتا رہوں گا، اور جب یہ وسعت نہ ہوگی تو ہم زندگی میں تنگی کریں گے، یہاں تک کہ کفاف (بقدر ضرورت) میں ہم سب برابر ہو جائیں، کاش ہم جان سکتے کہ مجھے تمھارا کس قدر خیال ہے؟ اس کو میں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں، خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمھیں غلام بناؤں، بلکہ خود اللہ کا غلام ہوں، اور حکمرانی کی امانت میرے سپرد ہے، اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمھیں واپس کردوں اور خدمت کے لئے تمھارے پیچھے

---

[1] ابن جوزی تاریخ عمر الباب التاسع والثلثون،

پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا دیو، تو اس حکمرانی کے ذریعہ فلاح پاؤں گا، اور اگر اس کو ذاتی ملکیت سمجھوں اور مطالبہ حقوق) کے لئے اپنے پیچھے چلنے اور گھر آنے پر مجبور کروں تو میرا انجام خراب ہو جائے گا؛[۱]

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (گورنر بصرہ) کو یہ ہدایت کی،

الا اوسعوا الناس فی بیوتھم	غور سے سن لو، لوگوں کے گھروں
واطعموا عیالھم؛[۲]	میں ان کی فراخی کا سامان کرو، اور
	ان کے اہل و عیال کو کھانا کھلاؤ؛

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو گئی، اُن کی بیوی فاطمہؒ نے رونے کا سبب پوچھا، کہ

احدث شیئ	کیا کوئی نئی بات پیش آ گئی،

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں فرمایا،

"میں نے پوری امت کی ذمہ داری لی ہے، اس میں ہر قسم کے لوگ ہیں، بھوکے فقیر بے سہارا، مریض، بے سروسامان مجاہد، بے بس، مظلوم، غریب، قیدی، بہت بوڑھے کثیر العیال، جن کے پاس مال کم ہے، اسی طرح مختلف علاقوں کے رہنے والے دوسرے ضرورت مند ہیں، قیامت کے دن ان سب کے بارے میں مجھ سے بازپرس ہوگی اور ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے اللہ کے رسول ہوں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ میں جرح میں ٹوٹ جاؤں گا، اسی لئے اپنی جان پر ترس کھا کر رو رہا ہوں"[۳]

---

[۱] البدایۃ والنہایہ ج ۷، ص ۴۶، [۲] سراج الملوک ص ۱۰۹ طرطوسی،

[۳] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۳ و کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۰،

حکومت دو قسم کے انتظام کی ذمہ دار ہے

تشکیل جدید میں حکومت دو قسم کے معاشی انتظام کی ذمہ دار ہے
(الف) وہ جس سے (بدرجہ اوسطا میں) قوم کی ضرورتیں پوری ہوں،
(ب) جس کے ذریعہ معاشی لحاظ سے قوم خود کفیل ہے،

وہ جس سے قوم کی ضرورتیں پوری ہوں

(الف) ضرورتوں میں بنیادی و غیر بنیادی سب شامل ہیں، مثلاً غذا، لباس، مکان، علاج، تعلیم، اہل و عیال کی کفالت، قرض کی ادائگی، شادی اور (وقت ضرورت) خادم وغیرہ، اصولی حیثیت سے بنیادی ضرورتوں کے بارہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ مختلف روایات میں ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا،

انی امرکم یا حمیر خیراً فلا	اے حمیر! میں تمھیں بھلائی کا حکم
تخونوا ولا تحادوا ان رسول	دیتا ہوں، خیانت نہ کرو، آپس
اللہ مولیٰ غنیکم و فقیرکم[1]	میں مخالفت نہ کرو۔ بیشک اللہ
	کا رسول (بحیثیت سربراہ حکومت)
	مالدار اور فقیر سب کا سرپرست ہے

دوسری جگہ ہے:۔

السُّلطانَ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ	حکمراں اس کا سرپرست ہے جس کا
لَہٗ[2]	کوئی سرپرست نہیں،

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ۲۱ [2] ترمذی ابواب الفرائض باب ما جاء فی میراث المالی

ایک اور جگہ ہے،

اللہ ورسولہ مولی من لا مولی لہ[1]	اللہ ورسولؐ (حکومت) اس کے سرپرست ہیں، جس کا کوئی سرپرست نہیں،

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا،

ایھا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء[2]	اے لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا مکلف کیا ہے، کہ اس سے کی جانے والی دعا کو رد کر دوں،

عز الدین عبدالعزیز (مشہور شافعی فقیہ) کہتے ہیں،:-

"دعا رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے، اللہ سے اُن کو انصاف طلب کرنے کی حاجت نہ رہے، اور لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے، اللہ سے مانگنے کی نوبت نہ آنے دے،[3]

پھر اس کے بعد ہے:-

فما افصح ھذہ الکلمۃ و ما اجمعھا لمعظم حقوق المسلمین[4]	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کس قدر فصیح اور حقوق کے کس قدر جامع ہیں،؟

غذا لباس اور مکان | اصولی اور عمومی حیثیت کے علاوہ حدیثوں میں بنیادی ضرورتوں کی

---

[1] ابوداود کتاب النکاح باب العطی، [2] و [3] و [4] قواعد الاحکام مصالح الانام جلد ۱ ص ۱۳۷،

تصریح بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لیس لابن ادم حق فی سوی	تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں
هذه الخصال بیت یسکنه	انسان کا کوئی حق نہیں، (۱) رہنے
وثوب یواری به عورته	کے لئے گھر، (۲) تن ڈھکنے کے لئے
وجلف الخبز والماء[1]	کپڑا اور (۳) پانی اور روٹی کا ٹکڑا،

ابن قیم کہتے ہیں :-

وحاجة المسلمین الی	غذا، لباس وغیرہ کا تعلق مصالح عامہ
الطعام واللباس وغیر ذلک	سے ہے، جن میں کسی کا خاص حق نہیں
مصلحة عامة لیس الحق	ہے، بلکہ سب ان میں مشترک ہیں،
فیها لواحد بعینه[2]	

علاج وتعلیم | علاج وتعلیم کا ذکر حضرت عمرؓ نے فرمایا،

لو ترکت عنزجرباء الی	اگر نہر کے کنارے خارشتی بکری اس حال
جانب ساقیة لم تدهن	میں چھوڑ دی جائے کہ اس پر (بطور علاج)
لخشیت ان اسأل علیها	تیل کی مالش نہ ہو تو ڈر ہے کہ قیامت
یوم القیامة[3]	کے دن عمر سے اس کی بازپرس
	ہو گی،

انسان کا معاملہ جانور سے زیادہ اہم اور اس کے بارہ میں بازپرس کا زیادہ اندیشہ

---

[1] ترمذی، [2] الطرق الحکمیہ ص ۲۶۲، ابن قیم، [3] التبر المسبوک صفحہ ۱ غزالی،

جو حکومت جانور کے علاج میں ذمہ داری محسوس کرتی ہے، وہ انسانوں کے علاج میں کس قدر ذمہ دار ہوگی؟

تعلیم کے سلسلہ میں مختلف انتظامات کا ثبوت ملتا ہے، جن کو موجودہ دور کے مطابق وسیع کیا جا سکتا ہے،

حدیثوں میں تحصیلِ علم کی بڑی فضیلت آئی ہے، اور اس کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے، "طلبُ العلمِ فریضۃ علیٰ کل مسلمٍ ومسلمۃ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیدؓ بن العاص کو لکھنا سکھانے کے لئے مقرر کیا[1] زید بن ثابتؓ کو یہودیوں سے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا[2] دیہاتی علاقوں میں تعلیم کے لئے مختلف صحابہ کو بھیجا[3] ڈاکٹر حمید اللہ نے عہدِ رسالت کے تعلیمی نظام پر پوری کتاب لکھی،

حضرت عمرؓ نے تعلیم کی اشاعت کے بڑے وسیع ذرائع اختیار کئے، مدرسے قائم کرکے تنخواہ دار معلّم مقرر کئے، تفصیل کا یہ موقع نہیں، مولانا شبلی نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے زمانہ میں دیہاتی علاقوں میں معلّم مقرر کئے وغیرہ[5]

تحصیلِ علم کے لئے وظیفہ (اسکالرشپ) جاری کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ ابو عبید نے کتاب الاموال میں الفرض علی تعلم القرآن والعلم (قرآن اور علم حاصل کرنے پر وظیفہ مقرر کرنا) کے تحت کئی روایتیں نقل کی ہیں[6] علماء نے علم و تعلیم کی اہمیت اور اس کے نظام پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ابن عبد البر اندلسی کی مختصر جامع بیان العلم والعلماء، اور شیخ بدر الدین کی تذکرۃ السامع والمتکلم قابلِ ذکر ہیں، اسلامی حکومتوں اور علماء نے تعلیم کی اشاعت اور علوم و فنون کی جس قدر خدمت کی ہے، اس پر تاریخ شاہد ہے

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الصحابہ ج ۱ ص ۲۹۳ [2] ابو داؤد کتاب العلم باب روایۃ اہل الکتاب [3] بخاری کتاب الجہاد [4] کنز العمال ج ۲ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [5] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۷، [6] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۱

اہل و عیال کی کفالت قرض کی ادائگی | اہل و عیال کی کفالت اور قرض کی ادائگی کا ذکر ان روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من ترك مالاً فلاهله ومن ترك ضياعاً فالیّ[۱]	جس شخص نے مال چھوڑا، وہ اُس کے گھر والوں کے لئے اور جس کو بے سہارا چھوڑا، اس کی کفالت میرے (رسول اللہ بحیثیت سربراہ حکومت) ذمہ ہے،

ترمذی میں ترک ضیاعاً کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں،

ضائعاً ليس له شئ[۲]	ضائع وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو،

اور الیّ کے معنی یہ ہیں، کہ

انا اعوله وانفق عليه[۳]	میں اس کی کفالت کروں گا، اور اس پر خرچ کروں گا،

دوسری روایت ہے،

من ترك كلاً فالى الله و ربما قال فالى الله ورسوله[۴]	جس شخص نے بوجھ (ذمہ داری) چھوڑا وہ اللہ کے ذمہ ہے، بسا اوقات فرمایا کہ اللہ و رسول کے ذمہ ہے،

ابو عبید نے "کل" کے یہ معنی بیان کئے ہیں،

الكل عندنا كل عيل والذرية	"کل" میں اولاد اور وہ سب لوگ

لہ کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۱ ۲ے و ۳ے ترمذی ابواب الفرائض، ۴ے کتاب الاموال لابی عبید الفرض للذریۃ من الفئ

منہم[۱] (کتاب الاموال ص ۲۳۴)　　　　شامل ہیں جن کی کفالت متوفی کے

لابی عبید الفرض للذریۃ من الفئی　　　　ذمہ ہے،

ایک اور روایت میں ہے،

انا اولی بالمومنین من انفسہم　　　　مومنوں سے میرا تعلق اُن کی اپنی

لمن توفی من المومنین　　　　جانوں سے بھی زیادہ ہے جس نے

فترک دینا فعلی قضاءہ و　　　　وفات کے بعد قرض چھوڑا، اُس کی

من ترک مالا فلورثتہ[۱]　　　　ادائگی میرے ذمہ ہے، اور جس نے

مال چھوڑا وہ اس کے ورثہ کے لئے ہے،

ایک روایت میں قال اللہ و رسولہ (اس کی ادائگی اللہ اور رسول یعنی حکومت کے ذمہ ہے) کے الفاظ ہیں[۲]

حضرت عمرؓ نے معاشی کفالت کے اعلان میں قرض کی ادائگی کو شامل کیا تھا،

ولا مدایننا الا قضی عنہ دینہ[۳]　　　　ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے،

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے قرض کی ادائگی کے لئے جو فرمان جاری کیا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں،

انظر کل من ادان فی غیر سفہ　　　　دیکھو ہر اس ادھار خریدنے والے

ولا سرف فاقض عنہ[۵]　　　　کا قرض ادا کر دو، جو صاحب استطاعت

اور فضول خرچ نہ ہو،

(باقی)

---

[۱] بخاری کتاب النفقات باب قول النبی من ترک الخ [۲] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۲۰، [۳] شرع شرعۃ الاسلام سید علی زادہ [۵] کتاب الاموال،

حافظ امان اللہ بنارسیؒ

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

گذشتہ دور میں جونپور، ظفرآباد، لکھنؤ اور الہ آباد کی طرح بنارس بھی دیار پورب میں اسلامی علوم و فنون اور ارباب فضل و کمال کا مرکز رہا ہے، اور یہاں کے علماء و مشایخ نے ہر زمانہ میں مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنی علمی اور روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا ہے، شیخ داؤد بن قطب بنارسی ۹۰۶ھ، شیخ مبارک بن ازرانی بنارسی ۹۸۰ھ، شیخ محمد ماہ بنارسی، شیخ طیب بن معین بنارسی ۱۰۴۲ھ، شیخ یٰسین بن احمد بنارسی، شیخ نظام الدین بنارسی، حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ، مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی ۱۱۶۶ھ، مولانا ابوالبرکات بن فضل امام بنارسی ۱۲۸۹ھ، مفتی ابراہیم ابن عمر بنارسی ۱۲۵۴ھ، مفتی سخاوت علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۸۱ھ، مفتی واحد علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۷۹ھ، شیخ عمر بن غوث بنارسی ۱۲۲۵ھ، مولانا خالق علی بنارسی، مولوی جلال الدین احمد بنارسی ۱۲۷۹ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار

اور علمائے فحول میں گذرے ہیں، ان میں جامع المعقول والمنقول صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرت مولانا حافظ امان اللہ بن مفتی نوراللہ حنفی بنارسی اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مخصوص مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، آج کی بزمِ مشرق میں ان ہی کا ذکر سرنامۂ داستان ہے،

ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار شیخ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ ہیں، جنھوں نے ان کی وفات کے سینتالیس برس بعد مآثر الکرام ۱۱۶۶ھ میں ان کا تذکرہ کیا اور سبحۃ المرجان میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، ان دونوں کتابوں میں جو کچھ درج ہے وہی بعد کے سوانح نگاروں کا ماخذ ہے، چنانچہ تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر وغیرہ میں ان ہی کتابوں کے حوالے سے ان کے حالات درج کیے گئے ہیں، اگر شاذ و نادر کوئی نئی بات دوسری کتابوں میں ملتی ہے تو ان کے معاصرین کے حالات کے ضمن میں ملتی ہے،

نام و نسب اور خاندانی حالات حافظ امان اللہ بن مفتی نوراللہ بن حسین بنارسی کا سلسلۂ نسب اس سے زیادہ نہ مل سکا، ان کا خاندان کہاں سے اور کب بنارس میں آکر آباد ہوا، اس بارے میں بھی ان کے تذکرہ نویس خاموش ہیں، البتہ ان کے والد مفتی نوراللہ ابن حسین عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی و مفتی اور صوفی صافی بزرگ ہونے کے ساتھ فقہائے احناف میں شمار ہوتے تھے، سلطان عالمگیرؒ ان کے بڑے معتقد تھے اور ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی تھی، گنج ارشدی میں ہے کہ مفتی نوراللہ نے طریقت کی تعلیم و تربیت حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ سے حاصل کر کے ان کے فرزند حضرت شیخ محمد ارشد جونپوری ۱۱۱۳ھ سے خرقۂ خلافت و خلافت

پایا تھا، ان کا شمار مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھا، اور وہ اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ چشت میں تھے، ۱۱۰۰ھ میں بنارس میں وفات پائی[1]، سلطان عالمگیر نے مفتی صاحب کے لئے محلہ دارانگر تیرتھ تالاب کے پاس ۱۰۸۰ھ میں ایک شاندار سنگین مسجد تعمیر کرائی تھی جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے آج بھی موجود ہے، اس کی تعمیر مفتی صاحب کے مشورہ سے ہوئی تھی، محراب میں آیت "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کندہ ہے جس سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے، اس کی تعمیر کے تقریباً بیس سال بعد ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالیشان خانقاہ بھی تعمیر ہوئی اس کا مادۂ تاریخ "دولت خانہ" ہے جس سے ۱۰۹۶ھ نکلتا ہے، خیال ہے کہ یہی خانقاہ دارالقضاء بھی رہی ہوگی اس کی دیوار پر ابتک یہ کتبہ موجود ہے،

ز حکم شاہ سلطان شریعت	دلیل زہد، برہان طریقت
شہاب آسمانِ سرفرازی	محمد شاہ عالمگیر غازی
باستصواب نور اللہ مفتی	غلام درگہ پیرانِ چشتی
بنائے خانقاہے ہست پیدا	ز "دولت خانہ" تاریخش ہویدا

اس وقت مفتی صاحب کے فرزند حافظ امان اللہ سن رشد کو پہونچ چکے تھے، اور انھوں نے ۱۰۹۶ھ ہی میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت والد کی حیات میں ان کے لئے مقبرہ اور روضہ تیار کرایا تھا جس میں مفتی صاحب اور ان کے بعد خود حافظ صاحب بھی دفن کئے گئے،[2]

حافظ صاحب کا مولد و منشا بنارس ہے، مگر کب پیدا ہوئے، اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت اپنے والد

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ صفحہ ۳۹۲، [2] تاریخ آثار بنارس صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

کا روضہ تعمیر کرایا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت انکی عمر تیس چالیس سے کم نہ رہی ہوگی، اس حساب انکی پیدائش ۱۰۶۰ھ کے دور میں ہوئی ہوگی،

تعلیم و تربیت | حافظ صاحب نے ایسے گہوارے میں آنکھ کھولی جو علم و فضل کا مرکز تھا، آپ کے والد صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم فقیہ، مفتی اور قاضی بھی تھے، سلطان عالمگیر کی قدر شناسی اور علم پروری نے اس گھر میں جاہ و جلال بھی پیدا کر دیا تھا، اس زمانہ میں پورب کا علاقہ عالمگیر کی توجہ سے خانقاہ اور مدرسہ بنا ہوا تھا، شہر شہر، قریہ قریہ میں علماء و فضلاء سکون قلب کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول تھے، خصوصاً جونپور اور اس کے اطراف مدارس کا بہت بڑا مرکز تھے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور لوٹ آیا ہے، مولوی خیرالدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں شیخ محمد ماہ کے ذکر میں لکھا ہے،

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم	حضرت اورنگ زیب عالمگیر عالم باعمل
باعمل اور عامل باعلم بود، قدردانی ر	اور عامل باعلم تھے، شاہزادگی ہی کے زمانہ
علماء بیش از بیش می نمود و از عہد شا	سے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی
زادگی منظور داخت، تا جونپور شل	کرتے تھے یہاں تک کہ اسی زمانہ میں
زمان سلاطین شرقیہ از کثرت فضلا	جونپور سلاطین شرقیہ کے دور کے
و مشائخان و انبوہ و ہجوم طلبۂ علوم	مانند ہوگیا اور علماء و مشائخ کی کثرت
و کاسبانِ فیوض رونق پذیر باشد	اور طالبان علوم و فیوض کے انبوہ
یوں بر سریر سلطنت نشست برلیغ	سے رونق پیدا ہوگئی اور جب ۱۰۶۸ھ
واجب التبلیغ بناظم جونپور جہت	میں تخت سلطنت پر رونق افروز
ترقیم احوال مدرسان و مشائخان	ہوئے تو ناظم جونپور کے نام خصوصی حکمنامہ

ایں شہر صادر گردانید و سوانح نگاران	جاری کیا تاکہ وہ یہاں کے اساتذہ
و وقائع نویسان و احکام تہدید بلیغ	و مشائخ کے حالات لکھ کر روانہ کرے
تحقیقات کوائف بود و باش ایں گروہ	نیز وقائع نویسوں کو سخت تاکید کی تاکہ
فرستاد، القصہ جونپور در عہد آنحضرت	وہ اس طبقہ کی معاش و معیشت کی خبر
نمونہ گلزار ارم شدہ، در تمام شہر	گیری کریں، الغرض عہد عالمگیری میں
و قصبات و نواحی آں مدرسہائے قدیم	جونپور گلزار ارم بن گیا اور اس کے اطراف
تا سیس یافتند و بے خانقاہ و مدرسہ	و جوانب کے شہر و قصبات میں قدیم مدارس
تعمیر جدید شدند، [1]	کی ترقی کے ساتھ نئے مدارس اور خانقاہیں
	تعمیر ہوئیں،

علم دین اور روحانیت کے اس دور شباب میں حافظ صاحب پروان چڑھے، خود اُن کا گھر اس کا نمونہ تھا،

حافظ صاحب نے کس کس سے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟ اس کے بارے میں بھی تفصیل نہیں ملتی ہے، آزاد نے سبحۃ المرجان میں اجمالی طور سے یہ لکھا ہے،

والحافظ امان اللہ حفظ القرآن	حافظ امان اللہ نے قرآن حفظ کیا، اور
واخذ العلوم من علماء الزمان [2]	اپنے زمانہ کے علماء سے علوم حاصل کئے،

نزہۃ الخواطر میں اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ملتی ہے

وحفظ القرآن وسافر للعلم	انھوں نے حفظ قرآن کے بعد طلب علم
فقرأ الکتب الدرسیۃ	کے لئے سفر کیا اور شیخ محمد ماہ دیوگامی اور

---

[1] تذکرۃ الشعراء جونپور، الطانی پریس کلکتہ، [2] سبحۃ المرجان ص ۷۸

علی الشیخ محمد ماہ اللہ دیوگامی — شیخ قطب الدین شمس آبادی
وعلی الشیخ قطب اللہ بن الحسینی — وغیرہ سے کتب درسیہ پڑھیں،
الشمس ابادی وعلی غیرھما من
العلماء، [۱]

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے اپنے زمانہ کے کئی علماء سے پڑھا جن میں مذکورہ بالا دو حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور تحصیل علم کے لیے بنارس سے باہر کا سفر کیا ان کے علمی سفر کے سلسلے میں دو مقامات اہم ہیں، ایک جونپور جہاں ملا محمد ماہ دیوگامی نے پچیس سال تک درس دیا تھا، تجلی نور میں ہے

اگرچہ او باشندہ قصبہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ — ملا محمد ماہ اگرچہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ
بود، الا بعد فراغ تا بست و پنج سال در جونپور — کے باشندے تھے مگر انھوں نے فراغت کے
قیام در زیدہ درس داد [۲] — بعد پچیس سال تک جونپور میں قیام کر کے
درس دیا،

قاضی صاحب کے سفر کی دوسری منزل شمس آباد ہے جہاں سید قطب الدین نے بود و باش اختیار کر لی تھی، مآثر الکرام میں ہے،

اصلش از سادات ومیتی من مضافات — دراصل وہ مضافات اودھ امیٹھی کے
اودھ است، از وطن خود نقل کردہ — سادات سے ہیں مگر اپنے وطن سے نقل مکانی
شمس آباد را مشرق انوار ساخت شمس آباد — کر کے شمس آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی
از توابع قنوج است [۳] — جو کہ قنوج کے توابع میں ہے،

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۹، [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۶۲، [۳] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۰،

حافظ صاحب کو اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں نشو ونما کا موقع ملا تھا، اور غالباً حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں، پھر بنارس سے جونپور میں آکر ملا محمد ماہ دیوگامی کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شمس آباد جاکر شیخ قطب الدین سے بقیہ کتابیں پڑھیں، آزاد کے اس بیان "من علماء الزمان" اور نزہۃ الخواطر کی عبارت "وعلی غیرھما من العلماء" سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ صاحب نے دوسرے اساتذہ سے بھی تحصیل علم کی تھی مگر ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا،

ملا محمد ماہ دیوگامی | ملا محمد ماہ دیوگامی حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے استاد بھائی تھے، دونوں نے شیخ محمد رشید جونپوری سے اکتساب فیض کیا تھا، تجلی نور میں ہے کہ ملا محمد ماہ اپنے دیار کے .... مشہور علماء میں تھے، ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ ملا رکن الدین بحر آبادی سے تحصیل علم کے بعد مزید تکمیل و تحقیق ملا نور الدین مداری سے کی اسکے بعد دیوان محمد رشید سے فیض اٹھایا، وہ اپنے دور کے عالم اکمل اور فاضل اجل تھے اور پچیس سال تک جونپور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں علماء و فضلاء ان کی درسگاہ سے پیدا ہوئے، ملا عبد الرسول ستر کھی، حافظ امان اللہ بنارسی، اور مفتی ابو البقاء جونپوری ان کے خاص شاگردوں میں تھے، آخر عمر میں سلس البول کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی میں انتقال کیا اور ایک قول کے مطابق بیاسی سال کی عمر میں ۲۵ ر جمادی الآخری ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، انکا مزار دیوگام (اعظم گڈھ اور بنارس کے درمیان) میں آج بھی موجود ہے،[۵۱]

ملا قطب الدین شمس آبادی | انکا اصل وطن امیٹھی تھا، ملا قطب الدین سہالوی شہید

---

[۵۱] تجلی نور ج ۲ ص ۶۳،

۱۱۰۳ھ کی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے اور یہیں فاتحۃ الفراغ پڑھی تھی، ملا قطب الدین سہالوی اپنے شاگرد قطب الدین شمس آبادی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "کسے کہ خواہد مغز سخن را دریابد، سید قطب الدین را اوراکیف نماید"۔ فراغت کے بعد شمس آباد میں مسند تدریس بچھائی، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں قاضی محب اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی اور سید طفیل محمد اترولوی خاص شہرت کے مالک ہیں، تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۱۲۱ھ میں فوت ہوئے[۱]،

علمی تبحر | حافظ صاحب نے حفظ قرآن کے بعد مروجہ علوم و فنون بنارس، جونپور، اور شمس آباد وغیرہ کے مشہور اساتذہ سے حاصل کئے، طریقت ان کے گھر کی دولت تھی اور ورثہ میں ملی تھی مگر اس راہ میں آخر عمر میں اس وقت آئے جب افتاد زمانہ سے پریشان ہو کر دہلی گئے، واپسی میں شیخ خوب اللہ الہ آبادی ۱۱۴۴ھ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کے علمی تبحر کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے، آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،

وَبَرعَ فی المعقول والمنقول وتبحّر فی الفروع والاصول[۲]	وہ معقولات و منقولات میں بہت آگے اور اصول و فروع میں تبحر عالم تھے،

مآثر الکرام میں لکھا ہے،

از حفاظ قرآن و از فحول علمائے ہندوستان است و در معقول و منقول کوس شہرت می نواخت و در علم فقہ علم امتیاز می افراخت[۳]	وہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہندوستان کے جید علماء میں سے ہیں، معقولات و منقولات میں ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا اور فقہ میں ممتاز تھے،

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۸، [۲] سبحۃ المرجان ص ۸۷، [۳] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲،

تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول ،[1]	حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول ،

اور نزہۃ الخواطر میں ہے

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ احد العلماء المشہورین فی الفقہ والاصول والکلام،[2]	شیخ عالم کبیر علامہ اور فقہ اصول فقہ اور علم کلام کے مشہور علماء میں سے ایک ممتاز عالم تھے ،

فقہ اور اصول فقہ کا فن حافظ صاحب کو ورثہ میں ملا تھا ان کے والد مفتی نور اللہ اپنے زمانہ کے مشہور فقہائے احناف میں تھے اس لئے اس فن سے ان کو فطری تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی کتاب المفسر اور اس کی شرح المحکم سے ملتا ہے اور معقولات ومنقولات میں ان کی جامعیت ان شروح وحواشی سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے مختلف کتب کلامیہ و معقولیہ پہ لکھے ہیں، حافظ صاحب سلوک ومعرفت کی بزم میں آخر عمر میں داخل ہوئے اور اس کے گوہر شب چراغ بنے اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی جو بڑی سخت مختلف فیہ کتاب تھی اور اس پر شدید ہنگامہ ہوا تھا،

لکھنؤ کی صدارت عالمگیر حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے قدر دانوں میں تھا اور بنارس میں ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کی تھی اور وہاں کے عہدہ قضا پر ان کو مامور کیا تھا، حافظ صاحب بھی فراغت کے بعد سلطان کی عنایات و توجہات

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴ ، [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹

شاہی کے مستحق قرار پائے اور اس نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکان الحافظ متقلداً بصدارۃ	حافظ صاحب سلطان عالمگیر کی طرف
لکھنؤ من السلطان عالمگیر،	سے شہر لکھنؤ کی صدارت پر مامور تھے
وکان القاضی محب اللہ البہاری	اور قاضی محب اللہ بہاری وہاں کے
قاضیا بہا، [۱]	قاضی تھے،

مآثر الکرام میں ہے،

واو چندے از خلد مکان بمنصب	وہ کچھ دنوں خلد مکان سلطان عالمگیر
صدارت بلدہ لکھنؤ مامور بود ایشان	کی طرف سے لکھنؤ کی صدارت پر فائز
ایں بتقریب صدارت، و قاضی محب اللہ	تھے اس تقریب سے وہ اور عہدہ قضا کی
صاحب سُلّم بتقریب قضا دران بلدہ	تقریب سے قاضی محب اللہ صاحب سلّم
فاخرہ مجتمع بودند، [۲]	اس شہر میں ایک ہی زمانہ میں تھے،

مغل دور میں صدارت کا عہدہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، صدر صدر بائی دار الحکومت میں رہتا تھا اور پورے صوبہ کے علماء و مشائخ، ائمہ اور معذوروں کے حقوق اور ان کے سارے امور و معاملات، عطیات اور وظائف وغیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال اسکے متعلق ہوتی تھی، قاضیوں کی کارگذاری اور ان کے استحقاق و عدم استحقاق کا نگراں و محتسب بھی ہوتا تھا انکی تقرری بادشاہ کی طرف سے صدر الصدور کی توثیق کے بعد ہوتی تھی قاضیوں کے فرائض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور شرعی قضایا معاملات مثلاً زوجین کے مسائل

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۷۸، [۲] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳،

اور قرضہ جات کے مرافعات وغیرہ کی نگرانی تک محدود تھے[1] اس لئے حافظ امان اللہ کا عہدہ ان کے استاد بھائی قاضی محب اللہ بہاری سے بڑھا ہوا تھا، قاضی محب اللہ بہاری فراغت کے بعد سلطان عالمگیر کی خدمت میں دکن جاکر لکھنؤ کے عہدہ قضا کا پروانہ لائے تھے اور حافظ صاحب کو بغیر کسی سعی و کوشش کے یہ منصب ملا تھا اسی اعتبار سے ان کا پلہ بھاری تھا مگر علم و تحقیق فضل و کمال میں دونوں برابر تھے اور ملا قطب الدین شمس آبادی کے فیض سے معقولات و منقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے،

حافظ امان اللہ اور قاضی محب اللہ کے درمیان علمی مباحث

لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث و مباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ کا اکھاڑہ بن گیا، جانبین سے رسالہ بازیاں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کے رد میں صفحات کے صفحات سیاہ کردیئے، تذکرہ نویسوں نے اس نوک جھونک کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکانا یجتمعان وتجری بینھما	دونوں حضرات لکھنؤ میں جمع تھے اور
مباحث علمیۃ[2]	انہیں علمی بحثیں جاری رہتی تھیں،

مآثر الکرام میں ہے دو باہم طریق مباحثہ علمی سلوک می داشتند (مآثر، ص ۲۱۲) ان مباحث کی کثرت کا اندازہ نزہۃ الخواطر کی اس تصریح سے ہوتا ہے،

فجرت بینھما من المباحثات	ان دونوں کے درمیان اس قدر
والمطارحات ماتفعم بھا	زیادہ مباحثے اور مناظرے چلے کہ ان سے
بطون الصفحات[3]	صفحات کے صفحات بھر جائیں گے،

---

[1] الہند فی العہد الاسلامی ص ۲۳۳، [2] سبحۃ المرجان ص ۸۰، [3] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹،

ان مباحثوں کی تفصیل کتابوں میں درج نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ کن کن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ قیاس ہے کہ اس زمانہ کے ذوق کے مطابق ان کا تعلق فقہ، اصول فقہ، کلام اور منطق و فلسفہ کے مسائل سے رہا ہوگا، لکھنؤ کی صدارت اور عہدۂ قضا سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہو گئے مگر بحث و مباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں رد و قدح کا سلسلہ چلتا رہا، قاضی محب اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں "قال الفاضل البنارسی" سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے،

بنارس میں تدریسی خدمات غالباً اسی مناقشہ کے نتیجہ میں دونوں حضرات بہت جلد اپنے عہدہ سے الگ ہو گئے، حافظ صاحب نے اپنے وطن بنارس میں مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور قاضی محب اللہ نے شاہی عہدے حاصل کئے، بقول آزاد،

اختر طالع قاضی محب اللہ عروج کرد، و	قاضی محب اللہ کو بڑا عروج حاصل ہوا
بمرحمت منصبے بلند و صدارت مجموعہ	اور وہ بلند منصب کے مالک اور پورے
ممالک ہندوستان، و خطاب "فاضل خاں"	ہندوستان کے صدر اور "فاضل خاں"
سرمایہ مباہات بدست آورد، [1]	کے خطاب سے سرفراز ہوئے،

قاضی صاحب معزولی کے بعد دوبارہ دکن گئے اور حیدرآباد منصب قضا پر مامور ہوئے پھر سلطان عالمگیر کے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کے معلم بنائے گئے اور جب سلطان عالمگیر نے شاہ عالم کو کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تو قاضی صاحب بھی اس کے ساتھ کابل گئے، ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے بعد ان کو

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۱،

بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ پورے ہندوستان کے صدر الصدور کے جلیل القدر منصب پر سرفراز ہوئے، ان کے حریف حافظ صاحب اس سے پہلے صرف صوبہ اودھ کے صدر تھے مگر اس کے بعد قاضی صاحب کی حیات مستعار کے دن بہت جلد پورے ہوگئے اور ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے وفات پائی، مآثر الکرام کے اس بیان سے کہ "و او چندے از خلد مکان بہ منصب صدارت بلدۂ لکھنؤ مامور بود" اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب زیادہ دنوں تک لکھنؤ کی صدارت کے عہدے پر نہیں رہ سکے اور اس سے علیحدہ ہوتے ہی اپنے وطن بنارس آکر مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں ایسے منہمک ہوئے کہ پھر کہیں کا رخ نہیں کیا، ان کے والد کے زمانہ سے ان کے خاندان پر جو شاہی عنایات تھیں ان ہی پر قانع رہ کر علمی و دینی خدمت میں لگے رہے، عمر کے آخری حصہ میں بعض حوادث کی وجہ سے دہلی گئے، مگر جلد ہی بنارس واپس آگئے،

افسوس کہ حافظ صاحب کی تعلیمی و تدریسی خدمات کی تفصیلات کتابوں میں نہیں ملتیں حالانکہ ایک مدت دراز تک انھوں نے تشنگان علم و فن کو سیراب کیا اور بہتوں نے آپ سے تحصیل علم کی، البتہ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی (م ۱۱۶۱ھ) کے بارے میں مآثر الکرام میں تصریح ہے کہ وہ حافظ صاحب کے خاص شاگردوں میں اور اپنے والد کی شہادت کے بعد انہی سے تحصیل علم کی تھی،

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت	انھوں نے اپنے والد کی شہادت کے بعد
والد ماجد خود از حافظ امان اللہ	حافظ امان اللہ بنارسی اور مولوی قطب
بنارسی و مولوی قطب الدین نمود،[۱]	الدین سے علوم متعارفہ کی تعلیم حاصل کی،

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱، تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۷

ملا نظام الدین کے والد ماجد حضرت ملا قطب الدین سہالی کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے حافظ صاحب لکھنؤ کی صدارت سے الگ ہو چکے تھے اور اس وقت ان کی تدریسی خدمات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا، نزہتہ الخواطر میں ہے کہ اس وقت ملا نظام الدین کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی، قیام فرنگی محل لکھنؤ کے بعد جب اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے جائس جاکر ملا علی قلی جائسی سے کتب درسیہ پڑھیں، پھر بنارس میں حافظ صاحب سے شرح مواقف کا درس لیا،

ثم ذهب الى بلدة بنارس	جائس کے بعد بنارس جاکر حافظ امان اللہ
وتلمذ على الحافظ امان الله	کی شاگردی کی اور ان سے شرح مواقف
بن نور الله البنارسي وقرع	کا درس لیا،
عليه شرح المواقف [1]	(نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴)

ملا نظام الدین جیسے فاضل روزگار کا حافظ صاحب کی درسگاہ سے پیدا ہونا انکے دریائے فیض کا سب سے بڑا ثبوت ہے،

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴،

قرون وسطیٰ کی تاریخ

اور مورخین کا ایک تنقیدی جائزہ

از جناب الطاف حسین خاں شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۲)

مسلمان حکمرانوں پر ہندو بیزاری کا الزام اس کی تردید سے پہلے تزک جہانگیری سے ایک رباعی پیش کی جاتی ہے،

بہر نگہبانیٔ خلق خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پے آسودگیٔ جملہ تن رنج پسندم بہ تن خویشتن

اس رباعی میں جہانگیر نے جس خلق خدا کا تذکرہ کیا ہے اس کی تقریباً اسّی فیصدی آبادی ہندو تھی اس کے باوجود انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں پر ہندو بیزاری کا الزام لگایا ان میں علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور اورنگ زیب سرفہرست ہیں، لیکن تاریخی شواہد اسکے خلاف ہیں، علاء الدین کے عہد میں ہندو جوتشیوں کا احترام کیا جاتا تھا[۱]، علائی سکوں پر سنسکرت کی عبارت درج ہوتی تھی اور شاہی جشنوں کے موقع پر ہندو مسلمان عوام محلات شاہی میں آتے تھے[۲]، شادی اور بیاہ میں ہندوانہ طور طریقے اپنائے جاتے تھے[۳]، علاء الدین کی انصاف پسندی کا تذکرہ خسرو جیسے شاعر نے

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۶، [۲] تاریخ مبارک شاہی ص ۷۹، [۳] دولرانی خضر خاں علی گڑھ اڈیشن ص ۱۵۳،

جنکو ہندو بھی مانتے ہیں، کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

(۱) چو عدلش ذرہ ذرہ فاش گشتہ — دہان فتنہ پر خشخاش گشتہ
زعدلش جانِ مظلوماں سحرگاہ — فرامش کردہ تیر اندازی آہ
ترازو بست انصافش جہانگیر — کہ ہم سنگست در روے چاکر و میر
زمیں را دور او بس کز بداں رفت — ہمہ جا دزد مرد و پاسباں خفت
جہاں را خلعت امن آنچناں داد — کہ تیغ از ننگ عریانی شد آزاد
ہمیشہ حشمتش در چارہ سازی — بظالم سوزی و عاجز نوازی[1]

(۲) حسن دہلوی نے کئی موقعوں پر اسکے عدل و انصاف کا ذکر کیا ہے،

دریں میزاں کہ عدلش شاہ آمد راست میدارد
بیک پلہ مواجب ہی بدیگر پلہ انعامش[2]

ز عدل او تخلفاے عرب شدہ حیراں
چہ از کمال جہانگیریش ملوک عجم[3]

خدایگان سلاطین علاء دین محمد
کشید دائرہ عدل گرد مرکز عالم[4]

علاء الدین کے عہد میں مخلوق خدا کو بڑی راحت نصیب تھی اور سماج کا سب سے کمتر طبقہ بھی آرام سے زندگی گذارتا تھا،[5]

مسلمان بادشاہوں میں محمد بن تغلق سب سے بد نصیب حکمراں تھا ۔ یہ اپنی

---

[1] شیریں خسرو، علی گڈھ اڈیشن، ص ۱۶، نیز دیکھئے، خزائن الفتوح علی گڈھ ۱۹۲۷ء ص ۲۷،

[2] دیوان حسن سجزی دہلوی، ص ۳۰۲، [3-4] ایضاً ص ۷۰، [5] خیر المجالس، اردو ترجمہ، ص ۲۹۰،

روشن دماغی کے اعتبار سے وقت سے پہلے پیدا ہوا۔ اس کو دو سو سال بعد شیر شاہ سوری کا جانشین ہونا چاہئے تھا۔ اس سے[1] مورخ اس لئے خفا ہوئے کہ یہ انکو خوش نہ رکھ سکا۔ شعرا[2] اس لئے خفا ہوئے کہ اس میں مذہبی رواداری تھی اور اپنی قصیدہ خوانی پسند نہ تھی۔ اس کے عہد کا سیاح ابن بطوطہ اس لئے ناراض ہوا کہ اس کی عقلیت پسندی اس کو ناگوار تھی۔ اس سے کام لے کر انگریز مورخوں نے تعصب اور ظلم و ستم کی ایک گمراہ کن داستان محمد بن تغلق کے خلاف کھڑی کر دی لیکن مورخوں اور تذکرہ نگاروں کی تصانیف اور درویشوں و شعرا کے ملفوظات و دواوین[3] میں اس بادشاہ کی رواداری، انصاف پسندی اور ہندو نوازی کی مثالیں بھی ملتی ہیں، محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوؤں سے میل جول اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ شادی و بیاہ میں ہندوانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے۔ ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کی بہن کی شادی کی جن رسوم کا ذکر کیا ہے اس میں ہندو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں[4] مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ بھی اسی تغلق خاندان سے شروع ہوتا ہے۔"[5] محمد بن تغلق کے ہندو نجومیوں، جوگیوں اور ہندو اور جینی[6] فنکاروں سے گہرے تعلقات تھے، مولانا عصامی لکھتے ہیں :

---

[1] اس سلسلہ میں دیکھئے: سلطان محمد بن تغلق کی سیرت تاریخ فیروز شاہی کی روشنی میں (رسالہ مصنف، علیگڑھ دسمبر ۱۹۴۳ء)

[2] مولانا عصامی، [3] دیکھئے قصائد بدر چاچ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۷۹ء، [4] عجائب الاسفار جلد دوم ص ۱۲۵،

[5] مقالات سلیمان حصہ اول ص ۱۷۴، [6] دیکھئے فارسی کی ہندوانہ تصانیف" از ڈاکٹر بنارسی داس، اورینٹل کالج میگزین (ضمیمہ) اگست ۱۹۴۲ء، ص ۳۵، ۳۶، نیز دیکھئے محمد بن تغلق کی ہندو نوازی" آئینہ حقیقت نما، جلد دوم ص ۲۱

ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرا بدل راہ کفار دادہ جا[1]

انصاف پسندی کا جہانتک تعلق ہے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو کے استغاثہ پر بادشاہ قاضی کی عدالت میں بحیثیت ملزم حاضر ہوا تھا،[2] اسی کا بیان ہے کہ جب بادشاہ دولت آباد میں تھا تو روزانہ گنگا جل اس کے استعمال کے لیے پہونچایا جاتا تھا،[3] بادشاہ ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت کرتا تھا، سہ

جماعت بجمعہ در انداختہ ابا ہندواں ہولی باختہ[4]

انگریز مورخین نے سب سے زیادہ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، اُکی تقلید ہندو مورخین نے بھی کی، ممکن ہے اس قسم کے کچھ واقعات بھی ملجائیں لیکن اسکے بالمقابل اس کی ہندو نوازی کے بھی بکثرت واقعات ملتے ہیں، اس کے زمانہ میں سرسٹھ[6] ہندو امراء ہفت ہزاری کے منصب پر سرفراز تھے، مسلمان اتنی تعداد میں اس منصب پر نہ تھے،[5] اورنگ زیب کے عہد کے ہندو اہل قلم جن القاب و آداب اور جن اوصاف سے اُسے یاد کرتے ہیں اس سے اس کی انصاف پسندی اور رواداری کا احساس ہوتا ہے،[6] بہاری لال[7] نے ۱۰۹۸ھ میں سو بھاسکھ پنڈت کی مدد سے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو "مرات اچھرا" کے نام سے جامعہ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اسکے

---

[1] فتوح السلاطین ص ۴۹۱، [2] عجائب الاسفار ص ۱۳۰، [3] ایضاً جلد دوم ص ۳، [4] فتوح السلاطین ص ۴۹۱، [5] ملاحظہ ہو: عہد عالمگیر کے تین ہندو مورخ، عالمگیر لاہور، جلد شمارہ ۱۱، [6] دیکھئے،

Alamgir's Tolerance in the light of the contemporary Jain Literature, by Jnan chandra, Journal of the Pakistan Historical society. Vol. VI No. 4, 1958, Vol. VII No. 1, 1959,

[7] مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات سلیمان حصہ اول تاریخی میں لال بہاری لکھا ہے لیکن میرے مسودہ پر محترمی جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب نے بہاری لال تجویز فرمایا ہے،

دیباچہ میں لکھتا ہے،

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ خلافت پناہ، عادل، مظفر...... مجسم داد و کرم قاطع آثار جفا وستم...... ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ کہ دورش چوں قدح پُر نشاط، وزمانش مانند ایام شباب پر سرور وانبساط، روزبازار فضل ودانش است، ہندی نژادان فارسی دوست را نظم ونثر از حد بیشتر است[1]"

اورنگ زیب کی ہندو نوازی اور رواداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آج بھی ہندوستان کے بہت سے مندروں میں اس کی دی ہوئی مددمعاش کے فرمان موجود ہیں[2]، تیج بہادر سپرو صاحب فرماتے ہیں:

ان ہندو مندروں کے لئے جنھیں اسلام کے بنیادی عقیدے کے خلاف بت پرستی ہوتی ہے مسلمان حکمرانوں نے فراخدلی سے جاگیریں عطا کی ہیں تاریخ کے نہایت بدنام اور متعصب ہیرو اورنگ زیب کے چھ سو سے زیادہ فرمان برآمد ہوچکے ہیں جن کے ذریعہ ہندو مندروں کے اخراجات چلانے کے لئے بیش قیمت جاگیریں دی گئی تھیں[3]،

---

[1] مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۲۵۴-۲۵۵۔ [2] ہمارے ضلع فتحپور ہسوہ میں دریائے گنگا کے کنارے آباد ایک برہمن خاندان کے پاس عالمگیر کا مددمعاش کا دیا ہوا ایک فرمان موجود ہے، ایک مقدمہ کے سلسلہ میں جس کے وکیل میرے والد (محمود حسن خان شروانی مرحوم) تھے یہ فرمان عدالت میں داخل کیا گیا تھا اور برہمن کامیاب ہوا، [3] روزنامہ دعوت (سہ روزہ اڈیشن) دہلی ۱۶ مئی ۶۸ء

نیز دیکھئے:- ① Mookals and the Jogis of Jakhbar, Indian Institute of Advanced study, Simla.

(۲) مقالہ "عالم گیر کے عہد میں مندروں کا انہدام" معارف ستمبر ۱۹۴۳ء،

ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند لکھتے ہیں :

اگر کوئی ریسرچ اسکالر ان مندروں اور مٹھوں وغیرہ کی فہرست تیار کرے جنھیں اس ملک کے مسلمان بادشاہوں نے جاگیریں عطا کی تھیں تو یہ فہرست بہت طویل ہوگی،[۱]

جب کبھی کسی مسلمان حکمراں نے غیر مسلم عوام کے خلاف قدم اٹھانا چاہا تو وہ علماء و صوفیائے کرام سامنے آئے جن کا مسلک یہ تھا ،

(۱) مسلمانان بردین خود باشند و ہندواں بر کیش خود، آیت لکم دینکم ولی دین بیان ایں معنی است "[۲]

(۲) در طریق ماہیست کہ با مسلمان و ہنود صلح باید داشت و ایں بیت شاہد آوردند

حافظ اگر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[۳]

مسلمانوں پر وطن دشمنی کا الزام | انگریزوں نے مسلمانوں پر وطن دشمنی کا بھی الزام لگایا ہے جو سراسر غلط ہے ، ایک حدیث میں وطن کی محبت کو ایمان کا جزء قرار دیا گیا ہے "حب الوطن من الایمان"[۴]

خسرو کہتے ہیں :

حب وطن ہست ز ایمان بہ یقیں　　　دیں ز رسول آمدہ کای زمرۂ دیں[۵]

---

[۱] India divided اس کتاب کے خاص خاص حصوں کا ترجمہ "مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک ایک جھلک" میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے کیا ہے ، [۲] مکتوبات شیخ احمد سرہندی جلد اول ، ص ۴۵ بحوالہ Naqshbandi Influance on Moghal Rulers and Polities by prof. K. A. Nizami. Islamic culture, Jan. 1965, P. 45.

[۳] نافع السالکین ، ملفوظات حضرت شاہ سلیمان تونسوی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۶۵۱ ، [۴] محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اسکے باوجود اس سے وطن کے متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے ، [۵] مثنوی نہ سپہر

(باقی حاشیہ ص ۱۲۱ پر)

مولانا شبلی فرماتے ہیں:

"اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی فضیلت نے مذہبی حیثیت پیدا کی اور حدیث و تفسیر کی مقدس کتابوں میں اس قسم کی روایتیں درج کی ہیں[1]"

یہ ملک ہمیشہ سے مسلمانوں کا منظور نظر رہا،

کانش در روں میرہ داز جنت اثر — لیک ہند است نشیمش دگر

ہند تواں گفت کہ خلد است بدیں[2] — زاں سبب خاص بر اصحاب یقیں

مسلمانوں کے حب وطن کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اجنبی حکمرانوں کی طرح ہندوستان کو محض مال غنیمت نہیں سمجھا بلکہ اس کو اپنا وطن بنا لیا، یہیں پیدا ہوئے اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے،

ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق اور اسکی تعمیر و ترقی میں ان کا حصہ

مسلمان حکمرانوں اور امرا نے اس سرزمین کو ہر حیثیت سے سنوارا ہے اور نکھارا ہے، ایران و ترکستان کے گل بوٹوں سے یہاں کے چمن میں اضافے کئے ہیں[3]، سمرقند و شیراز کے علماء کو یہاں بلا کر ہندوستانیوں کے ذہنی دریچوں کو روشن کیا ہے[4] ؎

جاں نثاروں نے ترے کر دئے جنگل آباد

خاک اڑتی تھی جہاں اہل وفا سے پہلے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۰) بہ تصحیح ڈاکٹر وحید مرزا، کلکتہ ۱۹۴۸ء ص ۱۵۰، [1] مقالات شبلی تاریخی حصہ دوم جلد ششم صفحہ ۲۲۲-۲۲۳، [2] نہ سپہر ص ۱۵۷، [3] ابوالفضل نے آئین اکبری میں ایران و ترکستان سے لائے ہوئے پھولوں کی فہرست دی ہے دیکھئے: The A'in-i-Akbari, Translated by H. Blochmann Delhi, 1965, P 93, نیز دیکھئے: اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی معارف اگست تا نومبر ۱۹۴۹ء، [4] تفصیل کے لئے دیکھئے، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول دہلی، ۱۹۶۶ء،

یہاں کے فنکاروں کو کسب علوم کے لئے ایران بھیجا،

(۱) عبدالباقی نہاوندی لکھتا ہے:

ایران مکتب خانہ ہندوستان است و مستعدان کسب حیثیات در انجامی نمایند که در ہندوستان در مجلس سامی این سپہ سالار بکار برند[۵۱]

(۲) عبدالرحمٰن چغتائی لکھتے ہیں:

ہندی آرٹسٹوں نے ایرانی آرٹسٹوں سے فن سیکھا اور مغل دربار پر چھا گئے، میر سید علی تبریزی اور استاد عبدالصمد شیرازی کی تعلیم نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، جہانگیر نے بعض ہندو آرٹسٹوں کو ان کی قابلیت کی بنا پر تعلیم کے لئے ایران بھیجا تھا۔ ان پر بڑی بڑی نوازشیں کی گئیں تاکہ یہاں کا فن مصوری درجہ کمال حاصل کر سکے[۵۲]

فن تعمیر موسیقی اور شعر و سخن وغیرہ سارے فنون لطیفہ میں ایران و ترکستان کا تازہ خون شامل کیا گیا خطاطی و تزئین کاری مسلمان اپنے ساتھ لائے اور اس سرزمین کو لالہ و نسترن کا تختہ بنا دیا،

اسلام امن و صلح کا مذہب ہے اس نے انسانیت کے رشتے سے سارے انسانوں کو بھائی قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ محبت و رواداری کی تعلیم دی "کونوا عباد اللہ اخوانا" اگر کچھ حکمرانوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اس پر عمل نہیں کیا تو یہ انکا قصور ہے لیکن اگر کچھ علمائے حق اور صوفیائے کرام کا ایک طبقہ جو اسلامی تعلیمات کے سچے حامل تھے ہمیشہ ان کی اصلاح کیلئے

---

۵۱ بحوالہ۔ ایران میں طبی تعلیم کا نظام (عہد صفویہ میں) مصنفہ کوثر چاند پوری، ۵۲ (فنون لطیفہ اور تذکرۂ اسلام ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۶۵ء

موجود رہا ہے جو انکو راہ راست دکھاتا رہتا تھا ان کے یہاں ظاہر کے ساتھ باطنی اصلاح پر زیادہ زور رہتا ان کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلے رہتے تھے انکا نظام سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا دہلی، ملتان، لاہور، سرہند، اجمیر، ہانسی، بدایوں، اجودھن اور ناگور انکے خاص مرکز تھے جہاں وہ اصلاح اخلاق و تعمیر کردار کا کام انجام دیتے ! وہ شکستہ دلوں کی دلداری کرتے تھے[1]۔ . . . ہندو درویشوں نے بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا بھگتی تحریک[2] کا مقصد بھی یہی تھا، اس کے اثر سے ہندوستان کے زمین و آسمان بدل گئے ؎

کز قدوم شاں مثال بوستاں جنت الماوی شدہ ہندوستاں[3]

خسرو نے بھی اس کو جنت نشان قرار دیا ہے ؎

بہشتے فرض کن ہندوستاں را کز آنجا نسبت است ایں بوستاں را[4]

کشور ہند است بہشتے بزمیں صحبتش اینک برخ صفحہ ببیں[5]

ان صوفیائے کرام نے ہندوستانی سماج کے سدھار کے لئے بڑی عظیم جد وجہد کی اور سارے انسانوں کو برابری کا درجہ دیا شیخ حمید الدین ناگوری ناگور کے ایک ہندو کی نسبت فرماتے تھے کہ خدا کا ولی ہے[6]، صوفیائے کرام اپنے عہد کے حکمرانوں کو بھی ہندو و مسلمان عوام کے ساتھ عدل و انصاف کی تعلیم دیتے تھے،

(۱) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ایلتتمش کو ہدایت کرتے ہیں:

۱؎ حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں: بزرگوں نے بطور مجاز فرمایا ہے کہ شکستہ دلوں کی دلداری معرفت ہے "دُرر نظامی" اردو ترجمہ ص ۱۵، ۲؎ جب صوفیائے کرام نے اپنی تعلیم (توحید و مساوات) کو عوام میں پھیلایا تو بھگتی کے رہنماؤں نے بھی اپنی بھولی ہوئی تعلیم کو دوبارہ زندہ کیا، خدا کی عبادت اور محنت پر زور دیا اور چھوت چھات اور ذات پات کی مخالفت کی، عہد سلاطین دہلی کے خاص بھگتی کے رہنما حسب ذیل ہیں: راما نند، ولبھ اچاریہ، چیتنیہ، نام دیو، کبیر اور گرو نانک، ۳؎ سیر العارفین، شیخ جمالی، دہلی ۱۳۱۱ھ ص ۸ ۴؎ دول رانی خضر خاں، ص ۴۴، ۵؎ نہ سپہر ص ۱۵۱، ۶؎ فوائد الفواد، ترجمہ غلام احمد خاں بریاں ص ۱۶۴ نیز دیکھئے سیر العارفین ص ۱۱۴،

"اے والیٔ دہلی! .... با خلق نیکوی کنی رعیت پرور باشی ہر کہ با رعیت رعایت کند و با خلق نیکوئی کند خدائے تعالیٰ او را نگاہ دارد و جملہ اعدای او (را) دوست دارد"[1]

(۲) حضرت بو علی شاہ قلندرؒ اپنے ایک خط میں علاء الدین خلجی کو لکھتے ہیں:

"علاء الدین ...... مقرر داند کہ با بندگان خدائے نیکو کند"[2]

(۳) حضرت امیر خسروؒ اپنے دور کے سلاطین کو عدل و انصاف اور عوام کی بھلائی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے، قطب الدین مبارک خلجی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

بخشش آں شد کہ نماید مدام | جہد در آسودگیٔ خاص و عام
بر ہمہ دارد بہ بیاباں و کاخ | جا خوش درہ ایمن و نعمت فراخ
آنچہ بفہرست رقم یافت چیست | باز نمایم بہ بیان درست[3]

علاء الدین خلجی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

یاد کن زاں گدائے بے توشہ | کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ
کہ چو فرداش مار کار کند | اوّل از مفلساں شمار کند
پیل چوں مور را تہ پا سود | پرسش از پیلیان خواہد بود[4]

(۴) ۷۵۲ھ میں فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے کہلا بھیجا کہ بادشاہ وعدہ کرے کہ مخلوق خدا کے ساتھ انصاف کریگا ورنہ میں ان غریب عوام کے لئے خدا سے دوسرا فرماں روا طلب کروں، فیروز شاہ تغلق

---

[1] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۱۹ [2] ایضاً ص ۲۶۹ بعض کتابوں میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے ایک ملازم کو کوتوال نے پیٹ ڈالا تو انھوں نے شاہ وقت کو لکھا ؎ باز خواں ایں عالمِ بد گوہر + ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے [3] نہ سپہر، ص ۲۲۹ - ۲۲۸ [4] بحوالہ حیات خسرو، مصنفہ محمد سعید احمد مارہروی آگرہ ۱۹۰۳ء ص ۵۱

نے عدل کرنے کا وعدہ کیا، اس پر حضرت چراغ دہلوی رح نے اسے دعائے خیر دی[۱]،

(۵) حضرت مخدوم جہانیاں رح نے ان بیس[۲] ٹیکسوں کی مخالفت کی تھی جو عوام پر بوجھ بنے ہوئے تھے اور فیروز شاہ نے ان ٹیکسوں کو معاف کر دیا تھا،

(۶) حضرت شیخ نجم الدین رح (متوفی ۱۳۹ اھ) اورنگ زیب کو لکھتے ہیں:

بادشاہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کثیر مخلوق کا نگران مقرر کیا ہے اور آپ انکے حقوق کے ذمہ دار ہیں، اگر آپ کو تکلیف پہونچ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن رعیت کو تکلیف نہ پہونچے[۲]،

صوفیہ مظلوم کی دادرسی کی خاطر درباروں میں جانا اپنے لئے ثواب دارین سمجھتے تھے[۳]، اور عوام کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین جانتے تھے[۴]، قرون وسطیٰ میں عوام کے صحیح رہنما یہی صوفیہ تھے جب کبھی انکو کسی پر ظلم کی اطلاع ہوتی تھی تو ان کے چہرے آنسو سے تر ہو جاتے تھے، حضرت نظام الدین اولیا رح کے ان آنسوؤں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جو ایک غریب ہندو لڑکی کے لئے نکلے تھے جسے اس کے ماں باپ سے چھڑا کر پانچ ٹکوں میں دیوگیر میں فروخت کیا گیا تھا[۵]،

ان درویشوں کی چھ سو سالہ جدوجہد رنگ لائی اور یہاں کی فضا میں توحید کے ترانے گائے جانے لگے اہل قلم اس روحانی تحریک سے اتنا متاثر ہوئے کہ اٹھارویں وانیسویں صدی

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۲۹، [۲] رسالہ آستانہ، مارچ، ۱۹۵۰ء، ص ۵۰،

[۳] سیر العارفین، ص ۱۰۷، [۴] حضرت چراغ دہلوی رح فرماتے ہیں "ان کو مخلوق کے ساتھ رہنا ہوتا ہے بلکہ قیلولہ بھی اکثر میسر نہیں ہوتا، خیر المجالس (اردو ترجمہ) ص ۵۹، [۵] دیکھئے: محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء - حیات و تعلیمات، مصنفہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم،

ہیں انھوں نے اپنی تصانیف میں ہندوؤں کے لئے لفظ کافر[۵۱] کے استعمال سے اجتناب کیا،[۵۲]
(حالانکہ ہندو مصنفین اپنے ہندو بھائیوں کے لئے لفظ کافر بلاتکلف استعمال کرتے رہے)
متاخرین میں حضرت مظہر جانجاناں ہندوؤں کو موحد مانتے تھے، اس کا اثر ہندوؤں
پر بہ پڑا کہ وہ اپنی فارسی تصانیف کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کرنے لگے،
خسرو سے اقبال تک ہم کو ہندو اور ہندوستان سے محبت ہی کی تلقین ملتی ہے،

ع　خورشید پرست شد مسلمان　　زیں ہندوگان شوخ و سادہ[۵۳]

اے کرد بت طعنہ بہ ہندو بری　　ہم زوے آموز پرستش گری　خسرو

توانہ ملک عراقی واز گوں کن عادت پیشیں

اگر خواہی کہ حسن و رونق ہندوستاں بینی (عرفی)

می ندانی خط ہندوستاں　　آں عزیز خاطر صاحب　(اقبال)

دیکھئے ہندوستان کو امیر خسرو، تلسی داس، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں
فیضی اور مظہر جانجاناں کب نصیب ہوتے ہیں ؎

خزاں رسید گلستاں آں جمال نماند　　سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی　　بروکہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

ہمارے وہ روشن ضمیر مفکرین جنھوں نے رواداران سماج کی تشکیل دینے میں اپنی ساری
توانائیاں صرف کردی تھیں، اگر زندہ ہو جائیں تو انھیں یہ دیکھکر انتہائی قلق ہوگا کہ آج کا

---

۵۱ صوفیائے کرام کے ملفوظات کے صفحات الٹتے جائیے آپ کو ان کی زبان سے لفظ کافر نہیں
ملے گا کسی انسان کو کافر کہنا ان کے مسلک کے خلاف تھا، حرف بد را بہ لب آوردن خطاست × کافر و مومن ہمہ
خلق خدا ست، ۵۲ وقائع عالم شاہی، بحوالہ ہند و تہذیب او مسلمان برہان جون ۱۹۶۸ء، ۵۳ قران السعدین ص ۲۷،

ہندوستان ان کے خوابوں کے ہندوستان سے بالکل مختلف ہے۔

مغربی تدبر نے ہمارے مذہب اور ہمارے سماج اور ہماری تعلیم کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ ہم اپنی تمام قومی اور مذہبی خوبیوں سے محروم ہو گئے ہیں، دوسری قومیں ہم سے آگے نکل چکی ہیں اور ہم ابھی اپنے چمن کے خاشاک بھی صاف نہیں کر سکے ہیں،

۵۰ نوبہار دیگراں آمد بہارم برنگشتا ابر برگشت و ہوا برگشت و ایام برنگشت

(باقی)

بزم تیموریہ حصہ اول

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر، ظفرشاہ آخری مغل بادشاہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان سب کے درباروں کے متوسل امراء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا جس کو ارباب ذوق نے بہت پسند کیا، اور اپنی کتابوں اور مضامین میں اس دور کے مستند ترین ماخذ کی حیثیت سے اس کے حوالے دیے، اور ناقدین نے مصنف کی محنت و جانفشانی کی داد دی، اب نظر ثانی کے بعد اس میں اس کثرت سے اضافے ہوئے اور اس کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ قدر دانوں اور مستفیدین کی آسانی کے لیے اس کو دو جلدوں میں کر دیا گیا، تاکہ بانی سلطنت تیموریہ سے لیکر ظفرشاہ تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، اس جلد میں جو زیر طبع ہے، تین متقدم الذکر مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امراء، شعراء اور فضلا کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہو، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے۔

منیجر

لفظ گجری کی تحقیق
(ناقدینِ اردو کے نظریات کی روشنی میں)

از ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی

قدیم اردو زبان کے ناموں میں ایک نام گجری یا گوجری بھی ملتا ہے، یہ امر بادی النظر میں تو آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے مشہور صوبہ گجرات سے قائم کیا جائے اور اس رشتہ سے اس کو گجری کہا جائے، مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، چونکہ دکنی اور گجری کے علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لیے ان دونوں زبانوں میں مشابہت اور اشتراک کے باعث غلط فہمی کے بڑے مواقع ہیں، اس سلسلہ میں بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ دکنی کے اساطین ادباء و شعراء اپنی زبان کو گجری کہنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی تاویل خاصی پیچیدہ اور اہم ہے، محققین اردو نے اس بارے میں مختلف نظریات قائم کیے ہیں، اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان نظریات کے بارے میں اختلاف کی بڑی گنجایش ہے،

اب میں اردو کے ان محققین کے افکار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ جب اردو دکن میں رائج ہوئی تو اس کا نام دکنی رکھا گیا اور جب وہ گجرات پہنچی تو مقامی زبان کے اثر

سے گجری کہلائی، وہ لکھتے ہیں:

"ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہلِ دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا، اہلِ گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھدیا، لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے، شیخ خوب محمد چشتی نے مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے، اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے، لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولی، بولی گجرات[1]

پروفیسر شیرانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ دکن اور گجرات دونوں نے تغلقوں کے دور کی اردو کو رواج دیا ہے، اور بعد میں اردو کے مولد میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن سے وہ کسی حد تک محروم رہے، البتہ شیرانی مرحوم نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ برہان الدین جانم اور دوسرے دکنی ادبا نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا ہے، انھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ دکنی ادبا نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا ہے، مگر اس مسئلہ کے حل کرنے سے انھوں نے احتراز کیا ہے۔

"گجری" کی تاویل و تفسیر میں ایک نظریہ وہ ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں پیش کیا ہے، یہ عقل کو ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ اپیل کرتا ہے، اور واقعات سے مناسبت رکھتا ہے، اس میں اس امر کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گوجری یا گجری کیوں کہا؛ ان کا بیان انکی زبان سے سنیے:

"گجرات کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، شاعر اور ادیب بے سروسامانی کی حالت میں

---

[1] پنجاب میں اردو مصنفہ پروفیسر محمود خاں شیرانی، دسمبر ۱۹۲۸ء لکھنؤ، ص ۹۴

ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے، ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فیاضی دکھائی اور اپنے آدمیوں کو بیش تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علما اور شعراء کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا، مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آ گئے، ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔[1]

بظاہر یہ دلیل دل کو لگتی نظر آتی ہے، مگر پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے یہ دلائل میراں جی شمس العشاق یا برہان الدین جانم کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اکبر اعظم نے مظفر شاہ والی گجرات کے مقابلہ کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کو مامور کیا، جس نے اس کو شکست دے کر گجرات پر قبضہ کر لیا، اور مظفر شاہ کو آگرہ روانہ کر دیا، مگر اس نے اثنائے راہ میں خودکشی کر لی، گجرات کی تسخیر ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء ہوئی، اس زمانہ میں جانم کے سنہ وفات کے لحاظ سے ان کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے اس لیے ایک روایت کے مطابق وہ اس واقعے کے ۵ برس بعد تک زندہ رہے۔[2]

مولوی عبدالحق صاحب ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کو قرار دیتے ہیں،[3] برہان الدین جانم کا سنہ وفات ایک روایت کے مطابق ۱۰۰۶ھ ہے،

---

[1] ہندوستانی لسانیات مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۰۳۔ [2] ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم تحقیق پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی حیدر آباد ۱۹۷۱ء ص ۱۹۔ [3] اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ از مولوی عبدالحق طبع دوم ص ۴۵

اور ایک بیاض کی درج تاریخ کے مطابق ۹۹۲ھ ہے[1]. ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گجرات کی حکومت کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب گجراتیوں کے بیجاپور آنے کا اثر حضرت جانم کی زبان پر اتنا نہیں پڑ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو دکنی کے بجائے گجری کہنا شروع کر دیں؟

اب مسئلہ پھر وہی رہ جاتا ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا؟ اس سلسلہ میں اردو کے محقق مولوی عبدالحق بابائے اردو نے اس کے بارہ میں اپنے خیالات بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیے ہیں. انھوں نے ان مضامین میں جو وقتاً فوقتاً قدیم اردو کے بارے میں رسالہ اردو میں لکھتے تھے. اس بحث کو بڑی اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات اور الفاظ ہی کی بنا پر برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری سے تعبیر کرتے ہیں. وہ لکھتے ہیں کہ برہان الدین جانم کا اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ "اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے. کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے، اور یہ قدرتی بات ہے، ہندی کہو یا اردو، یہ جہاں گئی مقامی رنگ کی جھلک اس میں ضرور آگئی"[2].

قدیم دکنی پر اور خاص اس زبان کی اس شاخ پر جو گجرات اور بیجاپور میں بولی جاتی تھی، گجراتی زبان کا اثر پڑا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے بعض اوقات گجری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[3]. گجری سے مطلب اردو کی اس شاخ سے ہے جو

---

[1] ارشاد نامہ. ص ۱۳۱ [2] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۴۲

[3] ایضاً ص ۴۷

گجرات میں بولی جاتی تھی، اور جس میں مقامی گجراتی کے لفظ مل جل گئے تھے۔[۱]

اس طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور بابائے اردو کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گجری اردو کی ایک شاخ ہے جس میں گجراتی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہے، دونوں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ بیجاپور کے شعرا، اپنی زبان کو "گجری" اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے یہاں گجراتی زبان کے اثرات ملتے ہیں، البتہ ڈاکٹر زورؔ صاحب اس کی تاویل زوال سلطنت گجرات اور گجری ادیبوں کی بیجاپور میں آمد سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنے گجری ادیب بیجاپور آگئے کہ مقامی لوگ بھی اپنی زبان کو گجری کہنے لگے، مولوی عبدالحق صاحب بغیر کسی خاص واقعہ کے حوالہ کے کہتے ہیں کہ گجری زبان کا رواج گجرات اور بیجاپور میں تھا، جہاں گجراتی زبان کے الفاظ اردو سے مل جل گئے تھے، انھوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، انکی بحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیجاپور کے علاوہ دوسرے دکنی علاقوں کے لوگ اپنی زبان کو "گجری" نہیں کہتے تھے، اس لیے اس کی چھان بین بھی ضروری ہے، کہ کتنے دکنی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زبان کو "گجری" کہا ہے؟ پروفیسر اکبرالدین صدیقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برہان الدین جانم کے والد میراں جی شمس العشاق نے اپنی زبان کو کبھی گجری نہیں کہا ہے،[۲] چونکہ گجرات کا زوال میراں جی کے زمانہ میں نہیں بلکہ برہان الدین جانم کی عمر کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس لیے ایک لحاظ سے ان کے گجری لکھنے کی اس تاویل کو تسلیم کیا جا سکتا تھا جو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے پیش کی ہے، لیکن چونکہ ان کی تصنیف ارشادنامہ کا سال تصنیف ۹۹۰ھ ہے،

---

[۱] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۲۰۰۔ [۲] ارشاد نامہ ص ۳۸

اور اس کے دو برس یا ۱۶ برس بعد ان کی وفات ہوئی، لہٰذا ڈاکٹر طاؤور کے بیان کردہ واقعہ کا اثر ان پر پڑنا ناممکن ہے،

اس بحث میں ایک ماہر دکنیات و گجریات کا نام لینا ضروری ہے، جس نے بمبئی میں اردو ادب کے چراغ کو برسوں روشن رکھا، یعنی پروفیسر نجیب اشرف ندوی، انھوں نے اپنی مشہور کتاب "لغات گجری" کے مقدمہ میں اس زبان پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور تفصیل سے بتایا ہے کہ گجرات اور دکن کے سیاسی حالات نے اردو کی عظمت کو بڑھایا، ان دونوں علاقوں کے حکمرانوں نے بدیسی چیزوں کے مقابلہ میں دیسی چیزوں کو اہمیت دینی شروع کی، اسی اصول کے تحت انھوں نے فارسی کے مقابلہ میں اردو کو اہمیت دی، اور دکن اور گجرات میں فرق صرف یہ ہے کہ گجرات میں اردو کو طویل عرصہ تک پروان چڑھنے کا موقع نہ ملا، اس کے مقابلہ میں دکن میں مختلف مسلم حکومتیں مدت دراز تک قائم رہیں، جن کی وجہ سے صدیوں تک اردو سرکاری سرپرستی میں ترقی و عظمت کی منزلیں طے کرتی رہی، وہ مزید لکھتے ہیں کہ گجرات میں جو ادبی اردو پروان چڑھی اس کے تین نام ملتے ہیں: (۱) گوجری (۲) گجری (۳) بول گجرات،

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"مجھے اردو کی ابتدا اور نشو و نما میں گجرات کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا، اور ایک سال کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد میں نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل ہے، میں خوش ہوں کہ اردو کے محققین نے اس کو تسلیم کر لیا ہے،[۱]

[۱] لغات گجری مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی طبع ... بمبئی ص ...

ابتک جو نظریات گجری زبان کے بارے میں پیش کیے گئے ان کا خلاصہ یہ ہو کہ گجری اردو کی وہ شاخ ہے جس نے علاقہ گجرات میں نشو و نما پائی، اور گجری میں گجراتی زبان کے الفاظ شامل ہیں، مگر ان نظریات سے بالکل مختلف ایک نظریہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سینتی کمار چیٹرجی کا ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے چیٹرجی کے نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے،

> " اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں، یہ نام گجران والا اور گجرات (پنجاب) کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے، چنانچہ دکنی شعراء شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین دکنی نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔[1]

سینتی کمار چیٹرجی کا نظریہ اس لیے قابل غور ہے کہ ضلع گجران والا کے سپاہی اتنی تعداد میں دکن میں نہیں آئے جس کی بنا پر زبان کا نام ہی بدل جائے، اسکی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی، فوج میں دلی اور پنجاب کے سپاہی تھے، دراصل چیٹرجی کو یہ شبہہ دکنی کے پنجابی پن سے ہوا، یہ وہی شبہہ ہے جو اس سے قبل محمود خاں شیرانی کو بھی ہوا تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام علامتیں جو دکنی کے پنجابی پن کو ظاہر کرتی ہیں، کھڑی بولی والے گروہ کی ساری زبانوں میں موجود ہیں، جن کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کے آخری ابواب میں تفصیل سے پیش کیا ہے، پنجاب کے لوگ اردو بولیں یا ہندی مگر ان کی اصل زبان پنجابی رہی ہے، جو وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ استعمال کرتے ہیں، اس بنا پر یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا،

گجری کے سلسلہ میں ایک بالکل نیا نظریہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے پیش کیا ہے، حال ہی میں انھوں نے ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم کو مرتب کر کے

---

[1] اردوئے معلی لسانیات نمبر ص ۱۳۲

بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں وہ اپنے نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"دکن میں اکثر قصبات میں خواہ وہ حیدر آباد ریاست کے ہوں یا میسور ریاست کے، شاہراہ پر کسی مخصوص جگہ روزانہ بھاجی، ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کی مستعملہ سامان کی عارضی دوکانیں لگتی ہیں اور بازار کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے چونکہ یہ دوکانیں مستقل نہیں ہوتیں اس لیے ان کا روبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا اور چونکہ یہ دوکانیں گذرگاہ پر ہوتی ہیں، اس لیے ان کو گذری کہا جانے لگا اور کثرت استعمال سے گجری ہوگیا۔"

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان بازاروں کی زبان فصیح نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کیلئے دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو گجری اسی لحاظ سے قرار دیا ہے، یعنی گذرگاہ کی آسان زبان جس کو ہر شخص سمجھ سکے۔"[1]

لفظ گجری تجارت کرنے کے معنی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کے قصہ میں یہ لفظ اسی معنی میں میر امن نے استعمال کیا ہے میں نے اس سلسلہ میں کچھ معلومات مشاہدات کی روشنی میں جمع کی ہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ "گجری" کے نام سے آج بھی ہندوستان کے کئی شہروں میں بازار موجود ہیں، مثلاً بمبئی میں ایک بازار گجری کہلاتا ہے، کانپور میں بھی گذری بازار ہے، البتہ الہ آباد میں ایک بازار گدڑی بازار کہلاتا ہے، اس سے پروفیسر صدیقی کے نظریہ کی تائید ضرور ہوتی ہے، مگر یہ مسئلہ اردو کے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔

---

[1] ارشاد نامہ ص ۴۲

در اصل صدیقی صاحب نے گجری کی اصل، تاریخ اور عام روایتوں سے صرف نظر کرکے لسانیات کے میدان میں تلاش کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دکنی ادیبوں کے گجری لکھنے کی یہ تاویل تسلیم کرلی جائے، جیسا کہ بعض حقایق اس طرف اشارہ کرتے ہیں تو پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ گجری کوئی زبان نہیں اور یہ دکنی ہی کا دوسرا نام ہے، یا پھر گجری کے دو مفہوم تسلیم کرنے پڑیں گے یعنی ایک وہ زبان جو گجرات میں مسلم دور حکومت میں رائج تھی دوسری دکنی جو گذری سے گجری بن گئی۔

یہاں یہ سوال بھی ذہن میں اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اکثر دکنی ادباء و شعراء اپنی زبان کو "گجری" کہتے، صرف ادبائے بیجاپور ہی نے کیوں اپنی زبان کو گجری قرار دیا، یہی اعتراض سینتی کمار چیٹرجی کے نظریہ پر بھی وارد ہوتا ہے،

در اصل گجری زبان کے اتنے شواہد ہیں کہ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں خصوصاً خوب محمد چشتی ـــــ وغیرہ کی تخلیقات اس زبان کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں، سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ دکنی شعراء اپنی زبان کو گجری کیوں لکھتے ہیں ؟

اس سلسلہ میں جو نظریات اس مقالہ میں زیر بحث آئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر زور اور مولوی عبد الحق کا کہنا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات کی بنا پر ایسا ہے،

(۲) چیٹرجی کہتے ہیں کہ گجرانوالا ضلع پنجاب کے دکن جانے والے سپاہیوں کا دیا ہوا نام ہے،

(۳) پروفیسر اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گجری در اصل گذری تھا، جو کثرت استعمال

سے گجری بن گیا، مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ بعض شعراء بولی گجرات یا بولی گجرات لکھتے ہیں تو اس کی کیا تاویل ہوسکتی ہے؟[1] نیز یہ کہ دوسرے دکنی شعرا اپنے آپ کو گجری کیوں نہیں لکھتے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ صدیقی صاحب کے دلائل کافی وزنی ہیں، اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کا نظریہ غور و فکر کا مستحق ہے۔

دراصل دکنی اور گجری کے علاقے اتنے متصل ہیں کہ ان میں فروق بہت کم ہیں اور راقم کا نظریہ ہے کہ زوال سلطنت گجرات ۱۵۷۲ء کے بعد جب شعراء و ادباء کثرت سے بیجاپور آگئے تو کچھ دن تک تو گجری کا نام باقی رہا اور بیجاپوری ادباء اس سے متاثر ہوئے، مگر بعد میں وہ دکنی میں ضم ہوگئی، اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھی، اس بنا پر دکنی اور گجری میں اختلافات ایک خاص دور تک رہے، پھر بعد میں اردو کی وہ شاخ جو گجری کے نام سے گجرات میں پروان چڑھ رہی تھی، وہ دکنی میں ضم ہوگئی، اسی بنا پر ولی دکنی مشہور ہوئے۔ حالانکہ تمام تذکروں سے ان کا گجراتی ہونا ثابت ہے، سید ظہیر الدین مدنی نے اپنے رسالہ "ولی گجراتی" میں اس موضوع پر تذکروں سے ناقابل انکار شہادت پیش کی ہے۔ کہ ولی گجراتی تھے، نہ کہ دکنی یا اورنگ آبادی، مگر چونکہ ولی کے دور میں "گجری" دکنی میں ضم ہوچکی تھی، اس لیے وہ دکنی کے شاعر مشہور ہوئے نہ کہ گجری کے۔

---

[1] صدیقی صاحب ایک نجی خط میں اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ "بولی گجرات اور بول گجرات سے مراد گجراتی زبان یا گجراتی آمیز زبان ہو، اس کو گجری سے تعلق نہیں، گجراتی زبان نے کبھی شاہوں کی سرپرستی نہیں پائی، ایسا کوئی کارنامہ نہیں جس میں گجراتی بادشاہوں کی تعریف کی گئی ہو۔

وقت کی ناپ

اور

مساواتِ وقت

از جناب بدیعُ الزماں صاحب اعظمی

تاریخ کی ابتداء کے قبل ہی انسان نے وقت کی ناپ کا تصور کر لیا تھا، اور سال، مہینہ اور دن کی تقسیم کر لی تھی، اُس کی یہ کامیابی انسانی ارتقار کی ایک کڑی ہے، دن کا رات میں بدلتے رہنا، موسموں کی باقاعدہ تبدیلی، اور سورج، چاند، سیاروں اور ستاروں کا طلوع و غروب ان سب باتوں کے مشاہدہ ہی نے غالبًا انسان کو وقت کی ناپ کا راز بتایا ہوگا،

آج سے ہزاروں سال قبل کے ہیئت داں رات رات بھر آسمان کو تکتے رہتے تھے، انھوں نے ستاروں کی رفتار اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد قمری مہینوں کی تشکیل کر لی تھی، اگرچہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں اسی نہج پر کام ہوتا رہا، مگر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسا ملک اس سلسلے میں سب سے آگے تھا، گمان غالب ہے کہ اہلِ بابل نے آج سے چھ ہزار قبل سورج کے فلکی راستے کو بارہ برجوں میں بانٹ رکھا تھا، جو بارہ مہینوں سے منسوب تھے، انھوں نے قمری سال کو مہینوں اور دنوں میں، اور دنوں کو ساعتوں اور دقیقوں میں

تقسیم کر رکھا تھا، اُن کے نزدیک ۶۰ کا عدد، یا اُس کے اجزائے ضربی متبرک مانے جاتے تھے، پورا دن ۱۲ گھنٹے کا، اور ایک گھنٹہ ۷۲۰۰ سکنڈ کا ہوتا تھا، ان کا سال ۳۶۰ دنوں پر مشتمل ہوتا تھا، ہمارا موجودہ کلنڈر بھی انہی کا بنایا ہوا ہے، مگر تصحیح شدہ،

سال کو دنوں میں ترتیب دینا، اور دنوں کو گھنٹوں میں تقسیم کرنا دراصل وقت کی ناپ نہیں ہے ہیئت دانوں نے تو اپنے مشاہدات سے سال کی پوری ناپ کر لی تھی، مگر گھنٹوں اور منٹوں کو ناپنا کچھ آسان نہ تھا، انسان نے اس کا معقول حل تلاش کرنے میں ہزاروں سال گذار دیئے، یہ مسئلہ لاینحل ہی رہا ہوتا، اگر سترہویں صدی عیسوی میں ایک قابلِ اعتماد گھڑی کی ایجاد نہ ہوئی ہوتی،

اس سلسلے میں خلدانیوں نے جو کامیابی حاصل کی، وہ دھوپ گھڑیوں کی شکل میں تھی، ان گھڑیوں میں ایک بڑا عیب یہ تھا، کہ ابر آلود مطلع کے وقت یہ کام نہ دیتی تھیں، اور غروبِ آفتاب کے بعد تو اپنا کام ہی بند کر دیتی تھیں، دوسرا عیب یہ تھا کہ جس عرض البلد کے لئے یہ تیار کی جاتی تھیں، اسی مخصوص عرض البلد میں کام دیتی تھیں، وقت کی ناپ کا دوسرا طریقہ آبی گھڑیوں کی شکل میں تھا، یہ بھی عام طور پر مستعمل تھیں،

گھڑیوں کی ایجاد اور اُن کے استعمال نے پرانے طریقوں کو پس پشت ڈال دیا، کلاک کی ایجاد کا سہرا ایک جرمن مسمی ہنری ڈی وک (Henry de Vick) کے سر ہے، اس کی بنائی ہوئی کلاک سنہ ۱۳۷۹ء میں منظرِ عام پر آگئی تھی سنہ ۱۹۵۷ء میں ایک ڈچ مسمی ہیوگنس (Huygens) نے ایک ایسی کلاک بنائی تھی، جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ پنڈولم والی پہلی کلاک تھی، ہیوگنس کی تحقیق نے گھڑی سازی کے فن کا ایک نیا دور شروع کر دیا تھا، سترہویں صدی کے اختتام تک کسی حد تک صحیح وقت دینے والی گھڑیاں بننے لگی تھیں آج تو دنیا

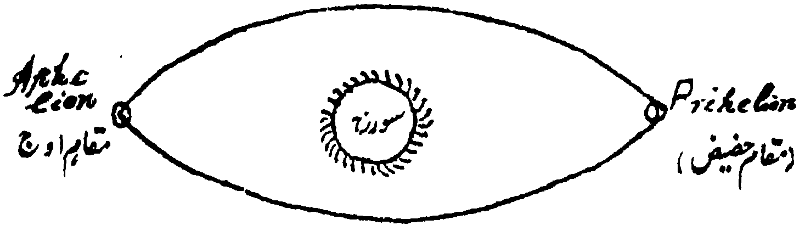
کی بڑی بڑی رصدگاہوں میں ایسی صحیح وقت دینے والی گھڑیاں موجود ہیں جن میں صرف $\frac{1}{1000}$ سکنڈ یومیہ کا فرق پڑنے کا امکان ہوتا ہے ۔ ان رصدگاہوں میں اب تو خاص قسم کی دوربینوں کی مدد سے جنھیں (Photographic Zenith Tubes) کہتے ہیں، گھڑیوں کا وقت صحیح کیا جاتا ہے ۔ اور وہاں سے بذریعہ ریڈیو نشر ہوتا رہتا ہے ۔

صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں مساوات وقت (Equation of time) کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے ، کیونکہ دھوپ گھڑیوں کا وقت تو مقامی اصلی شمسی وقت (Local True Solar Time) کہلاتا ہے ، مقامی وقت اس لئے کہ دھوپ گھڑیاں جہاں نصب ہوتی ہیں ، وہ وہیں کے وقت کو بتاتی ہیں ، اس لئے کہ اُن کا تعلق براہ راست سورج کی روشنی سے ہوتا ہے ، دھوپ گھڑیوں والا وقت آج کی دنیا میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے لئے قابلِ عمل نہیں ہوتا ، کیونکہ نہ تو سال بھر دن ہی یکساں ہوتے ہیں ، اور نہ ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ہی یکساں ہوتا ہے ، اس لئے صحیح وقت جاننے کے لئے سورج کے مقابلہ میں ستاروں کا سہارا لینا زیادہ مناسب ہے ۔

ماہرین ہیئت زمین کی محوری گردش اور ستاروں کے محلِ وقوع ہی سے دن کی لمبائی ناپتے ہیں ، کوکبی دن (Sidereal Day) لمبائی کے لحاظ سے شمسی دن (Solar Day) کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے ، اسے یوں سمجھئے کہ اگر سورج اور کوئی ستارہ ایک سیدھ میں سمت الراس پر ہوں تو زمین کی ایک پوری محوری گردش کے بعد وہی ستارہ پھر سمت الراس پر آجائے گا ، مگر اسی اثناء میں چونکہ

سورج ذرا مشرق کی سمت کھسک چکا ہوگا، اس لئے سورج کو سمت الراس پر آنے میں تقریباً ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ اور لگ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوکبی دن شمسی دن کے مقابلہ میں ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ چھوٹا ہوتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ شمسی دنوں کے لحاظ سے پورا سال ۳۶۵ ¼ دنوں کا ہوتا ہے، مگر ایک سال میں ۳۶۶ ¼ کوکبی دن ہوتے ہیں۔

اس لئے ماہرینِ ہیئت ایک ایسے فرضی سورج کا وجود تسلیم کرتے ہیں، جس کا مدار نہ صرف گول ہے، بلکہ زمین کے مدار پر زاویہ قائمہ بھی بناتا ہے، اسی فرضی سورج سے حاصل کردہ دنوں کو اوسط شمسی دن (Mean Solar Day) کہتے ہیں جو نہ صرف سال بھر یکساں ہوتے ہیں، بلکہ اصلی شمسی دنوں (True Solar Day) کے اوسط کے برابر ہوتے ہیں، زمین اپنے محور پر ۲۳ گھنٹہ اور ۵۶ منٹ میں ایک گردش کرلیتی ہے، مگر ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ۲۴ گھنٹہ مانا جاتا ہے، چونکہ اسی اصول پر گھڑیاں بنائی جاتی ہیں، اور وہ یہی وقت دیتی بھی ہیں، اس لئے چار منٹ یا صحیح طور پر ۳ منٹ ۵۵.۹۱ سکنڈ کی اوسط رعایت گھڑیوں کے وقت میں کرنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ مدار ارضی بیضوی ہونے کی وجہ سے سورج کے سالانہ طواف میں ہماری زمین کبھی سورج کے قریب آجاتی ہے، اور کبھی دور ہوجاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محوری گردش کبھی تیز ہوجاتی ہے، اور کبھی سست، اس لئے شمسی دنوں میں یکسانیت نہیں رہ جاتی، شروع جنوری میں جب کرۂ ارض مدار ارضی کے مقام حضیض یعنی پریہیلین (Perihelion) پر ہوتا ہے، تو سورج سے کسی قدر قربت کی وجہ سے اس کی گردش تیز تر ہوجاتی ہے، اسلئے ان ایام میں گھڑیوں کا رعایتی وقت کچھ اور ناکافی ہوجاتا ہے، جیسا کہ نیچے دی ہوئی شکل سے ظاہر ہوتا ہے:۔



مدارِ ارضی

گھڑیاں تو ہمیں اوسط شمسی وقت اور دھوپ گھڑیاں ظاہری شمسی وقت بتاتی ہیں، ان دونوں کے اوقات کے فرق کو "مساداتِ وقت" کہتے ہیں، خاص خاص جنتریوں، اور کیلنڈروں میں تاریخ وار یہ فرق درج رہتا ہے جس کی مدد سے ہم طلوع و غروب آفتاب اور دوپہر کے اوقات کو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، چونکہ دھوپ گھڑیاں دوران سال میں کبھی سست چلتی ہیں، اور کبھی تیز، اس لئے ان کا وقت ان گھڑیوں کے مقابلہ میں کبھی آگے رہتا ہے اور کبھی پیچھے، ان دونوں کے اوقات میں سب سے زیادہ فرق ۱۶ منٹ اور ۲۰ سکنڈ کا ہوتا ہے جو نومبر اور فروری کے مہینوں کی وسطی تاریخوں میں رہتا ہے۔

نومبر کی وسطی تاریخوں میں جب دھوپ گھڑیاں نصف النہار کا وقت دیتی ہیں، تو ہماری گھڑیوں میں ۱۱ بجکر ۴۳ منٹ اور ۴۲ سکنڈ ہوتے ہیں، اور فروری کی وسطی تاریخوں میں جب نصف النہار ہوتا ہے تو ہماری گھڑیوں میں ۱۲ بجکر ۱۴ منٹ اور ۲۰ سکنڈ ہو جاتے ہیں، گویا ماہ فروری میں سورج کو سمت الراس پر آنے میں یا نصف النہار ہونے میں گھڑی کے وقت کے اعتبار سے تاخیر ہونے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ موسم سرما کے چھوٹے دنوں کے بعد جب دن بڑھنے لگتا ہے، تو دوپہر کے بعد کا وقت تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے جس کی وجہ سے نومبر کے مقابلہ میں فروری کے مہینہ میں غروب آفتاب دیر میں ہونے لگتا ہے، یعنی طلوع آفتاب سے ۱۲ بجے تک کے وقفہ کے مقابلہ میں بارہ بجے سے غروب آفتاب تک کا وقفہ بڑھ جاتا ہے

ماہرینِ ہیئت کوکبی اوقات ہی سے گھڑیوں کا وقت ٹھیک کرتے رہتے ہیں، مگر کوکبی اوقات ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتے، کیونکہ کوکبی نصف النہار دورانِ سال میں دن اور رات کے مختلف اوقات میں پڑا کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آج کوئی تارہ ٹھیک بارہ بجے دن میں سمت الراس پر آئے تو ۴ منٹ یومیہ کے حساب سے پندرہ دن بعد وہی تارہ گیارہ بجے سمت الراس پر آجائے گا، اور ایک مہینہ بعد دو گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، چھ مہینہ بعد بارہ گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، یعنی وہی تارہ آدھی رات کو سمت الراس پر آجائے گا، علیٰ ہذا القیاس، اس لئے ہم کوکبی وقت کو ہیئت دانوں ہی کے لئے چھوڑتے ہیں، ہمارے لئے تو اوسط شمسی وقت (mean solar time) یا دوسرے الفاظ میں گھڑیوں کا وقت ہی مناسب ہے کیونکہ ہماری عملی زندگی تو سورج کے طلوع و غروب سے ہی وابستہ ہے۔

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۵)

خلیفہ منصور اور اس کے قاضی ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ

ص - ۲۸ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۱

ماخوذ از تاریخ الخلفاء امام جلال الدین سیوطی،

عبدالسلام ندوی دسمبر ۱۹۰۶ء

۱- امام مسلم. ص - ۱۳ - ۳۲

حوالہ - ۲۷۹/۲

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابو زرعہ اور ابو حاتم جیسے اوذشناس بزرگ ان کو معرفت حدیث میں اپنی زمانہ کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، اسحٰق کوشیخ خود امام صاحب سے خطاب کر کے فرماتے تھے۔

۲- شیخ شہاب الدین سہروردی جولائی ۱۹۰۶ء،

ص - ۱ - ۲۰ حوالہ ۲۷۹/۳

شیخ الاشراق نے جس طرح فلسفۂ ارسطو کے عام مسائل پر طرز استدلال پر مقدمات پر خردہ گیریاں اور نکتہ چینیاں کی ہیں، اسی طرح اپنے خاص مسائل کو ایسے جدید پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ فلسفۂ ارسطو کی مطلق آمیزش نہیں پائی جاتی اور درحقیقت یہی خصوصیت اُن کے فلسفہ کو علمِ کلام اور فلسفۂ ارسطو دونوں سے ممتاز کرتی ہے۔"

عبدالحیٔ حسنی حکیم

ندوہ کا مشرقی مطلع اپریل ۱۹۴۰ء

(تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی) ص - ۱۵ - ۲۱

حوالہ ۲۸۶

حضرت مرادآبادی سے ایک ملاقات کے تاثرات)

عبدالرحمٰن ندوی نگرامی جون ۱۹۱۶ء و جولائی ۱۹۱۶ء

۱- ابوتمام ص ۲۵

(عرب کا مشہور شاعر) حوالہ ۲۸۶

۱۹۲ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۱ھ میں انتقال کیا، عام ابتدائی حالات سے مورخین نے زیادہ بحث نہیں کی ہے، نسب کے لحاظ سے طائی ہے، شاعری میں خاص کمال پیدا کیا۔"

۲- اسماعیل بن عباد مئی ۱۹۱۶ء

ص - ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۶

"سلطنتوں میں ابویہیہ خاندان کو بھی علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ہم ذیل میں اسی خاندان کے فاضل رکنِ سلطنت اسماعیل بن عباد کا تذکرہ

کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ دولت اور علم کیونکر ہمارے اسلاف کی گود میں ہم آغوش ہوکر پرورش پاتے تھے"

۳۔ قاضی ابو یوسف　　فروری ۱۹۱۶ء

ص ۲۲ - ۳۲

حوالہ ۲۸۷

علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قاضی صاحب کے جن مصنفات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں بعض تو اس قسم کے ہیں، کہ چند ابواب فقہیہ لئے ہوئے ہیں، اور انہی میں سے ایک ایک باب پر مستقل تصانیف ہیں، مثلاً کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، ان کے علاوہ مستقل تصانیف یہ ہیں، کتاب اختلاف الامصار" کتاب الرد علی مالک بن انس کتاب الخراج وغیرہ،

مولانا عبدالماجد دریابادی　　اگست ۱۹۴۰ء

عہد قریب کا ایک گمنام عالم　　ص - ۴ - ۱۴

"مولانا منظر کریم دریابادی"　　حوالہ ۲۸۰/۲

"پچھلی صدی میں صوبہ اودھ کی خاک سے متعدد علماء ایسے اٹھے کہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے گئے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے گمنام ہوگئے، کوئی یادگار اپنی ایسی نہ چھوڑی کہ نام عرصہ دراز تک چلتا۔ انہی گمنام مشاہیر میں ایک مولانا منظر کریم صاحب دریابادی تھے،"

علوی، ضیاء الحسن　　اگست ۱۹۰۸ء

ا۔ "ابن خلکان اور یورپ"　　ص - ۱۳ - ۲۷ - حوالہ ۲۷۹/۵

"مستشرق موسیو میک گلکن ڈی اسلین فرانسیسی کے دیباچہ ابن خلکان کا اردو ترجمہ جس میں اس کی شخصیت اور کتاب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۲۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ص صفر ۱۳۲۳ھ

ص ۔ ۱۳ ۔ ۲۷

حوالہ ۹/۲۷ ۵

اُن کی تصنیفات ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہیں، فنِ رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے لیکن ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتدا سے اس زمانہ تک ہزاروں علماء و فضلاء کے حالات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہے، آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علماء اور اربابِ عمائم کے حالات قلمبند کئے، آزاد نے اس اولیت پر فخر کا اظہار کیا ہے، اور بجا کیا ہے،

۳۔ ابنِ خلدون جون ۱۹۰۸ء و جولائی ۱۹۰۸ء

حوالہ ۹/۲۷ ۵

آٹھویں صدی میں علامہ ابنِ خلدون کا دور تھا، جو نہ صرف اس صدی بلکہ تمام عہد اسلام کے شہرۂ آفاق مؤرخ تھے، اور جن کا نام موضوعِ کلام کا عنوان ہے، انھوں نے اپنی تاریخ کی آخری جلد میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنے واقعات لکھے ہیں،،

۴۔ ابو موسیٰ جابر بن حیان طرطوسی محرم ۱۳۲۴ھ

ص ۔ ۹ ۔ ۱۹

حوالہ ۹/۲۷ ۲

مذکورۂ بالا شخصیت کا تفصیلی تعارف، اس کی ایجادات و انکشافات کا تذکرہ، تصانیف

کی تعداد اور اُن کا سرسری جائزہ اور علمی خصوصیات پر فاضلانہ تبصرہ،!

۵۔ ذوالنون مصری　　　جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

ص ۔ ۱ ۔ ۱۰

حوالہ ۹ ۲۷ / ۲

مسلمانوں میں ذوالنون کی غیر معمولی شہرت ہے، اُن کا نام ادب سے لیا جاتا ہے، اُن کی کرامتیں نہایت دلچسپی سے بیان کی جاتی ہیں، بایں ہمہ شہرت یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ذوالنون کیمیا میں بھی صاحبِ فن تھے، اور مرکبات کے تجزیہ و تحلیل اور مفردات کی ترکیب و تالیف میں اُن کو خاص دستگاہ تھی،"

۶۔ شیخ محمد عبدہٗ　　　جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ

ص ۔ ۲۵ ۔ ۳۲

حوالہ ۹ ۲۷ / ۲

تاریخ، تفسیر، ادب، اور علمِ توحید میں ان کی کتابیں یادگار رہیں، جن میں کتاب التوحید، تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ عصر، تفسیر عما یتساءلون، حواشی بصائر نصیریہ، شرح نہج البلاغۃ، شرح مقامات بدیع الزماں شائع ہو چکی ہیں، صاحب موصوف ۱۳۱۷ء میں مصر کے مفتی اعظم ہوئے،

" شخصیت اور اُن کی دعوت پر روشنی ڈالی گئی ہے،"

معشوق حسین، ایم۔ اے،　　　اپریل ۱۹۰۷ء

باباطاہر ہمدانی　　　ص ۔ ۲۶ ۔ ۳۱ ۔　حوالہ ۹ ۲۷ / ۴

حوالہ ۹ ۲۷ / ۴

طاہر عریاں ہمدانی، ان کا نام بابا طاہر تھا، اپنے زمانہ کے صوفیائے کرام میں سے تھے، بعض مصنفین کا بیان ہے کہ یہ سلاطین سلجوقیہ کے زمانہ میں تھے، مگر یہ غلط ہے، یہ دیلمیوں کے زمانہ میں گذرے ہیں، قدمائے شیوخ میں اُن کا بھی شمار ہے، اُن کا زمانہ سنہ ۴۱۰ھ ہے، اور عنصری و فردوسی اپنے تمام معاصرین سے پہلے ہی انتقال فرمایا، اُن کی رُباعیاں آج تک مقبول ہیں"

"اخلاقیات وسماجیات"

سیلمان ندوی - سید علامہ جنوری ۱۹۰۸ء

"علمائے سلف میں استغنا" ص - ۱۷ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۴

ہمارا خیال ہے کہ استغنا تمام اخلاق کی جان ہے، تکمیل اخلاق نہیں ہوسکتی جب تک انسان کا دل دنیا اور اس کی دولت سے غنی نہ ہو، اور اس کی آنکھوں میں دنیا کی زخارف کی کچھ عزت نہ ہو، فن اخلاق کے جلی عنوان یہ ہیں، راست بازی، آزادی رائے، صبر و شکر، علوئے ہمت، استقلال، صدق، خودداری، عزت نفس، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو استغنا کے بغیر حاصل ہوسکتی ہے،

شبلی نعمانی علامہ جمادی الاولی

۱۳۲۳ء

"اخلاق عرب" ص - ۲۰ - ۲۴

حوالہ ۲۷۹/۱

"جدید تعلیم میں ابتدا سے آخر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارنامہ ہوں
سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لئے جب فضائل انسانی کا ذکر آتا ہے، تو خواہ مخواہ
ان ہی لوگوں کی زبان پر آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں"

عربوں کے بعض اخلاقی واقعات کا تذکرہ،

شروانی حبیب الرحمٰن خاں شعبان ۱۳۲۳ھ

"اخلاق" ص - ۱ - ۸

حوالہ ۹/۱ ۲۷

اسلام نے اخلاق کو اپنی تعلیم میں کیا مرتبہ دیا، پاکیزہ اخلاق کو حاصل کرنے اور
برے اخلاق سے بچنے کی کس درجہ تاکید کی، تعلیم اسلام میں اخلاق حسنہ کیا ہیں، اور برے
اخلاق کیا، ان امور کو احادیث نبویہ کی رو سے بیان کرنا مقصود ہے؛

عبد السلام قدوائی ندوی فروری ۱۹۴۲ء

فقر کی شان استغناء" ص - ۱۸ - ۲۰ حوالہ ۲/۴۹ ۲

اخبار الاخیار سے بعض بزرگوں کے شان استغناء کے واقعات ترجمہ کئے گئے ہیں،

عبد السمیع، ایم۔اے، اپریل ۱۹۴۰ء تا اگست ۱۹۴۰ء

بچہ اور تعلیم حوالہ ۱۰/۱ ۲۸۷

" مختلف اقوام نے بچہ کی تعلیم و تربیت پر کس طرح توجہ کی، آئندہ صفحات پر ان کی
کوششوں کا تذکرہ ہوگا، ازمنۂ ماضی کی تاریخی اوراق پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے گا کہ قدیم
نظریات کیا تھے، اور اب ماہرین علم النفس نے جو جدید نظریات پیش کئے ہیں، وہ کیا ہیں، اور
کن اصولوں کے ماتحت بچہ کی تعلیم و تربیت کے موثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے،

عبدالماجد دریابادی (مولانا) جون ۱۹۱۱ء

حکمائے یورپ کے اقوال۔ ص ۔ ۲۵۔ ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

حکمائے یورپ کے اقوال مختلف موضوعات پر پیش کئے گئے ہیں،

عزالدین ندوی، اکتوبر ۱۹۴۱ء

"معاشی توازن کے نئے تخیل، ص ۔ ۲۱ ۔ ۳۰

حوالہ ۲۸۰/۴

میں چاہتا ہوں تمام نوزائیدہ نظام آپ کے سامنے آئیں، پھر اشتراکیت نظام کو نمایاں کر کے اسلام کے اقتصادی اور فطری نظام کو پیش کر دوں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور معاشی نظام کی کتنی اعلیٰ دلکش اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے،

عام نظریات اور اسلامی نظریہ کا جائزہ؛

علوی، ضیاء الحسن رمضان ۱۳۲۲ھ

عمر اور صحت کی تدابیر، ص ۔ ۳۰ ۔ ۳۳

حوالہ ۲۷۹/۱

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ تدابیر صحت سے عمر میں ترقی ہوتی ہے لیکن ثبوت ان ممالک میں علم الاعداد کی روسے کچھ آسان نہیں، کیونکہ آبادی و ولادت اور اموات کا شمار یہاں رائج ہوئے بہت کم عرصہ گذرا ہے بخلاف یورپ اور انگلستان کے جہاں یہ طریقہ مدت سے رائج ہے،

ہادی شاہ محمد ہادی شعبان ۱۳۴۰ء

"اخلاق کا حصہ قومی تعمیر میں! ص ۱۴۔ ۲۲ حوالہ ۲۸۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی پکار ایک بجلی کا کڑکا تھا یا ایک صوت ہادی تھی جس نے عرب کی ساری زمین ہلا دی، اور سارے عرب میں اصلاح کا شور مچ گیا، ایک زمانہ کے بگڑے ہوئے بنے، اور بہت دن کے سوئے ہوئے جاگے، اور آن کی آن میں ساری دنیا پہ چھا گئے،"

مقدمہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے،

قرآن مجید کا اخلاق پر اثر۔ آنحضرتؐ کی تعلیمات کا اخلاق پر اثر، صحابہ کرام اخلاقی حیثیت سے اسلامی قوت کا انحطاط۔ یورپ کا عروج، یورپ کا اخلاقی انحطاط،

مباحث منطق حکمت وفلسفہ

سلیمان ندوی، (سید علامہ) جنوری ۱۹۱۲ء

"فنائے مادہ" ص - ۱۵ - ۲۴

حوالہ - ۲۷۹/۹

سائنس اور مذہب کے متنازع فیہ مسائل میں ایک مسئلہ فنا و بقا کے مادہ کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ بذات خود کوئی متنازع فیہ مسئلہ نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے ثبوت و عدم ثبوت کا لازمی نتیجہ حدوث و قدم عالم ہے، اس لئے اس مسئلہ کی سرحد پر آکر خواہ مخواہ سائنس اور مذہب کا حریفانہ مقابلہ ہو جاتا ہے،

"قوت باصرہ اور نور" اکتوبر ۱۹۰۶ء

ص - ۱۳ - ۲۳

حوالہ - ۲۷۹/۳

"مسلمانوں نے ان دونوں شاخوں پر کثرت سے بحثیں کی ہیں، فلسفہ اشراق کی عمارت

کا سنگِ بنیاد یہی تو ہے، گو اس علم نے بھی یونانی لباس میں رہ کر عربی لباس پہنا ہے، مگر مسلمانوں کی علمی کوششوں نے اس فن کی حیثیت ایسی بدل دی ہے، کہ وہ خود اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں"

ماؔدہ کے اجزاے ترکیبی" فروری ۱۹۱۰ء

ص - ۱۷ - ۲۹

حوالہ $\frac{279}{5}$

"کیمیائی تحقیق کا جب اور قدم آگے بڑھا، تو خود ان عناصر کی بساطت، حقیقت اور خواص پر بحث ہونے لگی، ابتداءً علماے کیمیا کا خیال تھا، کہ عناصر کی حقیقت جداگانہ ہے مگر دقتِ نظر نے یہ ظاہر کیا کہ یہ عناصر خود ایک نہایت ہی لطیف عنصر سے مرکب ہیں، اور یہی لطیف عنصر کل عناصر کی حقیقت ہے، اور یہی ایک چیز تمام کائنات کی اصل ہے"

(باقی)

الفاروق

(حصہ اوّل و دُوئم)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری، ان کا طرزِ حکومت، اور ان کے دورِ خلافت میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح و حضرت عمروؓ بن العاص اور دیگر صحابہؓ کے فتوحات، عراق و شام، مصر و ایران وغیرہ کے فتح کے ولولہ انگیز واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا ایمان افروز منظر، مسائل فقہیہ میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات کی تفصیل، مؤلفہ: حجۃ الاسلام مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

قیمت غیر مجلد ۱عہ "منیجر"

ادبیات

غزل

جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری

اے دوست مسرت کے پہلو میں الم بھی ہیں رقصاں ہے خوشی جن میں آنکھیں وہی نم بھی ہیں
ہے نام خدا لب پر اور دل میں صنم بھی ہیں اک طرفہ بشر یارو اس دور میں ہم بھی ہیں
کچھ ایسے بھی بت ہیں گھر جن کا ہے صنم خانہ رہتے ہیں دلوں میں جو کچھ ایسے صنم بھی ہیں
دنیا کو مٹاتے ہیں کچھ ہوش و خرد والے تخریب کے میداں میں کچھ اہلِ قلم بھی ہیں
ایامِ گذشتہ کی پُر کیف حسیں یادیں سرمایۂ شادی بھی ہیں مایۂ غم بھی ہیں
اغیار ستم پیشہ کے جور کا شکوہ کیا مٹنے کا میرے باعث اپنوں کے کرم بھی ہیں
اک وہ بھی زمانہ تھا جب لطف کی باتیں تھیں اب وقت وہ ہے جب ہم محرومِ ستم بھی ہیں
اے چشمِ حقیقت بیں ہشیار کہ دنیا میں گلزار براہیمی اور باغِ ارم بھی ہیں
ہے ایک سی حالت سب کی قلزمِ ہستی میں گرداب میں گر تم ہو منجدھار میں ہم بھی ہیں
اوضاعِ زمانہ کو سمجھا ہے ولی ہم نے ہیں محرمِ شادی بھی اور خوگرِ غم بھی ہیں

غزل

از جناب ماہر القادری

نگاہِ دوست کی ہو خیر تشنگی کیسا ہے وہ آ گئے تو ضرورت شراب کی کیا ہے

ادھر سے بندہ نوازی کی کوئی حد نہ رہی — میں سوچتا ہی رہا فرضِ بندگی کیا ہے

سفر کا لطف تو جب ہے ٹھہر ٹھہر کے چلو — یہ راہِ شوق ہے ایسی روا روی کیا ہے

نیاز مندوں سے وحشت ہے ربط غیروں سے — حضور! آپ کا معیارِ دوستی کیا ہے

خیال و فکر کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ — ہجوم ہے یہ اندھیروں کا روشنی کیا ہے

بڑے بڑوں کی نہیں اُس جگہ پذیرائی — ہم ایسے خاک نشینوں کا ذکر ہی کیا ہے

نہ حُسن ہی کو خبر ہے نہ عشق کو معلوم

وصال و ہجر میں یہ ربطِ باہمی کیا ہے

غزل

از

جناب چندر پرکاش بجنوری

محبت اپنا خود آئین بھی ہے — یہی ایمان بھی ہے دین بھی ہے

تڑپنے کا سلیقہ ہو تو نادان — تڑپنے میں بڑی تسکین بھی ہے

محبت ہے بظاہر جتنی سادہ — مزاجاً اتنی ہی رنگین بھی ہے

پرِ پرواز اور فکرِ اسیری — پرِ پرواز کی توہین بھی ہے

نہ راس آئے اگر غم اہلِ دل کو — تو پھر یہ حادثہ سنگین بھی ہے

کئی دن سے عجب عالم ہے جوہر

طبیعت شاد بھی غمگین بھی ہے

نوائے عصر

جنابِ یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام، — قیمت :- تین روپے،

مطبوعاتِ جدیدہ

احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی،
صفحات ۳۲۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت لعہ، ناشر ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی ۶۔

شریعت کے احکام و مسائل میں زمانہ کے حالات کی رعایت ضروری ہے، اور ہر زمانہ کے فقہا نے اس کا لحاظ رکھا ہے، مولانا محمد تقی امینی نے جو فقہ و اجتہاد کے مختلف پہلوؤں پر مفید کتابیں اور محققانہ مضامین لکھ چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں اس مسئلہ پر مفصل اور مبسوط بحث کی ہے، یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قرآن مجید سے، دوسرے میں حدیث نبوی سے اور تیسرے میں صحابۂ کرام (شیخینؓ) کے تعامل سے احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کے دلائل فراہم کیے ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کی وسعت نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے تھے، جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حل کیا، مولانا شبلی نے الفاروق میں اسکو تفصیل سے لکھا ہے، اس کتاب میں بھی ان کو پیش کیا گیا ہے، لیکن شریعت کے منصوص اور قطعی الثبوت احکام میں کوئی تبدیلی نہیں کیجا سکتی، اور نہ حالات و زمانہ کی رعایت سے احکام کا موقع و محل متعین کرنے کی اجازت و ضرورت بالکل عام اور مطلق ہے، جس کی وضاحت مولانا امینی اپنی دوسری کتاب "مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر" میں کر چکے ہیں،

اس کتاب میں بھی اس کا ذکر آجانا چاہیے تھا، ورنہ اس کے بعض مباحث سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ فقہاء کے مسالک کے سلسلہ میں ان کے مذاہب کی مشہور اور معتبر کتابوں کا حوالہ دینے کی ضرورت تھی، مگر صفحہ ۷۶ پر امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب ایک خاص مسئلہ میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، اس قسم کی بعض معمولی باتوں سے قطع نظر فاضل مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی عالمانہ، مدلل اور لائق مطالعہ ہے۔

تذکرہ نکات الشعراء - مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت مصر، پتہ: ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹

اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں نکات الشعراء کو اس کی قدامت اور میر جیسے عظیم شاعر کی نسبت کی وجہ سے بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی، انجمن ترقی اردو ہند نے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے مقدمہ اور دوبارہ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ اس کو ...... شائع کیا تھا، مگر اب یہ دونوں اڈیشن کمیاب ہیں، اس لیے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لائق صدر ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کو مزید اہتمام سے شائع کیا ہے، انھوں نے اسکی تصحیح و ترتیب میں مطبوعہ اڈیشنوں کے علاوہ پیرس کے ایک مخطوطہ اور بعض دوسرے مخطوطات سے بھی مدد لی ہے، اور نسخوں کے فرق و اختلاف کو ظاہر کرنے کے لیے متن میں علامتیں اور حاشیے میں وضاحتیں کر دی ہیں، اس طرح یہ اڈیشن نسبتہً زیادہ جامع ہوگیا ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس کے شروع میں تذکرہ کے سبب تصنیف، اہمیت وخصوصیت اور قریب قریب اسی زمانے میں لکھے جانے والے

ایک دوسرے تذکرہ ریختہ گویاں سے اس کا ایک گونہ تقابل اور آخر میں دونوں مطبوعہ اڈیشنوں اور قلمی مخطوطات کی نوعیت و کیفیت اور زیر نظر نسخہ کی ترتیب وغیرہ کے متعلق معلومات تحریر کیے ہیں، اس مفید ادبی و تحقیقی خدمت کے لیے لائق مرتب اردو شعر و ادب کے شائقین کے شکریے کے مستحق ہیں،

اردو کے اہم رسالے اور اخبار ۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، تقطیع خورد کاغذ اچھا، کتابت وطباعت غنیمت، صفحات ۱۹۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت عنہ پتہ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز، ۶۰۶، کلاں محل، دہلی ۶

جناب عابد رضا بیدار نے اردو کے اہم ادبی اخبارات و رسائل کے اشاریے تین جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے حسب ذیل مجلات و رسائل کی پرانی فائلوں کا محنت اور دیدہ ریزی سے جائزہ لے کر ان کے اشاریے مرتب کیے گئے ہیں

(۱) اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ (سرسید کا گزٹ)، (۲) اودھ پنچ (منشی سجاد حسین)، (۳) علی گڑھ میگزین (ایم، اے، او کالج اور مسلم یونیورسٹی) (۴) افسر (مولوی عبدالحق) (۵) دکن ریویو (ظفر علی خاں) (۶) تعلیم و تربیت (سید عابد حسین) (۷) مصنف (الطاف علی بریلوی) (۸) معارف (وحید الدین سلیم) (۹) معلومات (سید علی بلالی) (۱۰) سہیل (رشید احمد صدیقی)

لائق مرتب نے ان رسالوں کے صرف قابل ذکر مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اہم اور قابل توجہ مضامین کا کسی قدر تفصیل سے

ذکر کیا ہے، اور ان رسالوں ہی کی زبانی ان کے خصوصیات و مقاصد بیان کیے ہیں،
بقول مرتب "اردو ادب کے خاصے وقیع اور قابل لحاظ سرمایہ کا ایک بڑا حصہ ابتک
ان بھولے بسرے مجلوں میں دفن ہے ...... اور کیفیت اور مقدار کے اعتبار سے یہ
سرمایہ اردو کے موجودہ کتابی سرمایہ سے کسی طرح کم نہیں"، اس لحاظ سے یہ انڈکس اردو
زبان کے طلبہ اور محققین کے لیے بہت کار آمد ہے، مصنف کی اور کتابوں کی طرح اسکی
قیمت بھی بہت زیادہ ہے،

نظم سائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ ذکی کاکوروی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
وطباعت غنیمت، صفحات ۲۳۲ مجلد قیمت لعہ پتہ مرکز ادب اردو، ۱۳۷، شاہگنج لکھنؤ

جناب ذکی کاکوروی نے غزل سائیکلوپیڈیا کے بعد نظم سائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے
اس میں قدیم عہد سے لیکر موجودہ عہد تک کے اردو کے نظم گو شعراء کے کلام کا انتخاب
کیا گیا ہے، عموماً شعرائے متقدمین و متوسطین کی توجہ نظم کے بجائے دوسرے اصناف
سخن خصوصاً غزل کیجانب زیادہ تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے کلام کا
کوئی بیانیہ حصہ اس میں شامل کر دیا گیا ہے، لیکن اصلاً اس میں جدید ادب کے
معماروں حالی و آزاد اور ان کے بعد کے نظم گو اور موجودہ دور کے ترقی پسند شاعروں
کے کلام کی زیادہ نمائندگی ہے، مرتب نے بعض نظم گو شعراء، مثلاً ڈپٹی نذیر احمد
وغیرہ کو نظر انداز کر دیا ہے، مگر معروف اور اہم شعراء میں قریب قریب سب کا کلام
آگیا ہے، انتخاب کے معاملہ میں لوگوں کا ذوق مختلف ہوتا ہے، مگر مرتب صاحب ذوق
شاعر ہیں، اس انتخاب میں بھی انھوں نے حسن مذاق کا ثبوت دیا ہے، دیباچہ میں ابتک کے
منتخب مجموعوں کو ناقابل ذکر، غیر اہم، سطحی اور گمراہ کن کہنے سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت میں

کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔

ارمغان کیرلیا۔ از جناب ایس، ایم سرور صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰ قیمت عہ پیسے، پتہ: ایس، ایم سرور صاحب پوسٹ منڈو پرمبا، ملاپرم، کیرلیا۔

جناب ایس، ایم سرور صاحب کا وطن ملاپرم کیرلیا اور مادری زبان ملایالم ہے، مگر اردو کی کشش نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اپنی موزونی طبع سے اس میں شاعری بھی کرنے لگے، ارمغان کیرلیا ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں ۲۴ نظمیں ہیں، جو قومی و ملی درد اور اسلامی جذبات کی ترجمان ہیں، اس لیے ان کے کلام میں اقبال کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن اردو سرور صاحب کی مادری زبان نہیں ہے، اس لیے زبان و طرز ادا میں کہیں کہیں خامی ہے، جو رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی، مصنف اس لحاظ سے قابل تعریف ہیں کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اردو میں اتنی قدرت حاصل کر لی۔

فضائل علم و مناقب علماء۔ مرتبہ مولانا صدرالدین عامر الانصاری صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت سے ر پتہ: ادارہ باب العلوم، مزمل منزل بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں علم دین کی فضیلت و اہمیت اور علماء کے مناقب بیان کیے گئے ہیں، پہلے علم و علماء کی فضیلت و منقبت میں وارد قرآنی آیات مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں، پھر اس سے متعلق حدیثیں درج کرکے ان کا ترجمہ اور آسان زبان میں انکی تشریح کی ہے، علم دین سے بے اعتنائی اور لاپروائی کے زمانہ میں اس کتاب کی اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے۔

'ض'

جلد ۱۱۰ ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اہل اللہ کی زندگی کا کوئی لمحہ عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور ارشاد و ہدایت سے خالی نہیں ہوتا، ان کا ہر عمل عبادت ہوتا ہے، لیکن رمضان المبارک جو نزول برکات کا خاص مہینہ ہے، ان کے لیے موسم بہار ہوتا ہے جس میں عبادت و ریاضت اور ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ پورے جوش سے ابلتا ہے، اسلیے متوسلین اور سالکین طریقت اس مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ استفادہ کے لیے جمع ہوتے ہیں، ماضی قریب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خانقاہیں اس کا نمونہ تھیں جن سے پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی، اب اس زمانہ میں یہ سنت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی ذات سے قائم ہے، رمضان المبارک میں حضرت شیخ پورے مہینہ کا اعتکاف فرماتے ہیں، اور متوسلین و طالبین پورے ہندوستان بلکہ بیرون ہند سے بھی حصول فیض کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور دار جدید کی وسیع مسجد ذکر و فکر اور ارشاد و ہدایت کا مرکز بن جاتی ہے، جس سے مسجد اور صفۂ نبوتی کی تصویر نظر آجاتی ہے۔

راقم کو کئی سال سے اس مبارک موقع پر حاضری کی تمنا تھی، جو الحمد للہ گذشتہ رمضان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں پوری ہوئی، ۱۶ ر رمضان کو حاضری ہوئی تھی اور ۲۰ کو واپسی، اس وقفہ میں آنکھوں نے جو دیکھا اور دل نے جو محسوس کیا، اس کا تعلق صرف مشاہدہ سے ہے قلم اس کے بیان سے قاصر ہے، اس وقت چار سو کے قریب مجمع تھا، اور آخر عشرہ میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، یہ سب مسجد اور اسکے صحن کے شامیانہ میں مقیم اور بہت سے معتکف بھی تھے،

ان کا سارا وقت ذکر و فکر، نوافل و تلاوت قرآن میں گذرتا تھا، دن میں وعظ بھی ہوتا، اور رات کو ذکر و فکر کی مجلس ہوتی تھی اور ترغیب و ترہیب کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں، درود خوانی بھی ہوتی تھی، غرض رات دن کا بڑا حصہ انہی پاکیزہ مشاغل میں گذرتا تھا، اور ہر شخص اپنے ذوق و طلب کے مطابق فیض پاتا تھا، ان سارے مہمانوں کی میزبانی حضرت شیخ کی طرف سے ہوتی ہے، اور افطار، کھانے اور سحری کا اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بہتیرے گھرانوں میں بھی نہیں ہو سکتا، اس دور میں اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناگہانی وفات علمی و ادبی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، مرحوم اس دور کے چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں میں تھے، ترقی پسند ادب کے تو معلم و رہنما تھے، اس دور کے نوجوان ادیبوں کی پوری نسل ان سے متاثر ہوئی، جدید ادب کے ساتھ قدیم ادبیات پر بھی انکی نظر بڑی گہری اور مبصرانہ تھی، اور وہ اس کی اچھی روایات کے بھی قدرشناس تھے، لسانیات سے بھی واقف تھے، انھوں نے سیکڑوں ادبی و تنقیدی مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھیں، اگرچہ وہ ترقی پسندوں کے امام تھے لیکن ان کے خیالات میں بڑا اعتدال و توازن اور زبان و قلم دونوں میں بڑی شائستگی تھی، اسلیے جدید کے ساتھ قدیم طبقہ میں بھی ان کی بڑی قدر تھی، وہ ابتدا میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۵-۱۶ سال اس عہدہ پر رہے، پھر الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے تھے، اردو کی تمام اہم مجالس کے ممتاز رکن تھے، کوئی اہم ادبی اجتماع ان کے بغیر کامیاب نہ سمجھا جاتا تھا، انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اردو کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور ہر محاذ پر اردو کے مخالفین کا مقابلہ کیا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ طبعاً بڑے متین، سنجیدہ، شریف اور وضعدار تھے، ان کے علم سے زیادہ ان کے اخلاق و شرافت کا اثر پڑتا تھا، دارالمصنفین سے ان کو دوہرا تعلق تھا، ایک علمی وادبی، دوسرا وطنی، ماہل ضلع اعظم گڑھ ان کا وطن تھا، ہائی اسکول تک ان کی تعلیم بھی اعظم گڑھ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ سے ان کو دارالمصنفین سے تعلق تھا، جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہا، جب تک وہ لکھنؤ میں رہے، اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، الہ آباد جانے کے بعد کبھی ہندستانی اکیڈمی کے جلسہ میں اور کبھی اردو کی دوسری مجالس میں ملاقات ہو جاتی تھی، جب ملاقات ہوتی تو اپنی طالب علمی کے زمانہ کے دارالمصنفین کے تمام لوگوں کو فرداً فرداً پوچھتے، اپنے اعظم گڑھ کے شاگردوں کو دارالمصنفین سے استفادہ کی برابر تاکید کرتے رہتے، اور ہر مرتبہ آنے کا وعدہ کرتے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آئی، ان کی موت سے اردو کا بہت بڑا ستون گر گیا اور تہذیب و شرافت کا ایک نمونہ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

جامعہ ملیہ دہلی کی زیر تعمیر مسجد کا ذکر ایک مرتبہ آچکا ہے، اصل عمارت قریب قریب مکمل ہو گئی ہے، لیکن ابھی فرش اور پلاسٹر وغیرہ باقی ہے، اس وقت تک چار پانچ لاکھ روپیے صرف ہو چکے ہیں، ابھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی اور ضرورت ہے، یہ مسجد اپنی وسعت، خوبصورتی اور طرز تعمیر کے لحاظ سے دارالسلطنت دہلی کے شایان شان اور جامعہ ملیہ میں اسلام کی سب سے بڑی نشانی ہے، اس لیے اس کی تعمیر میں امداد دینا مذہبی فریضہ ہے، ہم کو امید ہے کہ صاحب ثروت مسلمان اس کار خیر میں پوری مدد دیں گے، ہمارے دوست سعید انصاری صاحب نے جن مخالف حالات میں اس کام کو انجام دیا ہے وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

مقالات

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دلی مرحوم کی سرزمین نے ہر صنف میں جیسے جیسے اصحاب کمال پیدا کیے اسکی مثال ملک کے کسی دوسرے حصہ میں نہیں مل سکتی اور یہ عجیب واقعہ ہے کہ حکومت کے زوال اور دلی کی تباہی کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا، جب پورے ملک میں انقلاب برپا تھا تیموری حکومت دم توڑ رہی تھی، دلی پر آئے دن مصائب کا نزول ہوتا رہتا تھا، اسکی علمی بزم اسی طرح قائم تھی، سیاسی مطلع پر تاریکی چھائی ہوئی تھی، مگر دلی کا آسمان علم وادب کے ستاروں سے جگمگا رہا تھا، اور اس کی خزاں بھی ہم رنگِ بہار تھی،

اس مختصر مضمون میں ان اصحاب کمال کے نام گنانے کی بھی گنجایش نہیں ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، صرف ایک صنف شعر وادب کے اساطین اشرف علی فغاں، مرزا سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر اثر اور مصحفی وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں، فارسی شعراء میں میر عبد الجلیل بلگرامی، قزلباش خاں امید، شیخ سعد اللہ گلشن، سراج الدین خاں آرزو، انند رام مخلص اسی دور کی یادگار ہیں، اور یہ سلسلہ بہادر شاہ ظفر تک برابر قائم رہا، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، مرزا غالب، مومن اور ذوق کے نام اس کے لیے کافی ہیں،

مرزا مظہر جانجاناں بھی اس عہد کے باکمال بزرگ ہیں، ان کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے نہایت ممتاز تھی، وہ ایک طرف صاحب دل صوفی اور طریقۂ نقشبندیہ کے نامور شیخ تھے، دوسری طرف فارسی اور اردو کے نازک خیال شاعر اور شعر و ادب کے دیدہ ور نقاد تھے، تمام تذکرہ نویس ان کی سخنوری اور سخن سنجی پر متفق ہیں، اردو زبان اور شاعری کی اصلاح میں ان کا نمایاں حصہ ہے، انھوں نے ایہام گوئی کا پرانا طرز چھوڑ کر اردو شاعری کو سیدھے راستہ پر لگایا، قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں:-

اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک کردہ ریختہ در زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد کرفی الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ

مصحفی لکھتے ہیں :-

فی الحقیقہ نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا ست و پس بدیگراں رسیدہ

مولانا محمد حسین آزاد کو بھی جنھوں نے بادل ناخواستہ آبحیات میں مرزا صاحب کو جگہ دی ہے، یہ اعتراف کرنا پڑا

لطافت مزاج و نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گذرے ہیں انھیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا، اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا،

فارسی شاعری میں بھی اُن کا پایہ بہت اونچا تھا، جو نفاست و لطافت ان کے مزاج میں تھی، وہی لطافت و پاکیزگی ان کے کلام میں بھی ہے، وہ ہندوستان کے اُن فارسی شعراء میں ہیں، جنکا کلام اہل زبان کے کلام کا ہم پایہ ہے، میر تقی میر جیسا سخت گیر نقاد انکو سلیم و کلیم کا ہم پایہ سمجھتا تھا، نکات الشعراء میں لکھتے ہیں:

دیوان مختصر شعر فارسی او (میرزا) بہ نظر فقیر مولف آمدہ است از سلیم و کلیم پایۂ کمی ندارد

اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ است لیکن گاہے متوجہ این فن بے حاصل میشود۔"

میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں :

مرزا جامع فقر و فضیلت و سخن گستری است و باقتضائے اسم خود روح الروح معنی پروری نو عروس مقال را مشاطگی، ذہنش طرز تازہ و قصد بر خیال رابتر وستی فکرش حسن بے اندازہ شعلۂ وادیش آتش زن خرمنہا و شوخی اندازش شور افگن انجمنہا

فارسی شاعری ایک زمانہ تک گل و بلبل اور ہجر و وصال کا افسانہ رہی، اس میں تصوف نے جان پیدا کی، مولانا شبلی لکھتے ہیں :

فارسی شاعری اس وقت تک قالب بیجان رہی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہ ہوا، شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے، تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا، قصیدہ مداحی و خوشامد کا نام تھا، مثنوی واقعہ نگاری تھی، غزل زبانی باتیں تھیں، تصوف کا اصل مایۂ خمیر عشق حقیقی ہے، جو سرتاپا جذبہ و جوش ہے، عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام سینہ و دل گرما دیے۔"

سلطان ابو سعید ابو الخیر، حکیم سنائی، خواجہ فرید الدین عطار، عراقی، مغربی، جامی اور خسرو وغیرہ کے کلام میں اسی شراب کی مستی اور اسی طور کی تجلیاں ہیں ،

مرزا مظہر جانجاناں تنہا شاعر نہیں بلکہ صاحب دل شیخ بھی تھے، اس لیے ان کے کلام میں بھی اس کے شرارے نظر آتے ہیں، ہمارا اصل مقصد انکے فارسی شعرا کے انتخاب خریطۂ جواہر پر تبصرہ کرنا ہے، مگر اس سے پہلے ان کے کلام پر مختصر تبصرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب خریطۂ جواہر میں بھی دیا ہے، اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر انکو

بھی بھیجا تھا، جسے انھوں نے سرو آزاد میں نقل کیا ہے، ان ہی دونوں سے اس کے کچھ نمونے نقل کیے جاتے ہیں، جس سے انکے مرتبۂ شاعری کا اندازہ ہوگا،

مرزا کی نفاست طبع اور نزاکت مزاج دیوانگی کے عالم میں بھی قائم رہتی ہے چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ دیوانگی میں ان کو پتھر مارنے کے بجائے شیشہ کے صاف و شفاف ٹکڑوں سے مارا جائے،

بجائے سنگ طفلان پارہائے شیشہ باید زد   چو مظہر مرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

معشوق کی شوخی کے وفور کو اس شوخ انداز میں بیان کرتے ہیں،

زصد جا چاک سازد جامہ را اندامش از شوخی   چوں آں صہبائے پرزورے کہ در مینانمی گنجد

اسکی شوخی و شرارت سے اس کا بدن اس کے لباس کو تار تار کر دیتا ہے، جس طرح تیز و تند شراب مینا میں نہیں سماتی۔ اس پر اردو کا ایک شعر یاد آگیا،

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی   تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

جاں دادہ اند بسکہ غریباں دریں دیار   یک سنگ راہ نیست کہ لوح مزار نیست

یعنی دیار محبت میں اتنے لوگوں نے جانیں دی ہیں کہ اس راہ کا ہر پتھر لوح مزار بنگیا ہے،

ہزار عمر فدائے دمے کہ من از شوق   بخاک و خون طپم و گوئی از برائے من است

اس لمحہ پر ہزاروں عمریں نثار ہیں کہ میں شوق میں خاک و خون میں تڑپ رہا ہوں اور تو کہے کہ یہ میرے لیے ہے،

حیف دردے کہ بخود ننگ مداوا برداشت   ہر جانے نتواں از مسیحا برداشت

وہ درد قابل افسوس ہے جو اپنے لیے مداوا کا ننگ برداشت کرے، ایک جان کیلیے مسیحا کا ناز نہ اٹھانا چاہیے، معشوق کی برہمی کی کتنی پُرلطف تصویر ہے،

پشت پائے بر حنا زد سرمہ را در خاک ریخت　　از پئے آزار من ناحق در آزار خود است

مہندی کو پیروں سے مسل ڈالا اور سرمہ کو خاک میں ملا دیا۔ میرے ستانے کے لیے ناحق خود آزار میں مبتلا ہے۔

سوز دل از ہر بن مویم نمایاں کردہ اند　　ایں جفا جویاں مرا سرو چراغاں کردہ اند

ان جفا جو معشوقوں نے میرے ہر بن موسے ایسا سوز دل نمایاں کر دیا ہے کہ اس کی روشنی نے سرو چراغاں بنا دیا ہے،

جز تو در دیدہ من کس نگذارد قدمے　　شہرہ دارد کہ دریں خانہ پری می باشد

جس گھر میں جن اور پری کا سایہ ہوتا ہے اس میں لوگ جاتے ڈرتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں کہ میری آنکھ میں تیرے سوا کوئی قدم نہیں رکھتا، کیونکہ یہ شہرت ہے کہ اس گھر میں پری رہتی ہے" پری" نے اس شعر میں کتنا لطف پیدا کر دیا ہے۔

کتنی عمدہ تشبیہ ہے :-

برنگ غنچہ گر اندک نسیمے باز می گردد　　اگر حرفے بپرسد باز دل دفتر بروں آید

میرا حال غنچہ کے جیسا ہے کہ جو تھوڑی سی نسیم چلنے سے کھل جاتا ہے، اسی طرح اگر محبوب ذرا بھی حال پوچھتا ہے تو دل پورا دفتر کھول دیتا ہے،

ایک دوسری تشبیہ ملاحظہ ہو :

بایں ضعف از اشارتہائے ابروئے تو در شورم　　کہ تا ساز ندہ را ناخن بجنبد تا دمی نالد

جس طرح ساز بجانے والے کے ناخن کی ذرا سی چھیڑ سے ستار کا تار بجنے لگتا ہے اسی طرح ضعف و ناتوانی کے باوجود تیرے ابرو کے اشارے سے دل میں شورش پیدا ہو جاتی ہے۔

شب ندانم کہ بفرقم سر پائے زدہ است کز گلِ زخم سرم بوئے حنا می آید

معلوم نہیں رات میرے سر پر کس نے پاؤں رکھا ہو کہ میرے سر کے زخم سے حنا کی خوشبو آتی ہے، یہ اشارہ محبوب کی طرف ہے،

نیست خاکِ بیکساں منت کشِ شمع و چراغ خار بر گور غریباں گل فشانی می کند

بے کسوں کی خاکِ مزار شمع اور چراغ کی احسانمند نہیں ہے. گور غریباں پر گلفشانی کیلیے خار کافی ہیں،

کتنا پاکیزہ شعر ہے

چشم ہر گاہ کہ بر روئے تو وا می گردد دست فریاد مرا دستِ دعا می گردد

جب میں فریاد کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور تیرے چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو فریاد کا ہاتھ دستِ دعا بنجاتا ہے اور فریاد کے بجائے دعا نکلنے لگتی ہے،

کجا صفہائے مژگاں را درونِ دیدہ جا باشد تہی از بوریا ہم خانۂ اہلِ صفا باشد

صف مژگاں کو آنکھ کے اندر کہاں جگہ مل سکتی ہے. کیونکہ اہل صفا کا گھر بوریے سے بھی خالی ہوتا ہے،

وسعت مشرب چہ دنیائے فراخ بودہ است چوں فلک در گردشِ ساغر جہانے یافتم

وسیع المشربی کی دنیا بھی کتنی وسیع ہے جس طرح فلک ایک گردش میں پورا جہان طے کرلیتا ہے، اسی طرح ساغر کی ایک گردش میں ایک جہان مجھے مل گیا یا نظر سے گذر گیا،

حرفے نہ گفت نامہ برم از زبان یار شرمت نیامد از دلِ امیدوارِ من

یعنی اگر محبوب نے میرے نامۂ شوق کا جواب نہیں دیا تھا تو نامہ بر کو بھی میرے امیدوار دل سے شرم نہ آئی کہ وہی دل کی تسلی کے لیے محبوب کی زبان سے اپنی طرف سے کچھ کہہ دیتا،

یاد آں ذوق کہ مظہر بدم تیغ کشی سینہ می سود و تسکین جگر می کردے

وہ ذوق وشوق بھی کیسا تھا کہ محبوب کی تیغ کشی کے وقت مظہر دل وجگر کی تسکین کیلئے سینہ کو تلوار سے رگڑتا تھا،

ان اشعار سے مرزا صاحب کے اعلیٰ ذوق اور ان کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ ہوگا، وہ جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجہ کے سخن سنج بھی تھے، اس پر ان کا انتخاب خریطۂ جواہر شاہد ہے، اس میں انھوں نے فارسی شاعری کے پورے دفتر کا عطر کھینچ دیا ہے، خریطۂ جواہر اُن کتابوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح ذوق پیدا کیا ہے، اب فارسی شعروادب کا ذوق ختم ہو رہا ہے، بہتیرے تو خریطۂ جواہر کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے، اس لیے عرصہ سے اس پر تبصرہ کا خیال تھا، جو اب جاکر پورا ہوا، اس میں کئی سو شاعروں کا انتخاب ہے، جو بڑی تقطیع کے اسّی صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، ان سب پر تبصرہ کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، اس لیے اس انتخاب میں راقم کو جو شعر زیادہ پسند آئے گا، ان کو مع ترجمہ پیش کیا جائے گا، اس طرح یہ گویا مرزا صاحب کے انتخاب کا انتخاب ہے،

فارسی کیا کسی شایستہ زبان کی شاعری کا ایسا ترجمہ ناممکن ہے جس میں اصل کی ساری خوبیاں قائم رہیں، ترجمہ میں مفہوم تو ایک حد تک ادا ہو جاتا ہے لیکن اصل زبان کے الفاظ اور ترکیبوں کی خوبی و لطافت سے جو حسن پیدا ہوتا ہے، اس کو ترجمہ میں منتقل نہیں کیا جاسکتا، فارسی جیسی نازک اور لطیف زبان کی خوبیوں، پھر ایرانی شعراء کی نازک خیالی کو ترجمہ میں قائم رکھنا تو اور بھی دشوار ہے، ترجمہ سے صرف شعر کے مفہوم کی طرف رہبری ہوتی ہے، پورا لطف و لذت اصل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اس ترجمہ کی حیثیت بھی یہی ہے،

انوری بخاری: شاید کہ بہ بینم سر خود در قدم او خواہم کہ شوم کشتۂ تیغ ستم او

مجھے اس کی تیغ ستم سے اس لیے قتل ہونے کی تمنا ہے کہ شاید اس طرح میرا سر کٹ کر اُسکے قدموں پہ آ جائے۔

اہلی خراسانی: تابوت من آہستہ زکویش گذرانید چوں نیست امیدم کہ بیایم دگر آنجا

مرا تابوت اس کے کوچہ سے آہستہ آہستہ لے چلنا، کیونکہ دوبارہ یہاں آنے کی امید نہیں۔

بگلگشت چمن سروے ندادانہ قامتش یادم کہ ہمچوں سایہ بیخود گشتہ در پایش نیفتادم

چمن کی سیر میں جب کسی سرو نے اس سرو قد کی یاد دلائی تو میں بیخود ہو کر سایہ کی طرح اس کے قدموں پہ گر پڑا۔

اہلی شیرازی: خواہد بخشم و ناز شود کم محبتم غافل کہ ایں کرشمہ محبت فزوں کند

محبوب اس لیے غصہ و ناز کرتا ہے کہ اس سے میری محبت کم ہو جائیگی، مگر وہ شاید اس سے ناواقف ہے کہ یہ کرشمہ محبت اور بڑھا دیتا ہے۔

شرمندہ ز آسمان و زمینم کہ بہر تو تا کے بسجدہ افتم و تا کے دعا کنم

ترے لیے اتنے سجدے کیے ہیں اور اتنی مرتبہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہیں کہ اب آسمان و زمین سے شرم آنے لگی ہے۔

بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی چہ بجا طر گذارم گر تو از یاد روی

تو کس خیال سے میرے دل سے نکل جانا چاہتا ہے، جب تیری یاد ہی نکل جائے گی تو پھر دل میں رہنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔

مولانا آہی: خوش آں مجلس کہ آنجا تو بخود چوں کنم ظاہر مرا ساقی گریباں گیرد و مے در گلو ریزد

وہ مجلس بھی کیا خوب ہے کہ جب میں وہاں تو بہ ظاہر کروں تو ساقی میرا گریبان پکڑ کر مرے منہ میں شراب انڈیل دے۔

میرابوالحسن ذہانی: نگویم حال دل از حال من کو بیخبر باشد   بہ بیدرداں بیان درد دل درد دگر باشد

جو شخص میری حالت سے بیخبر ہوتا ہے اس سے میں اپنا حال دل نہیں بیان کرتا، ایسے بیدرد دل سے درد دل بیان کرنا ایک دوسرا درد سر ہے،

شیخ ابوالقاسم: بر لوح دل چو تختۂ تعلیم کودکاں   ہر حرف آرزو کہ نوشتم خراب شد

دل کی لوح پر بچوں کی تعلیم کی تختی کی طرح جو حرف آرزو لکھا وہ خراب گیا، بچوں کی اکثر تحریریں خراب ہو جاتی ہیں، یعنی کوئی آرزو برنہ آئی،

ز معجزہائے عشقت اینکہ شبہا در سر کویش   نگاہ بام و در را لذت دیداری باشد

ترے عشق کا یہ معجزہ ہے کہ راتوں کو اس کے کوچہ کے درو بام میں لذت دیدار پیدا ہو جاتی ہے یا اس کے بام و در کو دیکھنے میں بھی لذت ملتی ہے۔

خواجہ آصفی :۔ تو ہم در آئینہ حیران حسن خویشتنی   زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار است

تو آئینہ دیکھکر اپنے حسن پر آپ حیران ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، زمانہ میں ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہے

طالب آملی: بسوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم   کہ من بسیار محجوبم ہم آغوشی نمیدانم

ایک ناتجربہ کار عاشق التجا کرتا ہے کہ تو پیار سے بے حجابانہ میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لے میں بہت شرمندہ ہوں کہ ہم آغوشی کا طریقہ نہیں جانتا،

اس پر مولانا شبلی کا مشہور شوخ شعر یاد آگیا

من فدائے بت شوخے کہ بہنگام وصال   بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

میں اس شوخ بت پر فدا ہوں کہ جس نے وصال کے وقت مجھکو خود ہم آغوشی کا طریقہ سکھایا

زانگشتم شمیم غنچۂ فردوس می آید   نمیدانم سحر بند گریبان کہ واکردم

معلوم نہیں صبح کو میں نے کس کا بند گریباں کھولا تھا کہ میری انگلیوں سے غنچۂ فردوس کی خوشبو آتی ہے۔

چو در خوابم در آئی بخت بد از بہر محرومی مرا بیدار می سازد کہ یار آمد چہ خوابست ایں

جب تو کبھی خواب میں نظر آتا ہے تو بخت بد اس کے لطف و لذت سے محروم کرنے کے لیے یہ کہہ کر بیدار کر دیتا ہے کہ محبوب آگیا ہے، یہ کون سونے کا وقت ہے یعنی بدبختی سے ایسے وقت میں آنکھ کھل جاتی ہے۔

بدشنام دگر امید وارم چہ خواہی عذر دشنام گذشتہ

تو گذشتہ دشنام کی معذرت کیوں کر رہا ہے، میں تو دوسری دشنام کا امیدوار ہوں۔

اے جنس وفا چوں تو متاع بجہان ست عیب تو ہمین است کہ در کشور مائی

وفا سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تیری جیسی بے بہا متاع دنیا میں نہیں ہے، اس کے باوجود تیری ناقدری کی وجہ یا تیرا عیب صرف یہ ہے کہ مجھ میں ہے، اس لیے کوئی قدر نہیں۔

انیس شاملو :۔ قاصد ادائے نامہ تواند نہ عرض شوق حیف از زباں کہ بال کبوتر نمی شود

قاصد میں نہ تو نامہ پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ عرض شوق کی، وہ زبان بھی کیا زبان ہے جو کبوتر کے پر کا کام بھی نہیں دے سکتی (کہ وہ نامۂ شوق تو پہنچا دیتا ہے)

مرزا انظام :۔ لذت از تیغ او دارم کہ چاک سینہ ام چوں خمار آلودہ نتواند لب از خمیازہ بست

اس کی تلوار کے زخم میں اتنی لذت ہے کہ جس طرح خمار آلودہ جمائی سے منہ بند نہیں کر سکتا اسی طرح میرے سینے کے زخم کا منہ بند نہیں ہوتا، ذوق لذت میں ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

حکیم الٰہی شیخ الزماں :۔ راز نہان محمل ادمی تواں شنید افغان کہ با زبان جرس آشنا نیم

اس کو محمل کے راز نہاں کو سنا جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ میں خود زبان جرس سے واقف ہوں۔

اس شعر پر فارسی کا یہ مشہور شعر یاد آ گیا۔

کس نداند کہ منزل گہِ مقصود کجاست   ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

کسی کو بھی اصل منزل مقصود کی خبر نہیں، بس اتنا ہے کہ جرس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

امیناؔئی نجفی :۔ فرصتم کے شد کہ آرم دامن وصلش بکف   از گریباں دست اگر برداشتم بر سر زدم

مجھکو اس کا دامنِ وصل پکڑنے کی فرصت کہاں ملی جب گریبان ہاتھ سے چھوڑتا تھا تو سر پیٹتا تھا۔

مرزا مخدوم اشرف :۔ خدارا یک زماں بردار از رخ پردۂ لیلیٰ   کہ ناصح یر ملامت می کند مجنون شیدا را

لیلیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ناصح مجھ مجنون کو ملامت کرتا رہتا ہے، ذرا اپنے رخ سے پردہ ہٹا دے کہ اس کو بھی تیرے حسن کا اندازہ ہو جائے۔

اردو کا مشہور شعر ہے۔

دکھاؤں گا تجھے ناصح اس آفتِ جاں کو   خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

اوجی نظری :۔ گر بیخود آمدیم بکوئے تو دور نیست   فرصت نیافتیم کہ خود را خبر کنم

اگر میں تیری گلی میں بیخود آیا تو تعجب کی بات نہیں ہے، مجھکو اس کی فرصت ہی نہیں کہ اپنے کو ہشیار کر سکوں۔

مرزا ابوالحسن شیرازی :۔ خوش آنکہ در قدمت رو دہد شہادت من   نشان پائے تو گردد نشانِ تربت من

کیا اچھا ہوتا کہ تیرے قدموں میں میری شہادت ہوتی اور تیرے قدم کا نشان میری تربت کا نشان بنتا۔

مرزا قزوینی :۔ بتمکینے غمش در دل نشستہ   کہ گر وصل آید از بر نہ خیزد

اس کا غم دل میں ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ اگر وصل بھی آ جائے تو اپنی جگہ سے نہیں اٹھے یعنی وصل بھی غم محبت کو دور نہیں کر سکتا۔

مرزا اسیر رازی:۔ قاصد رقیب بود و من غافل از فریب — بیدردی مدعائے خود اندرمیانہ ساخت

قاصد در اصل رقیب اور میں اس کے فریب سے غافل تھا، اس لیے اس نے میرے اور محبوب کے نامۂ وپیام میں اپنا مقصد شامل کر دیا یا اپنا کام بنالیا،

عنایت خاں آشنا:۔ یکبار آستان تو بوسہ دادہ ایم — با ما ہنوز دشمنی آسماں بجا است

اس جرم میں کہ میں نے ایک مرتبہ تیرے آستانہ کو بوسہ دیا تھا، میرے ساتھ اب تک آسمان کی دشمنی قائم ہے،

شفیعائی اثر: اکنوں کہ گفتہ منظرے ہست بامنش — اے روزگار فرصتے اے مرگ مہلتے

اب جبکہ تو نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ مجھ پر نظر توجہ ہے تو اے زمانہ اور اے موت اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تھوڑی سی مہلت دیدے۔

شیخ آذری: زہول روز حساب آذری چہ می ترسی — تو کیستی کہ در آں روز در حساب آئی

آذری تو روز حساب کے ہول سے کیوں خوف زدہ ہے، تیری کیا حقیقت ہے کہ اس دن تیرا بھی حساب کیا جائیگا اور تو بھی کسی شمار میں آئے گا،

ابوالفرج رونی: درست گشت کہ جان منی بایں معنی — کہ تا ز من بہ گسستی بمن نہ پیوستی

اس معنی میں تجھکو میری جان کہنا صحیح ہے کہ جس طرح جان چلی جانے کے بعد پھر نہیں لوٹتی، اسی طرح تو جب سے مجھ سے الگ ہوا ہے پھر نہیں ملا۔

میر عقیلی بزمی: رحم است برآں بلبل شوریدہ کہ گل را — بیند کہ بچینند و بہ بازار فروشند

اس شوریدہ بلبل کی حالت قابل رحم ہے جو یہ دیکھتی ہے کہ (اس کے محبوب) پھول کو توڑکر بازار میں بیچتے ہیں۔

عبدالسلام بیانی: بیم از وفا داریدہ وعدۂ کرمن — از ذوق ایں نوید بفردا نمی رسم

ایفائے وعدہ کا خوف نہ کر وعدہ کرلے، اس لیے کہ اس خوشخبری کو سنکر میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا کہ تجھ کو وعدہ وفا کرنے کی زحمت اٹھانا پڑے۔

ملا باقر کاشانی: مدعی گر بروپیش محتسب مستم چہ باک   آہ اگر ہشیار پیش میفروش آرد مرا

اگر حریف مجھکو مستی کی حالت میں محتسب کے پاس لیجاتا ہے تو کچھ پروا نہیں، البتہ اگر ہشیاری کی حالت میں مے فروش کے پاس لیجاتا تو باعثِ شرم ہوتا۔

یارب آں سوز فگن در دلِ دیوانۂ ما   کہ کلیم آید و آتش برد از سینۂ ما

خدایا میرے دل میں وہ سوز پیدا کردے کہ موسیٰ کلیم اللہ (جو آگ کی تلاش میں طور کی طرف گئے تھے) آکر میرے سینہ سے آگ لیجائیں۔

باقر گمانِ مہر و وفا داشتی بیار   ایں جور ہا سزائے دلِ بدگمان تست

باقر تجھکو محبوب سے مہر و وفا کی امید تھی، اس کا ظلم و جور دل کی اسی بدگمانی کی سزا ہے،

زاں سو نہ رنجشے نہ ازیں سو شکایتے   خوں باد دل کہ صد سخن اندر میانہ ساخت

کسی سے کوئی رنجش اور شکوہ و شکایت نہیں۔ خدا دل کو غارت کرے۔ اسی نے ساری باتیں پیدا کیں

دانم کہ سرا پائے وجودم ہمہ درد است   داغ تو ندانم کہ کجا ہست کجا نیست

میرا پورا وجود سراپا درد بن گیا ہے، مجھے اس کا بھی پتہ نہیں کہ تیرا داغ کہاں ہے کہاں نہیں ہے

از بسکہ بہر دام فتادیم و رمیدیم   در دست کسے نیست کہ مشت پر ما نیست

میں ہر دام میں پھنسکر بچ نکلا اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اسکے ہاتھ میں میرے کچھ پر نہ ہوں،

ہنوز آں سنگدل از ناز با من سرگراں دارد   مرا کشتست و منت بر زمین و آسمان دارد

ابتک وہ سنگدل از راہ ناز مجھ سے سرگراں ہے مجھے قتل کیا ہے اور اس کا احسان زمین آسمان پر رکھتا ہے

کند شرمندہ ام تا پیش اویک لحظہ بنشینم	پئے تعظیم تا پیدا شوم از دُور برخیزد

اگر میں اس کے پاس ایک لمحہ بیٹھتا ہوں تو مجھے شرمندہ کرنے کے لیے مجھ کو دور سے دیکھ کر میری تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔

فارغ ز شہیدان وفا باش کہ ایشاں	آں دست ندارند کہ دامان تو گیرند

شہیدان وفا کی طرف سے بالکل بے فکر رہ، ان میں اس کی طاقت ہی نہیں کہ (داد خواہی کے لیے) تیرا دامن پکڑ سکیں۔

ما در خور بہ فراغتِ وصل تو نیستم	ما را برائے خاطر ہجراں نگاہ دار

میں تیرے وصل کے لائق نہیں ہوں، اس لیے مجھ کو ہجر کی خاطر محفوظ رکھ یا رکھ چھوڑ،

دلِ کم حوصلہ بر نیم نگہ قادر نیست	چشم دارم کہ سراپائے تو نظارہ کنم

میرے پست ہمت دل کا تو حال یہ ہے کہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے پر بھی قادر نہیں اور میں تیرے سراپا کے نظارہ کی آرزو رکھتا ہوں،

ترا بر جملہ خوباں برگزیدے وائے چوں سازم	ز دستِ من نمی آید کہ چشم خویشتن پوشم

میری آنکھ نے سارے حسینوں میں تجھی کو انتخاب کیا ہے، میں کیا کروں، اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھ نہیں بند کر سکتا، یعنی اگرچہ یہ مصیبت آنکھ کی لائی ہوئی ہے لیکن میں دیدہ و دانستہ اس کو بند بھی نہیں کر سکتا تھا،

شدہ است از ہر دو جانب کشش طلب بہ حدے	کہ تو ہم نمی توانی ز من احتراز کردن
ز منِ شکستہ عجزے ز سر نیاز مندی	تو و سنگ دل نگاہے بہزار ناز کردن

دونوں طرف سے ذوق طلب کی ایسی کشش ہے کہ تو بھی مجھ سے دامن نہیں بچا سکتا، اگرچہ مجھ شکستہ دل کی طرف سے از راہ نیاز مندی عجز و فتادگی ہے تو تجھ جیسے سنگ دل کی طرف سے ہزاروں

ناز و ادا کے ساتھ ایک نگاہ ہے، یعنی تو بھی نگاہ ڈالنے پر مجبور ہے۔

حزنی اصفہانی: مرا بر سادہ لوحی ہائے حزنی خندہ می آید کہ عاشق گشت و چشم مرحمت از یار ہم دارد

مجھے حزنی کی اس سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے کہ محبوب پر عاشق بھی ہے اور اس سے لطف و مرحمت کی امید بھی رکھتا ہے،

در چمن بود زلیخا و بحسرت می گفت یاد زنداں کہ در انجمن آرائے ہست

زلیخا چمن میں رہ کر بھی حسرت سے کہتی تھی کہ وہ زنداں بھی یاد کے قابل ہے جس میں ایک انجمن آرا (حضرت یوسفؑ) مقیم ہے،

حسن بیگ نعیمی: تسلیش نکشد آرزو اگر اینست ہزار سالہ وصال تو انتظار مرا

اگر آرزو کی شدت کا یہی عالم ہے تو ہزار سالہ وصال بھی میرے انتظار کی تسلی نہیں کر سکتا،

گیرم کہ حرف قاصد با من ہمہ فریب است این بس کہ دل زمانے امید وار گردد

میں مانتا ہوں کہ قاصد کی ساری باتیں فریب ہیں مگر اتنا کافی ہے کہ اس سے تھوڑی دیر کے لیے دل کو امید بندھ جاتی ہے،

اگرچہ امشبم از درد ہجراں جاں نمی ماند بایں شادم کہ بار محنت ہجراں نمی ماند

اگرچہ آج کی رات درد ہجراں سے زندہ نہ بچوں گا لیکن اس سے خوش ہوں کہ اسکے بعد ہجر کی مشقت اٹھانے سے نجات مل جائے گی،

صد بارہ از بزم تو گر رنجہ روم باز آیم کشش شوق بلائیست کہ من می دانم

اگر سو بار بھی تیری بزم سے رنجیدہ چلا آتا ہوں تو پھر جاتا ہوں، شوق کی کشش ایسی بلا ہے کہ اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔

مرزا جامی: ز فریب وعدہ امشب نزدیم چشم برہم کہ شب امید واری در خانہ باز باشد

محبوب کے پُر فریب وعدہ سے آج کی رات آنکھ نہیں جھپکائی کیونکہ جس رات کو کسی کے آنے کی امید ہوتی ہے تو گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے،

حضوری قمی: بجرم آنکہ نمودم بذوق روز وصال فراق آنچہ بمن می کند سزائے من است

وصال کے دن جو ذوق و شوق میں نے ظاہر کیا ہے، فراق میرے ساتھ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسی جرم کی سزا ہے،

خیالی گیلانی: تو وفا با دگراں کن کہ من سوختہ دل زندہ از بہر ہمینم کہ جفائے تو کشم

تو شوق سے دوسروں کے ساتھ وفا کر، اس لیے کہ میں سوختہ دل تو صرف تیری جفائیں سہنے کے لیے زندہ ہوں۔

حسن شاملو: امشب بہ ہیچ وجہ دلم وا نمی شود گویا کہ خاطرے کسے از من گرفتہ است

آج کی رات میرا دل کسی عنوان نہیں کھلتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا دل میری طرف سے آزردہ ہے، یہ دل گرفتگی اسی کا نتیجہ ہے۔

بخدا کار چو افتاد خدا ساز شود گرہ قطرہ بدریا چو رسد باز شود

جو کام خدا سے پڑتا ہے اس کو وہ خود بنا دیتا ہے، قطرہ کی گرہ سمندر میں پہنچکر خود بخود کھل جاتی ہے۔

اس شعر پر مثنوی کا یہ مشہور شعر یاد آگیا

کار سازِ ما بفکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

چو آدمی بجہاں نیست دل بمہر کہ بندم کسے ز صفحۂ خالی چہ انتخاب کند

جب دنیا میں آدمی ہی کا وجود نہیں تو دل کا تعلق کس سے قائم کروں، کوئی شخص سادہ صفحہ سے کیا انتخاب کر سکتا ہے۔

شیخ علی حزیں: شادم کہ از رقیباں دامن فشاں گذشتی گو مشتِ خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

میں اس پر خوش ہوں کہ تو رقیبوں سے دامن جھاڑتا گذر گیا خواہ اس میں میری خاک بھی برباد ہوگئی ہو۔

امیر خسرو: ما را وداع کرد دل و دین ہر چہ بود الا سر نیاز کہ بر آستاں بماند

اس سر نیاز کے سوا جو کسی کے آستانہ پر جھکا تھا دین و دل سب نے ساتھ چھوڑ دیا، کوئی بھی کام نہ آیا،

بیم تیغم نیست لیکن ایں سرم بخت را دوست میدارم کہ زیر پائے او بسیار بود

مجھکو اس کی تلوار کا خوف نہیں ہے کہ (سر قلم ہو جائے گا) بلکہ یہ سر اس لیے محبوب ہے کہ اس کے قدم کے نیچے بہت رہ چکا ہے،

بخفت خسروِ مسکیں دریں ہوس شبہا کہ دیدہ بر سر پایت نہد بخواب رود

بیچارہ خسرو اس تمنا میں بہت سی راتوں کو نہیں سویا کہ تیرے قدموں پر آنکھ رکھکر سو جائے جو میسر نہ ہوا۔

خسرو است و شب و افسانۂ یار و ہر بار قدرے می گرید پس بسرِ افسانہ رود

خسرو کا شغل یہ ہے کہ خسرو ہے، رات کا سناٹا ہے اور یار کا افسانہ ہے، وہ تھوڑا سا افسانہ سنا کر روتا ہے اور پھر شروع سے افسانہ شروع کرتا ہے،

کششِ عشق ندارد بگذارت بدیساں بجنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی

عشق کی کشش تجھے اسی طرح آزاد نہ چھوڑے گی، اگر تو جنازہ پر نہیں تو مزار پر آنے کے لیے مجبور ہوگا،

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تونے اپنی قیمت دونوں عالم بتائی ہے، ابھی قیمت اور بڑھا کہ ان داموں میں بہت سستا ہے،

بگفتندش فلاں مرد از غمت گفت نخواہد مرد چون من جانِ اُویم

محبوب سے لوگوں نے کہا کہ فلاں تیرے غم میں مرگیا، اس نے جواب دیا کہ جس کی جان میں ہوں وہ کبھی نہیں مرسکتا،

من اشکِ بیدلاں را خندہ می پنداشتم روزے کنوں بر می دہد تخمے کہ من می کاشتم روزے

میں شکستہ دل عاشقوں کے آنسوؤں کو کبھی ہنسی کھیل سمجھتا تھا، جو بیج میں نے بویا تھا، آج وہ پھل لایا ہے، یعنی میں بھی اسی حال میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

کسے نماند کہ او را بہ تیغ ناز کشی مگر زندہ کنی خلق را و باز کشی

تیری تیغ ناز سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا، اب سوا اس کے کوئی قتل کے لیے نہیں مل سکتا کہ ان مقتولوں کو زندہ کرکے دوبارہ قتل کر دو،

خصالی کاشی: زبیم غمزہ اش دزدیدہ در روے بینم و ترسم چو شخصے کز چمن گل چیند و از باغبان ترسد

میں اس کے غمزہ کے خوف سے اس کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور ڈرتا رہتا ہوں جس طرح کوئی شخص چمن سے پھول توڑتا ہے، مگر باغبان سے ڈرتا رہتا ہے،

میر حیدر خصالی: چو طفلِ مریضم بمہدِ زمانہ بہر عضوے درد و گفتن ندانم

زمانہ کے گہوارہ میں میں اس بیمار بچے کی طرح ہوں جو اپنی بیماری نہیں بتا سکتا، یہی حال میرا ہے کہ ہر عضو میں درد ہے مگر بتانے کی طاقت نہیں،

اس پر اس سے ملتے جلتے ہوئے ہندی اور اردو کے دو شعر یاد آگئے:

من میں راکھوں من جلے کہوں تو مکھ جل جائے گونگے کا سپنا بھیو سمجھ سمجھ پچھتائے

دل میں رکھوں تو دل جلے اور منہ سے کہوں تو منہ جل جائے، میرا بھی حال گونگے کے خواب جیسا ہے کہ زبان سے نہیں بتا سکتا اور سوچ سوچ کر کڑھتا ہے،

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مرزا خلقی: رسید بر سر بالیں بوقتِ نزعم یار چراغ زندگیم شامِ مرگ روشن شد

محبوب میری نزع کے وقت میرے سرہانے آیا، میری زندگی کا چراغ میری موت کی شام کو روشن ہوا،

رکن الدین دعوی: دست من گیر کہ ایں دستہاں است کہ من بار ہا در غمِ ہجراں تو بر سر زدہ ام

اسی شرم میں میرا ہاتھ پکڑ لے کہ یہ وہ ہاتھ ہے جس سے تیرے غم ہجر میں بار ہا سر پیٹا ہے،

مرزا دانش: کاش در تاراجِ گلشن صیدِ گلچیں می شدم پیش ازاں کز آشیاں صیاد بردارد مرا

کاش اس سے پہلے کہ صیاد مجھکو آشیانہ سے نکالے گلشن کی تاراجی کے وقت گلچیں کا شکار ہو گیا ہوتا کہ صیاد کو آشیانہ سے محروم کرنے کی نوبت نہ آتی،

جلوہ گاہ خوش خرامِ ماست خاکِ لالہ زار آں حنائی نقش پائے جا بجا افتادہ است

لالہ زار کی سرزمین ہمارے خوش خرام (معشوق) کی جلوہ گاہ ہے۔ یہ لالہ کی سرخی نہیں ہے بلکہ محبوب کے حنائی قدموں کے نشانات ہیں،

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب بر سرِ من آمد و ایں آفت از مینا گذشت

مستوں کو مبارکباد دو کہ محتسب کا ڈھیلا میرے سر پر پڑا اور مینا کے سر سے یہ آفت ٹل گئی میرا سر ٹوٹ گیا مگر مینا گزند سے محفوظ رہا،

ما بذوقِ گریۂ مستی دریں بزم آمدیم مے بدہ ساقی بقدرِ آنکہ چشمم تر شود

میں گریۂ مستی کے ذوق میں اس بزم میں آیا ہوں اس لیے اتنی شراب تو دے کہ اس سے میری آنکھ تر ہو جائے،

تاک را سیراب سازد ابرِ نیساں در بہار قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

بہار میں ابر نیساں اس لیے انگور کی بیل کو سیراب کرتا ہے کہ جو قطرۂ شراب بن سکتا ہے وہ موتی بنکر کیوں ضائع ہو۔

نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند ز نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

صیاد کے نمک کے حق شناس جب قفس سے رہا ہوئے تو حق نمک ادا کرنے کے لیے دور نہیں چلے گئے بلکہ صیاد کے گھر کے درخت پر آشیانہ بنایا۔

مباش در پئے مرغ شکستہ پر صیاد رسد بپائے گل گر بآشیاں نرسد

صیاد سے التجا کرتا ہے کہ مرغ شکستہ پر کے درپئے آزار نہ ہو، اس میں اڑنے کی طاقت نہیں، اس لیے آشیانہ تک تو نہیں پہنچ سکتا ہے، شاید رینگتے رینگتے کسی پھول تک پہنچ جائے

آشیانِ جغدہم نگذاشت در ویرانہ ام خانۂ صیاد آباداں کہ تقصیرے نکرد

میرے ویرانے میں اُلو کا آشیانہ بھی باقی نہ چھوڑا، خدا صیاد کا گھر آباد رکھے، اس نے اپنی طرف سے اپنے کام یعنی ویران کرنے میں کوئی کمی نہیں کی،

سخت کوشیہائے صیادم بجاں آوردہ است در قفس بلبل بگلگشت گلستاں آورد

میرے صیاد کی سنگ دلی نے جان پر بنادی ہے، ستم یہ ہے کہ وہ قفس میں بلبل کو گلستاں کی سیر کے لیے لاتا ہے، اس طرح اسے اور تڑپاتا ہے،

چساں بینم کہ مے را محتسب بر خاک می ریزد کہ می لرزد دلم برگے کہ از تاک می ریزد

میں محتسب کو شراب زمین پر گراتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں جبکہ میرا دل انگور کی پتی گرتے ہوئے دیکھکر لرز جاتا ہے،

گل دمید از شاخ و بر خاک گلستاں می طپم کو پر و بالے کہ جائے آشیاں پیدا کنم

پھول شاخوں پر کھل گئے اور میں گلستاں کی خاک پر لوٹتا ہوں، اب وہ بال و پر کہاں

کہ آشیانہ بنا سکوں۔

ذوق دل تنگی بجرم در قفس آوردہ است بیخبر پندارد انداز رہائی میکنم

دل تنگی کے ذوق نے مجھکو قفس میں بجز و کر دیا ہے، بیخبر صیاد سمجھتا ہے کہ میں نے رہائی کے لیے یہ شکل اختیار کی ہے،

ملا درکی قمی: کم از یوسف نئی پیش صبا بکشا گریباں را کہ در عہد تو ہم یک چشم نابینا شود روشن

تم یوسف سے کم نہیں ہو باد صبا کے سامنے گریباں تو کھولو (جس کی بو سونگھ کر) تمھارے زمانہ میں بھی ایک نابینا آنکھ روشن ہو جائے (جس طرح حضرت یوسفؑ کی بو سونگھ کر حضرت یعقوبؑ کی آنکھ روشن ہو گئی تھی)

با شمع بگوئید کہ مردیم ز غیرت ما طاقت سرگوشی پروانہ نداریم

شمع سے کہد و کہ میں غیرت سے مرگیا، مجھ میں شمع سے پروانہ کی سرگوشی دیکھنے کی طاقت نہیں،

میر حیدر معمائی رفیعی: نمیدانم چہ سازم آہ باجان غیور خود کہ ہر دیدنش می میرد و سویش نمی بیند

آہ اس غیرت مند جان کے ساتھ کیا کروں جو اس کو دیکھنے کے لیے تو مرتی ہے لیکن اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتی،

عبدالرحیم خانخاناں: بجرم عشق توام می کشند غوغائیست تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ایک شور ہے کہ تیرے جرم عشق کی سزا میں مجھے قتل کر رہے ہیں، تو بھی ذرا بام پر آکر دیکھ لے کہ بہت اچھا تماشا ہے،

اعظم خاں: ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست وگرنہ عاشق خاطر بہیچ خرسند است

محبت کا پورا حق ادا کرنا دوست کی عنایت و مہربانی ہے، ورنہ بیچارہ عاشق تو ادنیٰ برتاؤ سے بھی خوش ہے،

رياضی: ستارہ ایست دُرِ گوش آں ہلال ابرو		زروئے حسن بخورشید می زند پہلو

ہلال جیسے ابرو کے محبوب کے کانوں کا موتی ستارہ کی طرح ہے. مگر اپنے حسن و خوبی میں خورشید کی برابری کرتا ہے یا اس کا پہلو دباتا ہے،

محسن بیگ اشکی: اے کاش بدوزخ بفرستند و نہ پرسند		جرمم کہ ندارم سر سودائے قیامت

اے کاش میرا جرم پوچھے بغیر مجھے دوزخ میں بھیج دیں مجھ میں قیامت کا ہنگامہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے،

بر رہِ تو ہر کہ بینم گُشد ایں غمم کہ مسکیں		چہ فریب خوردہ باشد بچہ دل نہادہ باشد

جب میں تیری گلی میں کسی (نو وارد) کو دیکھتا ہوں تو یہ غم مجھے مارے ڈالتا ہے کہ بیچارہ کیسا فریب خوردہ ہے اور کس سے دل لگایا ہے،

اسی مضمون کا فارسی کا ایک اور شعر ہے۔

اگر بینم کسے از کوئے او دل شاد می آید		فریب کز تو اول خوردہ بودم یاد می آید

جب میں کسی کو اس کے کوچہ سے خوش و مسرور آتا دیکھتا دیکھتا ہوں تو وہ دھوکا جو میں نے پہلی مرتبہ کھایا تھا، یاد آتا ہے،

محمد رشید: شود از دیگراں در خشم و بر من دامن افشاند		غبار ار در دل از ہر کس کہ دارد بر من افشاند

وہ غصہ دوسروں سے ہوتا ہے اور اتارتا مجھ پر ہے، دل میں جس سے بھی غبار رکھتا ہو مگر دامن مجھ پر جھاڑتا ہے،

رضائی کاشی: زجہانیاں ندارم بکسے بجز تو الفت		و گرم تو ہم نخواہی سر بیکسی سلامت

میں دنیا میں تیرے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا، اگر تو بھی اس کا روادار نہیں تو خدا میری بیکسی سلامت رکھے،

کاشی اردکلی: کسے چگونہ رہ دل زغم نگہ دارد		خرابۂ دل عاشق ہزار رہ دارد

دل عاشق کے خرابہ میں ہزاروں راہیں ہیں، اس لیے کوئی شخص غم سے اس راہ کی نگہبانی کیونکر کرسکتا ہے،

نیاز عاشقاں معشوق را در ناز آورد تو سرتاپا وفا بودی ترا من بے وفا کردم

عاشقوں کی نیازمندی معشوقوں میں ناز پیدا کرتی ہے، تو تو سراپا وفا تھا میری نیازمندی نے تجھے بے وفا بنادیا،

قاضی رہی اصفہانی: حسن تا دید ترا دست ز یوسف بر داشت باغباں تربیت گلبن نوخیز کند

حسن نے جب تجھکو دیکھا یوسف سے دست بردار ہوگیا کیونکہ باغبان نوخیز پودے کی پرورش کرتا ہے،

روشنی ہمدانی: با چنیں بختے کہ خود ہم دشمن جان خودم ساده لوحی بیں کہ خواہم دوستدار من شوی

ایسی قسمت کے ساتھ کہ میں خود اپنی جان کا دشمن ہوں، یہ سادہ لوحی بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ چاہتا ہوں کہ تو میرا دوست بنجائے۔

بدگمانی ملاحظہ ہو:

در بزم از اں بہ پہلوئے خود جا دہد مرا تا راست سوئے او نہ توانم نگاہ کرد

بزم میں مجھے اس لیے اپنے پہلو میں بٹھاتا ہے کہ میں اس کی طرف سیدھی نگاہ نہ ڈال سکوں، (کہ پہلو میں رخ پھیرے بغیر نہیں دیکھا جاسکتا)

میر محمد رضا: رمید خاطرم از ہر چہ ہست در عالم بغیر یار کہ او عالم دگر دارد

اس عالم میں جو کچھ بھی ہے سب سے میرا دل بے تعلق ہوگیا، بجز دوست کے کہ اس کا عالم ہی دوسرا ہے،

سلطان بیگ رہی: فضائے کنج قفس دلنشینم افتادہ است وگرنہ در ہمہ جا آب و دانہ بسیار است

کسی جگہ بھی آب ودانہ کی کمی نہیں لیکن کنج قفس کی فضا دل میں ایسی بھا گئی ہے کہ اور کسی طرف

نگاہ نہیں اٹھتی،

گفتم بہ بلبل چکنم در فراقِ یار — از شاخ گل بخاک فتادہ طپید و مرد

میں نے بلبل سے پوچھا کہ فراقِ یار میں کیا کروں، وہ شاخ گل سے زمین پر گری، تڑپی اور مرگئی یعنی فراق کا علاج صرف موت ہے۔

رشید زرگر: مطلبم باز دگر در خاک و خوں غلطیدن است — گر بگیرم روزِ محشر دامنِ قاتل بکف

حشر میں اگر میں قاتل کا دامن پکڑوں تو اس مقصد (داد خواہی نہیں) بلکہ دوبارہ خاک و خون میں لوٹنا ہے۔

محمد رضا: بیابانِ بلا خارے ندارد — کہ از داماں منِ یاری ندارد

بیابان بلا میں کوئی ایسا خار نہیں ہے جو میرے دامن سے دوستی نہ رکھتا ہو، یعنی ہر خار دامن سے الجھتا ہے۔

محمد رضا کشمیری: محبت پس از قطع محبت لذتے دارد — کہ شاخِ نخل پیوندی بہ از اول ثمر گیرد

محبت میں قطع محبت میں بھی ایک لذت ہو کیونکہ جس شاخ میں پیوند لگایا جاتا ہے وہ پہلے سے بہتر پھل دیتی ہے،

مرزا حسن بیگ رفیع: اے جرس این ہمہ فریاد ز دل تنگی چیست — شکر ہا کن کہ دلت جائے تپیدن دارد

جرس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری یہ فریاد دل تنگی کی وجہ سے کیوں ہے، تجھے تو شکر کرنا چاہیے کہ تیرے دل کے لیے تڑپنے کی جگہ ہے، مجھے یہ بھی حاصل نہیں،

تا قیامت دگر آں کشتہ نگیرد آرام — کہ دلش زخم دگر خواہد و قاتل برود

قیامت تک اس مقتول کو آرام نہیں مل سکتا جس کا دل دوسرے زخم کا تمنائی ہو اور قاتل پہلا زخم لگا کر چلا جائے۔

(باقی)

مولانا محمد علی کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

اس ملاقات کے بعد وفد خلافت انگلستان کے وزیر اعظم ڈیوڈ لائڈ جارج سے ملا، اس موقع پر وفد کے ارکان مولانا محمد علیؒ، سید حسین مولانا سید سلیمان ندویؒ اور محمد حیات کے علاوہ رائٹ آنریبل ایچ، اے، ایل فشر اور سر فریڈرک ولیم ڈیوک بھی تھے، موخر الذکر بنگال کے گورنر بھی رہ چکے تھے، اس زمانہ میں ساری دنیا میں لائڈ جارج کا طوطی بول رہا تھا، وہ پہلی جنگ عظیم کے اصلی فاتح سمجھے جاتے تھے، عام طور سے یہ بات مشہور تھی کہ انھوں نے ایک رات اس جنگ کا نقشہ اتنی دماغ سوزی سے تیار کیا تھا کہ صبح کو ان کے سارے سیاہ بال سفید ہو گئے تھے، وہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے جو بات کہہ جاتے، وہ غلط اور جھوٹ بھی ہوتی تو صحیح اور سچی سمجھی جاتی، اس بڑی جنگ کا ایک بڑا مقصد ترکی امپائر کا حصہ بخرا کرنا تھا، کیونکہ اسکی وجہ سے دنیا میں اسلام کی ایک موثر قوت بنی ہوئی تھی، اسی لیے شام، عراق، عرب، یمن، مصر، سلیشیا، ارمینیا اور تھریس وغیرہ کے لیے جمہوریت کے نام پر حقِ آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا تھا، مزہ تو یہ تھا کہ اس جمہوریت اور آزادی کے علمبردار خود ایک ایسے امپائر کے مالک بنے ہوئے تھے جس کے غلاموں کی سرزمین میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی اُن کا غلام بنا ہوا تھا، یہاں ان کے نزدیک حق جمہوریت اور آزادی کا نام زبان پر

لانے والوں کے لیے یا تو جیل خانہ تھا یا فوج اور پولیس کی گولیاں تھیں، اس زمانہ میں ونسٹن چرچل اپنی تقریروں میں کہتے کہ یہ جنگ ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ ہے، لارڈ الن بائی نے ٹرکش امپائر کے حصے بخرے کرنے میں جو حصہ لیا، اس بنا پر انکے متعلق اخباروں میں لکھا جاتا کہ جو کام پوری عیسائی دنیا متحد ہو کر نہ کر سکی تھی، وہ تنہا کر سکے صحافتی جادو بھی پورا کام کر رہا تھا، ترک اپنی مردم شماری کے دستاویزات سے ثابت کرتے کہ تھریس میں ان کی اکثریت ہے۔ وہ ۲۰۰۰۷ فی صدی ہیں یونانی صرف ۲۶۰۰۹ فی صدی ہیں، مگر اخباری پروپگنڈا کے ذریعہ اس حقیقت کو جھٹلا کر رکھدیا گیا، اکثریت اقلیت میں تبدیل کر دی گئی، اسی طرح اخباروں میں آرمینیوں کے قتل عام کی شہرت ایسی دی گئی کہ سارے جھوٹے بیانات سچے معلوم ہونے لگے، تمام اخبارات مل کر مالا جپنے لگے کہ وہاں تیس لاکھ آدمی قتل کر دیے گئے، اس بڑی تعداد کے قتل کے جھوٹے الزامات کو نہ صرف اخباروں بلکہ تصویروں اور سینماؤں کے ذریعہ صحیح قرار دینے کی کوشش کی گئی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنی نجی صحبت میں فرماتے تھے کہ ترکوں کی طرف سے ان الزامات کی تردید ہوتی تو کوئی اخبار شائع نہ کرتا، اخبار ٹائمس لندن صحافتی آزادی کا بڑا حامی تھا، اس میں ترکوں کی حمایت میں کوئی بیان یا تحریر بھیجی جاتی تو یہ کسی حال میں شائع کرنا پسند نہ کرتا، استاذی المحترم فرماتے کہ انگلستان اور یورپ والوں نے پریس اور صحافت کی آزادی کو آسمانی وحی کی طرح مقدس چیز منوا لیا ہے، مگر انھوں نے اس آزادی کی آڑ میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کا ایک ایسا فن ایجاد کیا ہے، کہ دنیا منہ تاکتی رہ جاتی ہے، اور صحافتی جادو سچ کو جھوٹ منوا کر اپنا مطلب پورا کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، ان کا مسلک یہ ہے کہ جھوٹ کو اس وقت تک دہراتے رہنا چاہیئے جب تک کہ یہ سچ نہ سمجھ لیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نازی وزیر گوئبلز اس کا بڑا ماہر

سمجھا جاتا تھا، لیکن موجودہ دور کے اخبارات اب اس سے کہیں زیادہ بازی لے گئے ہیں،

برطانوی حکومت اور پریس دونوں نے طے کرلیا تھا کہ ترکوں کو مجرم قرار دے کر انکو ساری دنیا میں ملعون اور مبغوض کیا جائے، اس لیے اپنے پروپگنڈا کی مشنریوں کو جتنا زیادہ تیز کر سکتے تھے، کرتے رہے، ان ہی حالات میں مولانا محمد علی کا وفد لائڈ جارج سے ملا، دونوں کی تقریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں، مولانا محمد علی نے وہی باتیں کہیں جو رائٹ آنریبل مسٹر فشر کے سامنے کہہ چکے تھے، لیکن ان کی تقریر کا تیور بدلا ہوا تھا، اس زمانہ میں ان کی تقریروں کی دھوم مچی رہتی، ہندوستان کے تمام اخبارات نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے رہتے، انگریزوں کی جابرا ور سامراجی حکومت کے زمانہ میں سب کچھ کہنا آسان نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں مولانا محمد علی نے جس جرأت اور دلیری سے کام لے کر تقریریں کیں، وہ اس جمہوری دور میں بھی شاید ہی کوئی کرسکتا ہے، لائڈ جارج کے سامنے ان کی تقریر کا پورا ترجمہ اس لیے درج کیا جا رہا ہے کہ ان کے جو پرستار اب بھی باقی ہیں، وہ اس سے لطف لیں اور جو ان کے نکتہ چیں رہ گئے ہیں وہ عبرت حاصل کریں کہ جب ایمانی حمیت اور مذہبی غیرت باقی رہتی ہے تو آتش نمرود بھی اس کے لیے گلزار خلیل بنجاتی ہے، مولانا محمد علی کی زندگی اب بھی یہ کہہ رہی ہے

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ اسلام کے سفیر اور ضمیر بنکر شیر کی طرح غراتے رہے، وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے جو اپنی فطرت کی جہانبانی کا دعویٰ تو کرتے رہتے ہیں لیکن کسی جمشید کا ساغر بنے رہتے ہیں کسی جمشید کا ساغر بنکر رہنے میں زبان تو اپنی ہوتی ہے لیکن ضمیر اپنا نہیں ہوتا، گویا وہ اپنی چرب زبانی سے اپنی ضمیر فروشی کو بھی اسلام ہی کا ضمیر قرار دیتے رہتے ہیں، مولانا محمد علی میں عقل کی روباہی کے بجائے عشق ید اللّٰہی رہا، جس سے ان میں ایک ایسی روشن ضمیری پیدا ہوئی جو ان سے کہتی رہی ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا عشق تمام مصطفےٰ ؐ عقل تمام بولہب

قوموں کا لہو پی کر جمہوریت اور آزادی کی تعلیم دینے والے وزیر اعظم لائڈ جارج کے سامنے حیلۂ افرنگی کے جواب میں مولانا محمد علی نے قلندرانہ شان کے ساتھ انداز ملوکانہ میں جو حملۂ ترکانہ یا جو نعرۂ مستانہ بلند کیا وہ ذیل کی تقریر میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے، اس میں لے تو حجازی کا ضرور ہے لیکن نفس سراسر ہندی ہے، ان تقریروں سے ہندوستان میں تحریک خلافت کی نوعیت اور اہمیت بھی سامنے آ جائے گی۔

"میں یہ واضح کر دوں کہ ہم لوگ یہاں ایک مذہبی مسئلہ کو لیکر آئے ہیں جو ہمارے لیے اہم ترین ہے، اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافت سے ہندوستانی مسلمانوں کا کیا لگاؤ ہے، ہم لوگوں کے نزدیک مذہب محض مراسم یا عقائد کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، یہ پوری زندگی کا اخلاقی اور معاشرتی نظام ہے، یہ کوئی ایسی چیز کو تسلیم نہیں کرتا جس سے روحانی اور دنیاوی چیزوں یا حکومت اور مذہب میں فرق و امتیاز پیدا ہو جائے، یہ زندگی کو ہر طرح ناقابل تقسیم حد تک متحد اور مربوط دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے جس میں انسانیت کے تمام مسائل میں یزدانی رہنمائی ہے، مسلمان اپنے کو خدا کا بندہ یعنی غلام سمجھتا ہے، اسی کی اطاعت کرتا ہے، اور اسی کو اپنا آخری حاکم سمجھتا ہے، اسلام میں لسانی، جغرافیائی اور سیاسی حدود ایسے نہیں ہیں جو انسانوں کے میل ملاپ اور ہمدردی میں رکاوٹ بن جائیں، اسلام زندگی کو قومی (National) نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے افوق القومی (Super national) طریقہ سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے، شروع سے اسلام کے دو مرکز رہے ہیں، ایک تو ذاتی اور ایک مکانی، ذاتی مرکز کا تعلق خلیفہ سے ہے، جو کہ رسول کا جانشین سمجھا جاتا ہے، ہمارے رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) اسلام کے ذاتی مرکز تھے، خلیفہ کی وجہ سے آپ کی جانشینی کی روایت برقرار ہے، مکانی مرکز جزیرۃ العرب ہے، جو پیغمبروں کی سرزمین ہے

کہلاتا ہے، اسلام میں عرب محض ایک جزیرہ نما نہیں ہے، اس کی چوتھی سرحد دریائے فرات اور دجلہ ہے، خلیفہ ان تمام معاملات میں امیرالمومنین ہے، جن کے لیے اسلام میں یزدانی رہنمائی کی تلقین موجود ہو، خلیفہ کے تمام احکام کی اطاعت تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے بشرطیکہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔ دین کی محافظت کے لیے امیرالمومنین کے پاس ہمیشہ قابل ذکر علاقہ، بری اور بحری فوج اور مالیاتی ذرائع ہونے چاہئیں، جن کو اصطلاحاً دنیاوی قوت کہا جاتا ہے۔

قرآن کا حکم ہے لکم دینکم ولی دین۔ مذہب میں جبر نہیں ہے، اسلام میں طاقت اس وقت استعمال کی جاتی ہے، جب اس کے مخالفین طاقت کی دلیل کا سہارا لیتے ہیں، مسلمان کی ذات اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ محض ربانی امانت ہے، اگر دین کی حمایت اور خداوند تعالیٰ کی خدمت کی خاطر اس امانت کی ضرورت پڑے تو مسلمان اس امانت کو پیش نہ کرکے اس میں خیانت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کی دنیاوی قوتوں کے لیے یہی امانت بڑا سرمایہ ہے، دنیا اب بھی طاقت پر بھروسہ رکھتی ہے، اسی لیے خلیفہ اپنی دنیاوی طاقت سے کس طرح سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔

اسی لیے جناب عالی! ہمارا پہلا حق یہ ہے، جس کو ہم یہاں پیش کرنے کے لیے آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں خلیفہ کو خاطر خواہ دنیاوی طاقت کے ساتھ برقرار رکھیں۔ اس دنیاوی طاقت کا معیار، وہی ہو جیسا ہونا چاہیے۔

ہم زیادہ تفصیل میں تو نہیں جانا چاہتے ہیں، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ترکوں نے جو جو مختلف لڑائیاں لڑیں خصوصاً بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کی سلطنت اتنی محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے، اسی لیے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ اب خلیفہ کے

س جو کچھ رہ گیا ہے، وہ باقی رہنے دیا جائے، مسلمان ترکی کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ سیاسی
بہ یلیوں کے مخالف نہیں ہیں، ترکی امپائر کے اندر جتنے عیسائی، یہودی، اور مسلمان فرقے
یں ان کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ان کو خود مختارانہ طور پر آگے بڑھنے کے مواقع
ز ور دیے جائیں، لیکن ترکی کے اقتدار اعلیٰ اور وقار کو بھی ساتھ ہی ساتھ برقرار رکھا جائے"

وزیر اعظم ۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ شامی مسلمانوں کی اس بات کے مخالف ہیں
لہ انھوں نے امیر فیصل کو عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیا ہے ؟

مولانا محمد علی ۔ جی ہاں، میں اس بات کا ذکر کرنے والا ہی تھا لیکن آپ نے یہ سوال
لیا ہے تو پھر میں یہ عرض کروں گا کہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ خود
حل کریں جس طرح خلیفہ کے ساتھ ہماری وابستگی مذہبی نوعیت کی ہے، اسی طرح ہم ایک لازمی اور
اہم مذہبی فریضہ سمجھ کر ترکوں اور عربوں سے مل کر بھی ان سے کچھ کہنا چاہیں گے، قرآن کا
حکم ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، ان میں باہمی صلح کراؤ" ہم صلح اور آشتی کی خاطر
یہاں آئے ہیں، اور اسی مقصد کو لیکر عربوں اور ترکوں کے پاس بھی جانا چاہتے ہیں ۔

وزیر اعظم ۔ میرا تعلق شاید خلیفہ کی صرف دنیاوی طاقت کی حد تک ہے، کیونکہ آپنے
پیش کیا ہے، کہ جنگ کی ابتدا میں سلطان کے پاس جو طاقت رہ گئی تھی، وہ کم سے کم تھی،
تو اب میں سمجھتا ہوں، گرچہ میری معلومات نامکمل ہیں، کہ شام، فلسطین اور دوسرے علاقوں
کے مسلمانوں نے خلیفہ سے کٹ کر ایک آزاد مسلم ریاست کا اعلان کیا ہے،

مولانا محمد علی ۔ جناب عالی! مجھکو امید ہے کہ اگر ہم لوگوں کو ان لوگوں سے ملنے
کا موقع دیا گیا تو ہمارے لیے یہ ممکن ہو سکے گا ہم ان میں ملاپ پیدا کر دیں، عربوں اور
ترکوں میں اختلافات ضرور رہے ہیں لیکن امیر فیصل جب ایک مسلمان کی حیثیت سے اس مسئلہ

پر غور کریں گے، اور ان کو اس طرح ضرور غور کرنا چاہیے، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انکے ذاتی اور خود عربوں کے حوصلوں کی تکمیل ترکوں کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

وزیر اعظم ۔ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ آپ عربوں کی آزادی کے خلاف ہیں۔

مولانا محمد علی ۔ ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ مسلمان اپنے خلیفہ کے لیے دنیاوی طاقت کے خواہاں ہیں، میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کو عثمانی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ جان و مال کی حفاظت اور خود مختاری کی ضمانت بھی دیجائے، اگر ترکی کے اقتدار اعلیٰ کے وقار کو قائم رکھا جائے، تو یہ مسئلہ زیادہ مشکل نظر نہیں آئے گا، ہمارے برطانوی امپائر میں بھی تو مختلف مذہبی فرقے کے لوگ آباد ہیں، ان میں سے کچھ تو بڑی حد تک آزاد ہیں، اور کچھ یہ امید رکھتے ہیں ـــ میرا اشارہ ہندوستان کی طرف ہے ـــ کہ ان کو اس سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو جائے گی جو اب ان کو حاصل ہے، ہماری خود خواہش ہے کہ ہم کو خود مختاری حاصل ہو تو پھر ہم ٹرکش امپائر کے عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو اس حق سے کیوں محروم کر دینا پسند کریں گے، ہمارا برطانوی امپائر نمونہ ہے جس کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے،

ایک تو ہماری یہ تجویز ہے کہ خلیفہ کو خاطر خواہ دنیاوی طاقت کے ساتھ برقرار رکھا جائے دوسری تجویز یہ ہے کہ ہمارے دین کا مکانی مرکز یعنی جزیرۃ العرب کو خالص مسلمانوں کے قبضہ میں رہنا چاہیے، ہمارے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ آخری وصیت تھی جزیرۃ العرب کی جو حقیقی سرحد دجلہ اور فرات ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں شام فلسطین اور موسوپوٹومیا کے علاوہ وہ علاقے بھی شامل ہیں جن کو یورپ کے جغرافیہ داں عرب کا جزیرۃ العرب کہتے ہیں، اگر اس پر یا اس کے کسی علاقہ پر غیر مسلموں کا تسلط کسی قسم

کا بھی ہوا تو مسلمان اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے، یہ ہمارے لیے ایک لازمی مذہبی حکم ہے، کہ اس پورے علاقہ پر مسلمانوں ہی کا تسلط ہو، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ علاقہ خلیفہ ہی کے زیر نگیں ہو، ذرا میں اور واضح کر دوں کہ مذہبی حکم کی تعمیل تو ہو جائے گی اگر امیر فیصل کا اس پر آزادانہ تسلط ہو، لیکن خلیفہ کے لیے کافی علاقے، ذرائع، بری اور بحری افواج کا ہونا ضروری ہے، اس لحاظ سے اقتصادی اور معاشی ضرورتوں کا بھی یہ تقاضا ہو جاتا ہے کہ جزیرۃ العرب جنگ سے پہلے کی طرح خلیفہ کے براہ راست اقتدار میں باقی رہے، ہم کو پوری امید ہے کہ اگر ہم اپنے ہم مذہبوں سے ملے تو ہم ترکوں اور عربوں کے اختلافات کو دور کر دیں گے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عرب میں ترکوں کی حکومت ایسی رہی کہ دوسری طاقتوں کے لیے مداخلت کرنا ضروری ہو گیا، ہم کو ان کے مظالم کی خبر نہیں ملی ہے، اور جناب عالی! آپ کو یہ معلوم ہے کہ یمن میں بڑی شورش رہی، لیکن اس جنگ میں یمن نے ترکی سے علیحدگی اختیار نہیں کی،

ہم تیسری تجویز بھی مسلمانوں کی طرف سے آپ کے سامنے یہاں پیش کرنے کے لیے لائے ہیں، ہمارے لیے یہ مذہبی حکم ہے کہ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کا نگراں خلیفہ ہو، مسلمانوں کی اکثریت یہ بھی چاہتی ہے کہ نجف، کربلا، کاظمین، سامرا اور بغداد کی زیارت گاہیں بھی خلیفہ ہی کی نگرانی میں ہوں، چونکہ یہ سب جزیرۃ العرب ہی میں واقع ہیں،

یہ دعاوی تو مذہبی قسم کے ہیں، جن کے پورے ہونے ہی پر مسلمان اپنے کو مطمئن پائینگے، لیکن وہ فطری طور پر قسطنطنیہ، تھریس اور ایشیائے کوچک کے سلسلہ میں آپ کی مزید مدد کے خواہاں ہیں، یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، آپ کا جو وعدہ تھا، جس کا اعادہ ابھی حال میں بھی کیا گیا ہے، مسلمان اس کا ایفا چاہتے ہیں، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کی طرح قسطنطنیہ

گو تقدس حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی قسطنطنیہ کو دنیا کے تمام مسلمان مقدس نظروں سے دیکھتے آئے ہیں، اور اسلام بول (استنبول) یعنی اسلام کے شہر کے ساتھ تو پانچ صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے، "اسلام کا شہر" ایسا نام کسی اور شہر کو اب تک نہیں دیا گیا، اگر ترکوں کو اس دارالخلافت سے ان کے بوریا بستر کے ساتھ نکال باہر کیا گیا تو مسلمان یہی سمجھیں گے کہ اسلام کو پھر صلیبی جنگ کا چیلنج دیا گیا ہے، اور پورے مشرق پر یورپ اپنا تسلط چاہتا ہے، اگر ایسا ہوا تو پوری دنیا کے مسلمان اور پورا مشرق اس کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھیں گے، اور یہ خطرہ برطانوی امپائر، ایشیا اور افریقہ کے اتحادیوں کے لیے بھی ہوگا۔

پھر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مسلمان اسلام کی اس اہانت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ خلیفہ کو قسطنطنیہ میں محض یرغمال بنا کر رکھا جائے، وہ تو ویٹیکن کا پوپ نہیں ہو سکتا، اور ویٹیکن کا پوپ بن کر رہنا کیسے گوارا کر سکتا ہے، اور یہ کہکر اپنا فرض ادا کروں گا کہ اتحادیوں نے اس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے مسلمانوں کے جذبات میں ایسا اشتعال پیدا ہو جائے گا جن کو قابو میں رکھنا بہت ہی مشکل ہو گا۔ ان کا اشتعال دنیا کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔

جہاں تک تھریس کا تعلق ہے، اگر وہاں کے لوگوں کو حق خود اختیاری دیا گیا تو یہ ترکی کے ساتھ خود ہی رہنا پسند کریں گے بشرطیکہ یہ حق منصفانہ اور ایماندارانہ طور سے استعمال کرنے کو دیا گیا،

سمرنا پر اب یونانیوں کا قبضہ ہے، وہ تو جنگ میں ترکوں کے خلاف برسرپیکار بھی نہیں رہے لیکن اتحادیوں کی سرپرستی میں ان کے اس تسلط سے مسلمانوں کے اس اعتماد کو بڑا دھکا پہنچا ہے، جو برطانوی وعدوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اور وہاں جو مظالم ہو رہے ہیں اس سے مسلمانوں میں اشتعال انگیز برگشتگی پیدا ہو گئی ہے، مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یونانی سرمایہ دار یہاں اس لیے قبضہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیائے کوچک کے

دولتمند اور مشہور علاقوں کا استحصال کریں۔ یہ علاقے بلا شک وشبہ ترکوں کا وطن ہے، اگر یہ صورت حال جاری رکھی گئی تو ترک نہ صرف یورپ ہی سے بوریا بستر کے ساتھ نکال باہر کر دیے جائیں گے، بلکہ ایشیا میں بھی ان کے بوریا بستر کے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی، وہ تجارت اور صنعت میں بالکل مفلوج ہو کر رہ جائیں گے، اور ایشیائے کوچک کے ایک گھرے ہوئے علاقے میں محدود ہو جائیں گے، جن کا جلد از جلد دیوالیہ ہونا یقینی ہو جائے گا، اگر یہاں بھی حق خود اختیاری دیا گیا تو اس زرخیز علاقہ میں یونانیوں کا دعویٰ خود بخود ختم ہو جائے گا، جس پر سرمایہ داروں اور استحصال کرنے والوں کی حریصانہ نظر پڑ رہی ہے،

سلیشیا کے تسلط میں وہی سارے اسباب کارفرما ہیں، جو سمرنا میں دیکھے جا رہے ہیں، سلیشیا سے زیادہ الکزنڈریٹا کی خلیج صرف کچھ لوگوں کی حریصانہ نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے، اسی طرح جس طرح کہ سمرنا کی خلیج بنی ہوئی ہے،

جس قتل عام کی شہرت ہے اس کو میں نظر انداز نہیں کرتا ہوں کسی مسلمان کے خواب وخیال میں بھی قتل اور سفاکی کے مجرموں کی حمایت کی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستان کا یہ وفد ان جرائم پر اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے، اور ان تمام مظلومین کے ساتھ خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان، ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، لیکن اگر ترکوں کو مجرم بنا کر سزا دینی ہے، اور محض اس جرم پر کہ ترک ظالم حکمراں ہیں اس لیے دوسرے مذہبی فرقوں اور گروہوں کو عثمانی حکومت سے آزاد کرنا ضروری ہے تو پھر ہمارے وفد کی یہ تجویز ہے کہ قتل کے سارے مسئلے کی تحقیقات ایک بین الاقوامی کمیشن کے ذریعہ کرائی جائے جس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی نمایندگی مناسب طور سے ہو، جناب عالی! یہ تجویز پہلے بھی ہم تار کے ذریعہ پیش کرنے کی عزت حاصل کر چکے ہیں، جہاں جہاں جرائم سرزد ہوئے ہیں ان کی اصلیت کی چھان بین کمیشن کرے، پھر اسی کے ساتھ

اس قتل عام کی بھی پوری تحقیقات ہو، جو کہ روس کی وجہ سے ایشیائے کوچک میں بلقان کی کامیاب سازشوں کی بنا پر ہوا، یہ کمیشن سلطان کی عیسائی رعایا کی ان انقلابی تنظیموں کی باغیانہ حرکتوں کی بھی تحقیقات کرے جو سلطان کی حکومت کے خلاف ہوتی رہیں، یہ کمیشن ان اشتعال انگیزیوں کی بھی تحقیقات کرے جو اس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت کے خلاف بروئے کار آئیں اور پھر ان جھگڑوں کی نوعیت اور ان میں جو قوتیں کام کرتی رہیں ان کی بھی تحقیقات ہو،

وزیر اعظم۔ آپ کی دلیلوں سے میرے لیے یہ بات واضح نہیں ہو رہی ہے کہ آپ وہاں کے قتل عام سے انکار کر رہے ہیں یا اس کو درست قرار دے رہے ہیں،

مولانا محمد علی۔ میں نہ اس سے انکار کرتا ہوں اور نہ اس کو درست قرار دے رہا ہوں، میری گذارش ہے کہ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ہم لوگ اس پوزیشن میں ہیں کہ نہ اس کو صحیح قرار دے سکتے ہیں اور نہ اس سے انکار کر سکتے ہیں، ہم مسلمان کی حیثیت سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، ہم ترک نہیں ہیں بلکہ مسلمان ہیں ــ کہ اگر کسی بات پر ترکوں کو سزا دینی ہے تو پہلے اس کے لیے مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات ہو جانی چاہیے۔

وزیر اعظم۔ پیرس میں ترکوں کے وفد نے جو ہم لوگوں کو جواب دیا تھا، اس میں تو انھوں نے اس قتل عام کا اعتراف کیا تھا، ان کا جواب صرف یہ تھا کہ اتنی ہی تعداد میں ایشیائے کوچک کی بری حکومت کی وجہ سے مسلمان بھی قتل کیے گئے"۔

مولانا محمد علی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہوں کہ ہم سے زیادہ ترک ہی بہتر طریقہ پر بتا سکتے ہیں کہ ان کی نمایندگی کون کرتا ہے اور کون نہیں کرتا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ترکوں کی آبادی کا بڑا حصہ اس وفد کو اپنا نمایندہ نہیں سمجھتا ہے، جو پیرس آیا، مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں ترکی کی مجلس اتحاد و ترقی سے وابستہ ہوں، حالانکہ میں نہیں ہوں، میرا اس سے کوئی

تعلق نہیں رہا، میں اس مجلس کے ممتاز ارکین کے نام تک نہیں جانتا ہوں، ہاں البتہ ایک تار میں حکومت ہند کے ذریعہ طلعت بے کو جو اس وقت ترکی کے وزیر امور داخلہ تھے، ایک پیام بھیجا تھا کہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں، اس میں شرکت کرنے سے پہلے ہزار بار غور و فکر کرلیں، ان کو میں نے سمجھایا کہ اگر وہ انگلستان کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت بڑی ہی غمناک ہوگی، بس میرا اتنا ہی تعلق رہا۔

وزیر اعظم۔ یہ بہت ہی مناسب نصیحت تھی، کاش اس کو وہ لوگ قبول کرتے، ہم لوگ ترکی کے خلاف لڑائی کے خواہش مند نہیں ہوئے،

مولانا محمد علی۔ میں یہ سمجھتا ہوں۔

وزیر اعظم۔ ہم نے تو اس کا خواب بھی نہیں دیکھا، ہم لوگوں کے خلاف ترکی نے جنگ کی۔

مولانا محمد علی۔ اگر اس وقت برطانوی حکومت ہم لوگوں کی خدمت حاصل کرتی تو ہم موثر ہوسکتے تھے، ہم ترکوں کو کامیابی کے ساتھ سمجھا سکتے تھے، مگر یہ باتیں تو اب ماضی کی ہیں۔

وزیر اعظم۔ ترکوں کی یادداشت کی ایک نقل مجھکو دیجئے۔

مولانا محمد علی۔ یہ ٹائمس اخبار میں شائع ہو چکی ہے، میں نے اس کو ہندوستان میں پڑھا، اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ ایک جماعت جو دوسری جماعت کے متعلق کہتی ہے، اس پر ہمیشہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر تمام ترکوں کو سزا دی گئی تو یہ سزا ادا دفرید پاشا اور ان کے ہم خیالوں کی سزا تو نہ ہوگی، اس وقت جو لوگ برسر اقتدار تھے ان ہی کو جنگی مجرم قرار دیا جاسکتا ہے، میں کسی کی وکالت نہیں کرتا، میں ترکوں کی طرف سے وکالت نامہ لیکر نہیں آیا ہوں، میں تو صرف اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی وکالت کرنے آیا ہوں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہی مسٹر فشر کے سامنے کہہ چکا ہوں کہ مکمل تحقیقات ہو، اگر اس کے ذریعہ سے ساری دنیا کو

یقین ہو جائے کہ ترک کسی اشتعال کے بغیر ہی قاتل بنے رہے، ان سے سفاکیاں ہوئیں، ہولناک جرائم سرزد ہوئے تو میں ان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا، ہم لوگوں کے لیے تو یہ زیادہ اہم بات ہے کہ اسلام کی نیک نامی پر کوئی دھبہ بھی نہ آئے، ہم تو ساری دنیا کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں، لیکن اگر ترک قاتل ثابت ہوئے تو ہم کس منہ سے دنیا کے سامنے جائیں گے، اور کیا یہ کہہ سکیں گے کہ ہم قاتلوں کے بھائی ہیں، لیکن ہم بھی اس قتل کی تاریخ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، صرف آرمینیا ہی میں ترکوں کو بڑا غیر روادار بتایا جاتا ہے، ان کے پاس ایسے علاقے بھی تو ہیں جہاں عیسائی اور یہودی رہتے ہیں، آرمینیا کے لوگ صدیوں تک ترکوں کی حکومت میں رہے، لیکن اس سے پہلے کبھی ان کی غیر رواداری کی شکایت نہیں کی، آرمینیا میں ترکوں کے مظالم کی آواز گذشتہ صدی کے آغاز میں بلند کی گئی ہے، لیکن درحقیقت یہ قتل گذشتہ صدی کے آخری حصے میں اس وقت شروع ہوا جبکہ روسیوں کو بلقان میں کامیابی ہونے لگی، روسیوں نے پیٹر اعظم ہی کے زمانہ سے قسطنطنیہ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی خواہش کے پردے کو اٹھا رکھا تھا، وہ اس کو زار گراڈ بنا کر یہاں تک آنا چاہتے تھے، ان کی سازش بلقان میں شروع ہوئی جس میں ان کو اپنی توقع کے خلاف کامیابی ہوئی، بلغاریہ بلغاریۂ عظیم بن کر آزاد ہوا، لیکن جہاں تک آرمینیوں کا تعلق ہے، وہ جنگ جو کبھی نہیں رہے، ان میں حکومت کے اقتدار اعلیٰ کی خواہش بھی نہیں رہی، وہ تو روسیوں کے راسخ العقیدہ گرجا والوں سے گفتگو کرتے بھی گھبراتے، وہ فریب میں آخر آگئے، جب سازشوں کا جال بچھایا گیا، ان کو اکسایا گیا کہ وہ روس کے زار سے کچھ سمجھوتہ کر لیں تو ان کی صورت حال بہتر ہو جائے گی، اسی کے بعد قتل کی داستان شروع ہوئی، اس کے خلاف شور و غوغا ہوا، اور شہادتیں بھی پیش کی گئیں، لیکن کبھی بین الاقوامی تحقیقات ایسی نہیں ہوئی جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو مطمئن کر سکے، اسی لیے ہم لوگ مخلصانہ طور پر آپ سے پوری

عیسائی دنیا، جناب پوپ اور یورپ امریکہ سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر ترکوں کو سزا اس لیے دیجا رہی ہے کہ وہ ظالم ہیں، اور ان کی حکومت ظلم سے بھری رہی تو پھر اس کے لیے ایسی شہادتیں ہونی چاہیئیں جو شک وشبہہ سے بالا ہوں، ہم عاجزانہ طور پر کہتے ہیں کہ ایسی شہادتیں اس وقت موجود نہیں، آج کے ٹائمس میں بھی ان معصوم بھیڑوں کے بچوں کی خبر چھپی ہے، ہم یہ اصطلاح آرمینی عیسائیوں کے لیے کسی تلخی کی غرض سے استعمال نہیں کر رہے ہیں، ہم یہاں تلخیوں میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ ممکن ہوا تو ہم اس میں کمی پیدا کریں گے۔ ہاں ٹائمس میں ترکوں کے مظالم کی خبریں چھپی ہیں، ہم اس پروپگنڈے سے اچھی طرح واقف ہیں، جو اس ملک میں روزانہ جاری ہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے کہ آرمینی باشندے بالکل معصوم ہیں، پاشا اور آفندی اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کر رہے ہیں یہ سرمایہ داران لوگوں کو پیس رہے ہیں، قتل عام کر رہے ہیں، انگریز اور یورپ کے دوسرے باشندے جو ترکوں کے علاقے میں گئے اور رہے، وہ ترکوں کو اب تک رحمدل اور مہربان سمجھتے رہے لیکن مجھکو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یکایک کیا ہو گیا جس سے ترکوں سے ساری انسانیت جاتی رہی، اور وہ ایسے ہو گئے کہ سارے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ان سے نفرت کرنا چاہیے، ترکوں کے متعلق اگر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے تو یہ شک وشبہہ سے بالاتر شہادتوں کی بنا پر ہونا چاہیے، دنیا میں ایسے تھوڑے لوگ ہیں جو یہ سمجھیں گے کہ ترکوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے سزا نہیں دی گئی لیکن لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو یہی سمجھیں گے کہ ان کو سزا اس لیے دی گئی ہے کہ وہ مسلمان ہیں، اس قسم کے غلط اثرات کو دور کرنا ضروری ہے، مجھکو یقین ہے کہ آپ یا آپ کی حکومت کو اس کا احساس ہے کہ اس میں ذرا بھی شبہہ پیدا نہ ہو کہ آپ نے ترکوں کے ساتھ صلیبی جنگ کا سلوک کیا یا آپ ان پر یورپی تسلط چاہتے ہیں، ہم بھی مشرق میں یہی اثرات پیدا کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم صلح و آشتی

نہ چاہتے تو یہاں نہ آتے، ہم تو امن کا پیام لے کر آئے ہیں، دنیا کے لیے صحیح معنوں میں امن کے خواہاں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ترکی سے صلح کرنے میں کافی تاخیر ہو چکی ہے، ہماری حکومت نے بتایا ہے کہ اس کے لیے برطانیہ ذمہ دار نہیں ہے، تو اس کی ذمہ داری نہ ہم پر اور نہ ترکوں پر عائد کی جا سکتی ہے، اگر صحیح معنوں میں کوئی آخری سمجھوتہ کیا جائے تو مناسب تحقیقات کے لیے چھ مہینے کا وقت کوئی طویل مدت نہیں، کوئی ایسا سمجھوتہ نہ ہونا چاہیے جو مستقبل میں جنگ کا بیج بو دینے کے مرادف سمجھا جائے۔

میں زیادہ وقت لے کر آپ کے پیمانۂ صبر کو لبریز نہیں کرنا چاہتا ہوں، ہماری صرف درخواست یہ ہے کہ ایک مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات ہو، جس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی مناسب نمایندگی ہو، میں نے مسٹر فشر سے بھی کہا ہے کہ اگر ترک واقعی نالائق ہیں اور خلافت کی حکومت بھی ایسی ہے تو نہ صرف عیسائیوں کے خیال سے بلکہ خود ہم مسلمان کی حیثیت سے یہ غور کریں گے کہ ایسی خلافت قابل برداشت ہے کہ نہیں، ہمارے سامنے ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے کی مثال موجود ہے کہ ان کے ساتھ صرف بہتر آدمی تھے، لیکن انھوں نے یزید کا مقابلہ اور کربلا میں شہادت حاصل کی محض اس لیے کہ ایک ظالم کی حکومت قبول نہیں کی جا سکتی تھی، اگر ترک اس سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئے اور ان کے مظالم کو مسلمانوں نے تسلیم کر لیا تو پھر خلافت کا مسئلہ ہی ختم کر دیا جائے گا، یہ بڑی دکھ بھری چیز ہوگی، لیکن ہم کو اسلام کے مفاد کی خاطر ایسا کرنا ہوگا۔

ذرا میں فلسطین پر یہودیوں کے دعویٰ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ہمارا وفد یہودیوں کے فرقہ سے کوئی ناانصافی کرنا نہیں چاہتا، میرا خیال ہے کہ اسلام کو اس منصفانہ سلوک پر فخر ہے جو گذشتہ زمانہ میں اس کی طرف سے یہودیوں کے ساتھ کیا جاتا رہا

اگر مسلمانوں کا قبضہ اس مقدس سرزمین پر رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ یہودیوں کے جائز حقوق کی پامالی ہو۔ اگر ان کی باتیں معقول اور قابل قبول ہوئیں تو عثمانی حکومت ضرور منظور کرتی رہے گی، صیہونی تحریک کے بعض ذمہ دار پروپگنڈا کرنے والوں سے میری ملاقات ہوئی ہے، انھوں نے اپنی گفتگو میں مجھ سے کہا کہ وہ یہاں کوئی سیاسی اقتدار اعلیٰ نہیں چاہتے، وہ صرف وطن چاہتے ہیں جس کی تفصیل پر بحث کیجا سکتی ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ برطانیہ کا یہاں اقتدار اعلیٰ ہو یا یہ علاقہ برطانیہ کے فرامین کو عمل میں لانے والا ہو، انھوں نے جواب دیا، نہیں، ہم تو انسانیت کے نام پر معمولی طور کی معقول گارنٹی چاہتے ہیں کہ ہم خود مختارانہ طور پر پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے" ہم لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں، اور ہندوستان کے مختلف مذاہب کے فرقوں کے ایک وفاق پر یقین رکھتے ہیں، ہندوستان کی جو قومیت بن رہی ہے وہ غالباً دنیا میں مختلف مذاہب کے فرقوں کے وفاق کی پہلی مثال ہوگی، تو ہم یہودیوں کی کلچرل اٹانومی یعنی ثقافتی خود مختاری کے حق کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، یہودیوں کی بڑی چھوٹی اقلیت ہے، اور میں ایک لمحہ کے لیے اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ سارے یہودی یہاں کھنچ کر چلے آئیں گے، جیسا کہ صیہونت کے پرجوش حامی خیال کرتے ہیں، یہی بات میں آرمینیوں کی ریاست کے متعلق کہوں گا، میں ان کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا پسند نہیں کرتا ہوں جس سے ان کو اشتعال پیدا ہو، خود ہم لوگ ذلت آمیز سلوک میں مبتلا رہے ہیں، اسی لیے ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جو ان کو برا معلوم ہو، اگر اتحادی تمام آرمینیوں کو ایک ملے ہوئے علاقہ میں لاکر بسا دیں، اور تمام کردوں کو نکال باہر کریں تو آرمینیا کے لوگ خود یہ پسند نہ کریں گے، چاہے ان کو کتنا ہی بڑا علاقہ نہ مل جائے بلکہ اپنی پرانی حالت ہی پر رہنا پسند کریں گے۔

وزیر اعظم۔ کیا آپ آرمینیا کے باشندوں کے متعلق کچھ کہہ رہے ہیں؟

مولانا محمد علی - جی ہاں، یہی بات میں یہودیوں کے متعلق کہوں گا، وہ دوسری جگہوں پر بڑے خوشحال ہیں، ان کو ایک وطن کی بڑی خواہش ضرور ہے، لیکن مجھکو اس کا ڈر نہیں ہے کہ یہودی اتنی تعداد میں یہاں آجائیں گے کہ مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ ہو جائیں گے، یہودی تو یہی کہتے ہیں کہ دنیا کے اس حصہ پر ترکوں کے اقتدار اعلیٰ پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، جب تک ان کو وہاں رہنے، اپنے طرز پر چلنے پھولنے اور ثقافتی خودمختاری کے حق کو استعمال کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا،

کچھ دیر پہلے آپ نے عربوں سے متعلق ایک سوال کیا تھا، ہمارے وفد کو یہ شبہہ نہیں ہے کہ خلیفہ اور عربوں میں سمجھوتہ نہ ہو سکے گا، میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید میں ہے کہ سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان بھائیوں میں باہمی صلح کرادو، اور یہ ہم پر فرض ہے، بمبئی میں کل ہند خلافت کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہو چکی ہے کہ ایک وفد حجاز جاکر عربوں اور ترکوں میں مصالحت کرائے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری دلچسپی خلافت کے ساتھ ہے، مسلمانوں کو عرب اور عربوں سے زیادہ کوئی اور علاقہ اور آبادی عزیز نہیں، عربوں کے مقابلہ میں ترکوں سے محبت زیادہ نہیں ہو سکتی ہے، عرب کو ہم خالص مسلمانوں کی نگرانی میں دیکھنا چاہتے ہیں، کسی اور کی نگرانی کو ہم کسی حال میں قبول نہ کریں گے، یہ ہمارے لیے ایک مذہبی فریضہ ہے، اس لیے اگر ہم جزیرۃ العرب پر خلیفہ کا اقتدار اعلیٰ چاہتے ہیں تو اس سے عربوں کے ساتھ غیر ہمدردی اور ترکوں کے ساتھ ہمدردی مراد نہیں، ترک تو ہم سے دور آباد ہیں، ہم میں سے کم ہی لوگ ٹرکش امپائر کی پوری تفصیلات سے واقف ہیں، مکہ اور مدینہ تو ہمارے لوگ بکثرت جایا کرتے ہیں، ہم میں سے تو بہت سے لوگ اس سرزمین میں مرنا پسند کرتے ہیں، بہت سے

مسلمان وہاں جاکر آباد ہو جاتے ہیں، وہاں شادی بیاہ کرتے ہیں، میری ایک بچی عرب خاتون ہی ہیں، ہم اپنے اس سفر کے دوران جہاں بھی عربوں سے ملے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کو اعلیٰ تعلیم یافتہ عربوں سے بحث و مباحثہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن پھر بھی جن عربوں سے ملے، ان سے ہم نے پوچھا کہ حجاز کے بادشاہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے، ایسے ملک کا بادشاہ جہاں خدا کے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں ہو سکتا، ان عربوں نے جواب دیا کہ یہ ایسا فعل ہے جس کی وہ مذمت کرتے ہیں، اور یہ ان کی مرضی کے خلاف عمل میں آیا، وہ اس کو غلط سمجھتے ہیں، یہ عرب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے، مجھکو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے، ایسے بہت سے لوگ بھی ہیں جو عربوں کی طرف سے معذرت کرنے کے لیے پیش پیش ہیں، انکا عذر ہے کہ امیر فیصل اور شریف نے جو کچھ کیا وہ اسلام کو بچانے کی خاطر ہی کیا، وہ ترکوں کے خلاف نہ تھے، بلکہ وہ اسلام کے حامی ہیں، اس میں کہاں تک حقیقت ہے، اس سے قطع نظر یہ عذر پہلے نہیں پیش کیا گیا، اب پیش کیا جارہا ہے، ہم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ ہم عربوں اور ترکوں میں مصالحت نہ کرا سکیں گے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اتحادی کانسل اور صلح کانفرنس مسلمانوں کے لیے چھوڑ دے کہ وہ خود اس بارے میں کچھ طے کرلیں، میری یہ ہرگز خواہش نہیں کہ سنگینوں کی مدد سے عربوں کو ترکوں کے ماتحت رکھا جائے، ہم وفاق چاہتے ہیں، اگر ہمارا یہ خواب حقیقت بنجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ عربوں کو وہ تمام آزادی حاصل ہو جائے گی جو وہ چاہتے ہیں، وہ قومی آزادی کے ضرور دعویدار ہو سکتے ہیں، لیکن وہ اس کو فراموش نہیں کرسکتے کہ اسلام قومی آزادی کے علاوہ مافوق القومی نقطۂ نظر کی بھی تعلیم دیتا ہے، اسی لحاظ سے خلافت ان کے لیے اسی طرح عزیز ہونی چاہئے جس طرح کہ ہم کو ہے، شاہ حجاز خلیفہ بننے کا دعویٰ نہیں کرتے ہیں، جب لوگ انکو خلیفہ کہنے لگے تو انھوں نے ان کو ڈانٹا اور اپنے سرکاری ترجمان القبلہ میں یہ شائع کرادیا کہ

وہ صرف شاہ حجاز کہلانا چاہتے ہیں، امیرالمومنین کا لقب خلیفہ کے لیے ہوتا ہے،

وزیر اعظم ۔ امیرالمومنین کے کیا معنے ہوتے ہیں؟

مولانا محمد علی ۔ مومنوں کا سردار، وہ ان کی سربراہی اسلام کے قانون کی خاطر کرتا ہے، اس کو بادشاہت کے اختیارات حاصل کرنے کا حق نہیں ہوتا، جناب عالی! میرا خیال ہے کہ آپ اس سے متاثر ہوں گے کہ خلافت کا نظریہ جمہوریت کا ہے، اور دنیا کے تمام سربراہوں میں خلیفہ ہی ایک ایسا سربراہ ہے جس کی تاجپوشی کی رسم کسی محل میں ادا نہیں کی جاتی ہے، وہ صرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر جاتا ہے، یہ رسول اللہ (صلعم) کے صحابی تھے، جو قسطنطنیہ کی فتح کے لیے بھیجے گئے تھے، خلیفہ اس مزار پر آکر نماز ادا کرتا ہے، اور محمد فاتح کی تلوار کو اپنی کمر میں آویزاں کر لیتا ہے،

وزیر اعظم ۔ کیا یہ خاندانی وراثت کی چیز ہے؟

مولانا محمد علی ۔ اسی کی وضاحت سے خلیفہ کا مسئلہ واضح ہو جائیگا، اسلام کو دین کی مدافعت کی خاطر دنیاوی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر پرہیزگاری اور طاقت کسی ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتی تو مسلمانوں کا یہ عمل ہوتا ہے کہ وہ کسی زیادہ طاقتور شخص کو قبول کر لیں، اگر وہ بہت زیادہ پرہیزگار نہیں ہے لیکن اپنی طاقت کو مسلمانوں کی پرہیزگاری کے معیار کے ماتحت رکھتا ہے، تو وہ قابل قبول ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان بنو امیہ اور بنو عباس کے حکمرانوں کو خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے رہے، اور ترکوں کے سلاطین کو بھی اسی لحاظ خلیفہ مانتے رہے، ان کو اس لیے تسلیم کر لیا گیا کہ ان کی وجہ سے ایک زبردست طاقت دین کی حمایت کے لیے حاصل ہوتی رہی، اگر ترک عام مسلمانوں کے ساتھ اس پر رضامند ہو جائیں کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی ادنیٰ شخص خلیفہ تسلیم کر لیا جائے تو وہ خلیفہ

بن سکتا ہے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں کوئی بھی خلیفہ بن سکتا تھا، اگر اسی اصول کو عمل میں لایا جائے، تو تمام مسلمان بے حد خوش ہوں گے، لیکن ہم کو انسانی فطرت کی بھی کچھ رعایتیں کرنی پڑیں گی، ۱۵۱۷ء میں ترکی کے سلاطین اپنے اقتدار سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے تھے، جس طرح کہ مصر کے مملوک حکمراں نہیں ہوتے،

آخر میں ہم اپنی تجویزوں کا خلاصہ بیان کرنا چاہتے ہیں، خلیفہ مقدس مقامات کا نگراں رہے، جزیرۃ العرب پر اسی کا اقتدار اعلیٰ ہو، آپ نے جناب عالی جو وعدے کیے تھے، انکا ایفا ہو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کی اس بارہویں دفعہ کی تکمیل ہو، جو صلح کے شرائط میں داخل ہے، اگر یہ باتیں عمل میں آگئیں تو خلیفہ کو ایسی دنیاوی طاقت حاصل رہے گی جو خلافت کے لیے ضروری ہے، اور یہ طاقت کم سے کم ہے، جو جنگ سے پہلے کر دی گئی تھی، ہندوستانی مسلمان مصالحت کے لیے بے چین ہیں، آپ کا جذبہ انتقامی نہ ہونا چاہیے، بلکہ مصالحانہ ہو، اگر ترک واقعی قابل الزام ہیں، تو مسلمانوں کو اور دوسرے لوگوں سے زیادہ اس کا خیال ہے کہ مستقبل میں ان پر ماضی کے ایسے الزامات نہ آنے پائیں، اگر ترکوں سے صحیح اور منصفانہ سمجھوتہ نہ کیا گیا تو ہندوستانی مسلمان دنیا میں امن قائم، ترکی میں اچھی حکومت بحال، ترکوں اور برطانیہ اور اسکے اتحادیوں میں میل ملاپ کرانے میں زیادہ مؤثر اور مفید ہونگے، ہز مجسٹی کی حکومت میں انکی مسلمان رعایا ایک مؤثر قوت ہیں، انکو مؤثر طریقہ سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے، مگر ماضی میں اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا، میں ہندوستان کے جذبات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، مگر میرے ساتھی مسٹر سید حسین اس کو واضح اور میری معروضات میں اور کچھ اضافہ کرینگے۔

وزیر اعظم۔ اب وہ کیا اضافہ کرینگے، آپنے یقیناً تمام مسئلہ کو پورے طور پر پیش کر دیا ہے۔

مولانا محمد علی ۔ ان کو اجازت دی جائے کہ ہندوستان کے اندر اس وقت جو جذبات ہیں، ان کو وہ بیان کریں۔

(باقی)

مرکزی سیاست اور قانون شخصی

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

مشہور فاضل و محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پرسنل لا پر یہ مفید مضمون بھیجا ہے، آجکل ہندوستان میں پرسنل لا کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے، اس مضمون سے اس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

قانون شخصی یعنی نکاح، طلاق، وراثت اور ان کے مماثل امور کے قواعد و احکام ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عام طور پر ہر مذہب بلکہ ہر فرقہ دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے، اسکے مختلف پہلو ہیں، مرکزی اور اساسی، سیاست میں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس مختصر نوٹ میں صرف چند پر توجہ منعطف کرائی جائے گی۔

اس کا فلسفہ | یہ تاریخی واقعہ قابل ذکر ہے کہ خلافت راشدہ میں مسلمان سیلاب کی رفتار سے دنیا میں پھیل گئے، ۲۶ھ میں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ میں دار الخلافہ کا رقبہ مدینہ سے ایک طرف اندلس (اسپین) تک، اور دوسری طرف ماوراء النہر میں چینی ترکستان تک وسیع ہو گیا، اس وقت رعایا کی بہت بڑی اکثریت غیر مسلم تھی، اور ان لوگوں کی تھی جو کل تک حکمراں تھے، اور "راتوں رات" محکوم بن گئے تھے، لیکن اپنے ماضی کو بھولے نہ تھے، حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں جانشینی کے مسئلے پر خانہ جنگی شروع ہوئی جو عبد اللہ بن زبیرؓ کی شکست اور عبد الملک بن مروان کی کامیابی تک عملاً بیس سال جاری رہی، تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اس خلفشار کے زمانے میں بھی کسی جگہ غیر مسلم رعایا نے بغاوت نہ کی، حتیٰ کہ جب قیصر روم نے اپنی سابق رعایا کو جو ابھی تک عیسائی تھی، ترغیب دلائی اور فوجی مدد کا وعدہ کیا، اس وقت

بھی یہ غیر مذہب والے (مسلمانوں) کی ماتحتی کو ترجیح دیتے رہے، اور اپنے ہم مذہب بزنطینیوں کی حکومت میں دوبارہ آنا پسند نہ کیا۔

اس کی وجہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام سے کچھ پہلے بزنطینی حکومت میں عیسائیوں کے عقائد میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے، کچھ پادری کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کاملاً خدا ہیں، کچھ کہتے تھے کہ نہیں، ان میں بیک وقت دو طبیعتیں ہیں اور وہ نیم خدا اور نیم انسان ہیں، ایک تیسرے گروہ نے اس میں یہ تطبیق دی کہ ان میں طبیعتیں دو تھیں، لیکن مشیت صرف ایک تھی، شہنشاہ اس تیسرے عقیدے کی طرف مائل ہوا، اور ساری رعیت سے اس کو قبول کرانا چاہا، اس سلسلے میں بڑی سختی برتی، اور قتل و خون سے بھی دریغ نہ کیا۔

اسی زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا، اور پیغمبر اسلام روحنا فداہ نے شہنشاہ ہرقل اور اس کے صوبہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی، ایک صوبہ دار مسلمان ہو گیا لیکن دوسرے صوبہ دار نے اس دعوت کو ہتک سمجھ کر سفیر ہی کو قتل کر ڈالا، ہرقل نے نومسلم صوبہ دار کو پھانسی کی سزا دی، اور مجرم صوبہ دار کو نہ صرف کوئی سزا نہیں دی بلکہ رعایا کو ضمیر کی آزادی دینے سے بھی انکار کیا، اس پر جنگ چھڑ گئی، ہالینڈ کی مستشرق دخویے (De Goeje) اپنی کتاب "شام کی فتح پر یادداشت" صفحہ (۱۰۴ تا ۱۰۶) میں لکھتا ہے کہ "اس وقت یہ حیرت انگیز بات نظر آئی کہ بزنطینی علاقے کے عیسائیوں نے مسلمانوں کا حملہ آوروں کی طرح نہیں بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا، اور یہ بے وجہ نہ تھا، کیونکہ مسلمان فاتحوں نے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جس نرمی کا سلوک کیا وہ ان کے سابق آقاؤں کے ذلیل ظلم کے بالکل برعکس تھا، ہرقل نے اس عیسائی رعایا کے جس نے سرکاری عقائد کو ماننے سے انکار کیا تھا، ناک اور کان کاٹے اور ان کے مکان ڈھائے،

اس کے برخلاف عرب اپنے مفتوحوں کے ساتھ صلح جویانہ برتاؤ کرتے رہے، اور اپنے وعدوں کی شدت سے پابندی کی، اس زمانے کے ایک نسطوری پادری کا خط اب تک محفوظ ہے، وہ لکھتا ہے کہ "ہمارے نئے آقا عرب ہمارے عیسائی مذہب سے ذرا بھی نہیں جھگڑتے، اسکے برعکس ہمارے دین کی حفاظت اور ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں، اور ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کو عطیے دیتے ہیں"۔

مسلمانوں نے قرآنی احکام کی تعمیل میں مفتوحہ علاقوں میں اپنا قانون جاری نہیں کیا، بلکہ ہر طبقے کو قانونی اور عدالتی آزادی دیدی، مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون اور غیر مسلموں کے لیے ان کے اپنے قانون پر عمل رہا، حتیٰ کہ حاکم عدالت بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے اگر فریقین مقدمہ نسطوری فرقے کے عیسائی ہوتے تو قانون بھی نسطوری اور عدالت بھی نسطوری اور حاکم عدالت بھی نسطوری ہوتا تھا، جو نسطوری قانون کے مطابق فیصلہ کرتا تھا، اور ہر فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو اجازت تھی کہ وہ اپنا حاکم عدالت خود مقرر کیا کریں،

مسلمان حکومتیں ہزار سال سے زیادہ تک اس پر عمل کرتی رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم رعایا نے نہ کبھی مذہبی اساس پر بغاوت کی اور نہ اپنے ہم مذہب بیرونی حملہ آوروں کی مدد کی،

یہ طریقہ مدینہ، دمشق، بغداد اور قسطنطنیہ ہی میں نہیں، بلکہ دہلی اور حیدرآباد میں بھی تھا، کیا ہندو بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہزار سالہ دورِ حکومت میں حکومت نے کبھی ہندوؤں پر ان کے شخصی مسائل میں اپنا قانون جاری کیا ہو؟ نکاح، طلاق، وراثت، عقد بیوگان اور اس کے مماثل دوسرے معاملات میں ہمالیہ سے لیکر لنکا تک ہر فرقہ اور ہر مذہب اپنے قانون پر عمل کرتا رہا۔

جو حکومت اپنی قوت کے بل پر ساری رعایا کو ایک ہی قانون پر عامل بنانا چاہتی ہے اسے سوچ لینا چاہیے کہ وہ شہنشاہ ہرقل کا انجام چاہتی ہے یا خلیفہ ابوبکرؓ کا، یہ ہوا مسئلے کا فلسفیانہ رخ۔

اس کی عملی حیثیت | آدمی کو بعض وقت وہم ہو جاتا ہے اور وہ نامعلوم چیزوں کے متعلق قسم قسم کے مفروضے تراش لیتا ہے، اسلام میں طلاق کی آزادی ہے، انجیل میں طلاق کو حرام قرار دیا گیا ہے، مغرب نے طویل تجربے کے بعد مجبور ہو کر یورپ اور امریکہ دونوں میں کشوری قانون کے ذریعے طلاق کی اجازت دیدی، اور آج طلاقوں کا تناسب یورپ و امریکہ میں اسلامی ممالک سے اونچا ہو چکا ہے، اور چونکہ عدالتی طلاق گراں بھی ہے، طویل وقت بھی لگتا ہے، اور قسم قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ فرنگستان میں زنا بالرضا جائز ہے، اس لیے بغیر طلاق کے ہزاروں لاکھوں شادی شدہ مرد داشتاؤں کے ساتھ، اور شادی شدہ عورتیں اپنے دوستوں کے گھر میں روز افزوں رہنے لگی ہیں،

فرنگی قانون میں طلاق کی صرف ایک صورت ہے یعنی تفریق عدالتی، اسلام میں پانچ صورتیں ہیں،

(۱) یک طرفہ شوہر کی مرضی پر،

(۲) یک طرفہ بیوی کی مرضی پر (عقد نکاح میں تفویض طلاق کے ذریعے سے)

(۳) طرفین کی رضامندی سے (خلع کے ذریعہ سے)

(۴) تحکیم اور ثالثی کے فیصلے پر،

(۵) تفریق بحکم قاضی (یعنی حاکم عدالت)

پھر بھی جو اسلامی قانون سے مخصوص ہے طلاق میں ایک موثر مانع ہے، اور طلاق سے پہلے شوہر کو پوری طرح سوچنا پڑتا ہے، قرآن و حدیث میں طلاق کی شدید مذمت اور بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم ہے اس کو فرنگی اور جمہوری دونوں زمانوں میں اس لیے بھلا دیا گیا ہے کہ

مذہبی تعلیم کو مدارس سے خارج رکھا گیا، اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں، اگر کسی درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئیں تو ان کو توڑنے کے بجائے جڑ کو دیکھنا چاہیے کہ اس میں کونسا کیڑا لگ گیا ہے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ مغلیہ دور کے اختتام پر جب انگریزوں نے مردم شماری کرائی تو مسلمانوں میں تعدد ازدواج کی تعداد دو فی ہزار تھی، اقوام متحدہ کی رپورٹ ہے کہ وحدت ازدواج پر عامل پاناما میں اب پچھتّر فی صد بچے نکاح کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان ممالک میں مصر سب سے زیادہ "ترقی یافتہ" ہے، وہاں ایسے بچے صرف ایک فیصد ہیں، تعدد ازدواج کا کبھی یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ بہ کثرت مسلمان اس پر عامل ہوں، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ تعدد ازدواج سے نہیں بلکہ تبلیغ سے ہوا ہے، تبلیغ میں اس دین کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے، جو معقول اور انسانیت کیلئے مفید ہو، روپے پیسے سے مصیبت زدوں کا ایمان خریدا جاسکتا ہے لیکن نہ وہ راسخ ہوتا ہے اور نہ دیرپا۔

اسلامی ملکوں میں یتیم پوتے کو اسکے چچا کی موجودگی میں دادا خود ہی ہبہ میں وصیت کے ذریعہ بہت کچھ دیتا ہے، قانون کے ذریعہ اسکو دادا کی وراثت میں لازمی حصہ دلانے میں قباحت یہ ہے کہ یہ مسائل عقائد کا جز ہیں، اور اسلام میں کوئی انسانی طاقت خدائی احکام کو بدلنے کی مجاز نہیں، جو حکومت اس میں دخل دینا چاہے تو اسے ہر قبل کا انجام پیش نظر رکھنا چاہیے، اسلام میں ہر شخص کو آزادی ہے کہ اسکے فرقوں میں سے جس فرقے سے چاہے تعلق رکھے، سنی چاہے تو شیعہ بنجائے، شیعہ چاہے تو سنی بنجائے، اسے کوئی نہیں روک سکتا، لیکن اگر کوئی مسلمان حکومت سنیوں پر شیعہ قانون اور شیعوں پر سنی قانون نافذ کرے تو اس سے رعایا کی دلشکنی اور حکومت سے نفرت پیدا ہوگی، آج پاکستان سے زیادہ ہندستان میں مسلمان اپنے دین پر راسخ ہیں، مصر اور الجزائر سے زیادہ روس کے مسلمان اپنے دین پر جمے ہوئے ہیں، اور پچاس سالہ دباؤ نے انکو مذہب سے پھیرنے کے بجائے اس پر اور مستحکم کردیا ہے۔

اسلام اور عرب سوشلزم

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دارالمصنفین

عرب ممالک میں اسلام اور قوم پرستی کے ملے جلے جذبات نے ترقی پسند سوشلسٹ تحریک کو جنم دیا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ان ملکوں میں سوشلسٹ تحریک کے بڑھنے کی ایک خاص حد ہے، اور اسلام اس حد سے اس کو آگے نہیں جانے دیتا۔ بلاشبہ عرب قوم پرستی اسلام ہی کی مرہون منت ہے، دنیائے عرب سے باہر عام طور پر لوگ ان دونوں چیزوں میں ایک خلیج اور تضاد محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں عرب قومیت ایک مخصوص لسانی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مذہب سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیشنلزم سیکولر نظریات پر مبنی ایک اچھے طرز زندگی کا نام ہے، اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عرب قومیت پرستی کے بہت سے علمبردار خود یہ کہتے ہیں کہ ان کی نیشنلزم کی تحریک سیکولر طرز کی ہے لیکن یہ تفریق عملاً عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ دنیائے عرب میں قوم پرستی کا جذبہ ایک اہم سیاسی طاقت کا نام ہے، اور اس کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں، عوام اور بہت سے تعلیم یافتہ ذہنوں میں بھی ملت اسلامیہ اور ملت عربیہ میں کوئی واضح فرق نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں تاریخی طور پر ایک دوسرے کے ہمیشہ ممدو معاون رہے ہیں، اور عرب ممالک میں قومیت کے لفظ نے ایک نئے معنی کا جامہ پہن لیا ہے، جس کا مطلب ہے مسلم اتحاد، مسلمانوں کا وقار اور ان کا اہم تاریخی کردار،

لیکن ان ملکوں میں اسلام اور نیشنلزم کے درمیان تضاد و تصادم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نیشنلسٹ لیڈر سماجی زندگی اور سیاسی اصولوں کے جدید نظریات کو اپناتے ہیں، یہاں سے اسلام اور نیشنلزم کا ٹکراؤ شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے اخلاقی اصول متضاد ہیں، اسلام اطاعت چاہتا ہے اور سوشلزم بغاوت۔ بعض دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ اسلام اور سوشلزم ایک دوسرے کے حلیف ہیں نہ کہ حریف۔ انھوں نے بڑی ہشیاری سے اس مسئلہ پر اظہار رائے سے احتراز کیا ہے کہ سوشلسٹ تحریک کی پشت پر اصل طاقت کونسی ہے، اسلام یا سوشلزم۔ حقیقتاً تو یہ سیکولر تحریک ہے، لیکن کھلم کھلا کوئی بھی اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا، اس لیے سوشلسٹ تحریک کے پروگرام کو نفسیاتی اور نظریاتی تصادم سے بچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اسے ایک مخصوص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ سوشلزم کو عرب جذبات نے اتنا فائدہ پہنچایا ہے جتنا سیکولر نظریات کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے سماج کے تمام طبقوں سے ایسی مساوات برتنا جو ترقی پسندی پر مبنی ہو، انتخابات میں حصہ لینے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور ہر فرقہ اپنے اور دوسرے کے مذہبی و اخلاقی اصولوں کا احترام کرتا ہو، لیکن بیشتر عرب ممالک چونکہ معاشی طور پر پسماندہ اور طبقاتی نابرابری کا شکار رہے ہیں، اس لیے وہاں اس طرح کے سیکولر نظریات کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا، سیاسی طور پر جو لوگ بیدار مغز ہیں، وہ بھی ان نظریات کو زیادہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ سماجی فلاح کے لیے جن چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں وہ ہے معاشرہ کا اتحاد، باہمی وقار اور اخلاقی قدریں، کچھ عرصہ تک تو سیکولر نظریات ان ممالک میں بہت مقبول رہے، کیونکہ ان میں سے بیشتر ملک یورپ کے زیر تسلط تھے، لیکن اس زمانے میں بھی یہ نظریات ایک خاص حد سے آگے مقبول عوام نہ ہو سکے۔

سوشلزم کے کچھ اصول مندرجۂ بالا نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، ان سے مذہبیت و قومیت دونوں کے جذبات کو تسکین ملتی ہے، مثلاً سوشلسٹ تحریک ترقی، سماجی اتحاد، مساوات، معاشرتی اقدار اور قومی وقار کی ضامن ہے، جو قوم پرستوں کے نظریات کی مؤید ہے، اور مذہبی طبقہ کے لیے موجودہ دور کی زندگی میں صراط مستقیم کا تعین کرتی ہے، ان کی تکمیل کے لیے ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے، جنھیں عوام کی پوری حمایت حاصل ہو، ملت عربیہ نے ان تمام کاموں کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور اس میں ایسے استقلال وثبات قدمی کا ثبوت دیا ہے کہ نیشنلسٹ طبقہ تک اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا اور اسکی تائید کرتا ہے، اسی کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے دینی و مذہبی اصولوں کو بھی فراموش نہیں کیا، اور ایسی راہ اختیار کی ہے جو جہاد کی راہ کہی جاسکتی ہے، لیکن اخلاقی اصول، صراط مستقیم "راستی" یا "جہاد" جیسی اصطلاحات کا اسلام میں وہ مفہوم نہیں ہے، جو ترقی پسند سوشلسٹ تحریک یا نیشنلزم میں ہے، جب تک ان اصطلاحات کا مطلب غیر واضح رہے گا اور قومی و مذہبی جذبات ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں گے کسی خطرناک تصادم کے امکانات بہت کم ہیں،

اصل دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوشلزم پر عمل درآمد کا مسئلہ آتا ہے، کیونکہ ملی اور قومی جذبات کے علاوہ سوشلزم کا مدار دوسری بنیادوں پر ہے، سوشلزم میں عملی سیاست اور معاشی مسائل سب سے زیادہ توجہ طلب ہوتے ہیں، اور روایتی طرز معیشت ان مسائل کا حل پیش نہیں کرپایا، ملک کے رسم و رواج، اخلاقی اقدار کا تعین کرتے ہیں، مگر مندرجہ بالا مسائل حل نہیں کرپاتے، یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ اخلاقی اقدار سے ملک کے سیاسی و معاشی مسائل کی اہمیت کا اندازہ ہو پاتا ہے، نہ ان مسائل

کو حل کرنے میں تو کوئی واضح مقصد سامنے ہوتا ہے اور نہ حصول مقصد کے متعین وسیلے ہوتے ہیں، یہ تمام خصوصیات صرف سوشلزم میں پائی جاتی ہے۔ عقائد اور رسم و رواج سوشلزم کی طرف نہ صرف بڑھنے نہیں دیتے، بلکہ پہلے ہی سے اس کے عبرتناک انجام کا نقشہ پیش کرنے لگتے ہیں، معاشی مسائل حل کرنے کے لیے سوشلزم مادہ پرستوں اور ماہرین منصوبہ بندی سے مدد لیتا ہے، لیکن معاشیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک کا کوئی بھی مسئلہ صرف معاشی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ایک سماجی اور سیاسی پہلو بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے حل کے لیے ایک وسیع اور دائمی نظریاتی اصول کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً عرب کی سوشلسٹ حکومتوں یعنی مصر اور شام میں اس اصولی نظریے کا کام کمیونزم سے لیا جا رہا ہے، جو ایک دائمی اصول بھی ہے اور سائنٹفک بھی ہے، اور جس کا بعض ملکوں میں کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے،

عرب ممالک کے سوشلسٹ بھی ان اصولوں کی آفاقیت پر غور کر رہے ہیں، اس بارہ میں عرب جذبات اسلامی رنگ سے مل کر سوشلزم کو ایک حد تک اسی راہ پر لے جاتے ہیں، جو مارکس اور لینن کے نظریاتی اصولوں کے متوازی ہے، لیکن چونکہ اسلام اور کمیونزم کے سرچشمے علیحدہ علیحدہ ہیں، اس لیے ان دونوں کی راہیں بھی جداگانہ ہیں، اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ عرب سوشلزم ایک آفاقی اور سیکولر اصول ہے تو پھر اسے صرف عرب کا سوشلزم نہیں کہا جا سکتا، اور نہ وہ سوشلزم اسلامی ہو سکتا ہے، پھر اگر اس اصول کے آفاقی تسلیم کرلینے سے اسلام کی آفاقیت پر حرف نہ آتا تو کوئی بات نہ تھی، لیکن اس اصول کو ماننے کے بعد اسلام محض ایک اخلاقی اصول ہو کر رہ جائے گا، حالانکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، یہ کہا جا سکتا ہو کہ

قومیت کے مقابلہ میں اسلام کا ہمیشہ ہی حشر ہوا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، دنیا کی ہر نیشلزم کی طرح عرب قوم پرستی بھی کسی آفاقی اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عرب نیشلزم اسلام ہی کی پیداوار ہے،

اس وقت مسئلہ یہ درپیش ہے کہ عرب سوشلزم کی صحیح نوعیت کیا ہوگی؛ اس میں عرب رنگ زیادہ نمایاں ہوگا یا سوشلسٹ نظریات؛ یا لفظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب سوشلزم عربوں کے قومی اور تاریخی کردار کا حامل کوئی جدید ترقی یافتہ اصول ہوگا، ایسی صورت میں اس پر اسلام کا رنگ غالب رہیگا یا وہاں کا سوشلزم بھی اسی طرز کا ہوگا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہے، اور جسکا مقصد طبقاتی استحصال کو روکنا ہے، اول الذکر کے پیرو کہتے ہیں کہ ہمارا سوشلزم کمیونزم نہیں ہے۔ اور وہ اس غیر ملکی نظریے کو اپنے ملک میں لانے سے احتراز کرتے ہیں، دوسری صورت کے ماننے والے اسی کے منکر ہیں کہ سوشلزم یا کمیونزم کوئی غیر ملکی نظریہ ہے، اس لیے وہ عرب سوشلزم کی اصطلاح کو ہی ناپسند کرتے ہیں، مصر کے کمیونسٹ کہتے ہیں کہ مرحوم صدر ناصر خود عرب سوشلزم کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، اس کے بجائے ان کی اصطلاح تھی "عرب ملکوں میں چلنے والی سوشلزم کی تحریک"

مصر میں ابتک کمیونزم اور اسلام کے درمیان فرق زیر بحث ہے، لیکن شام کی بعث پارٹی نے اس فرق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، حالانکہ کمیونزم کے کچھ اصول اسلام سے اتنے مختلف ہیں کہ وہ عرب اور اسلامی تہذیب کی بنیادی باتوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں، عرب سوشلزم کمیونزم کی مادہ پرستی اور طبقاتی خونریزی کو ماننے سے انکار کرتا ہے، اور نجی ملکیت اور تجارت کے حق کو بھی تسلیم کرتا ہے، لیکن کیا

اس قسم کے عرب سوشلسٹ اصولی اسے کمیونزم سے الگ کرتے ہیں یا در اصل اسے کمیونزم ہی کی طرف لے جاتے ہیں، عرب ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں بڑی رکاوٹ مذہب ہے، وہاں کے بہت سے متشدد سوشلزم کے ساتھ "عرب" لگانا بھی پسند نہیں کرتے، وہ اپنی نجی زندگی میں دھریے یا مذہب کے مخالف ہیں، اور اگر انھیں موقع ملے تو وہ دہریت کا پروپیگنڈا کرنا بھی شروع کر دیں، ورنہ کم ازکم دینی افکار و نظریات پر نکتہ چینی تو ضرور ہی کریں، مگر کسی اصلاح کی نیت سے نہیں، خوش قسمتی سے اب تک ان لوگوں کو دہریت کی تبلیغ کا موقع نہیں مل سکا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان عرب ممالک میں بھی جہاں سوشلزم تحریک قدم جما چکی ہے، ارباب اقتدار عوام کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ ان کی ہر پالیسی اور اقدام شریعت کے عین مطابق ہے، یہ حکمراں ڈرتے ہیں کہ اگر عوام کو یہ اندازہ ہو گیا کہ سوشلسٹ انقلاب اور دہریت میں کوئی ربط ہے تو وہ سوشلسٹ اقدامات کی پرزور مخالفت کریں گے، اسی لیے ۱۹۶۵ء میں مرحوم جمال عبد الناصر نے مصر کے کمیونسٹوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ عوام میں لادینی افکار کی تبلیغ سے باز رہیں، حالانکہ یہ تنبیہ قطعی مصنوعی تھی، کیونکہ ایسے کمیونسٹوں کو خود ناصر نے قید سے رہا کر کے ممتاز عہدوں پر فائز کیا تھا،

معاشرہ کو مستحکم بنانے کے لیے مذہب میں کچھ ایسے رسم و رواج ہوتے ہیں، جنکا سیاست سے براہ راست تصادم ہوتا ہے، مثلاً اگر سوسائٹی میں معاشی عدم مساوات ہوگی تو طبقاتی ٹکراؤ ناگزیر ہے، اس لیے اس نابرابری کو مذہب بھی دور کرنا چاہتا ہے مگر اس کے لیے اس نے قانونی انصاف اور سماجی اتحاد کی راہ بتائی ہے، طبقاتی کشمکش سے سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہوتا ہے، اس لیے مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، یہی

وجہ ہے کہ طبقاتی کشمکش کے بارے میں ناصر نوازوں اور بعث پارٹی کے ماننے والوں کے ذہنوں میں ابھی تک دورنگی باقی ہے، اور وہ اس بات کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے کہ جو انقلاب وہ لانا چاہتے ہیں اس کا ڈھانچہ طبقاتی کشمکش کو اہمیت دے گا یا نہیں، دونوں کو تسلیم ہے کہ یہ کشمکش موجود ضرور ہے مگر اس کو عدم تشدد کے ذریعہ حل کرنا چاہیے، لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کرتے کہ اگر عدم تشدد سے یہ مسئلہ حل نہ ہو سکے تو پھر کیا کیا جائے۔ ان ہی وجوہ سے یہ مسئلہ ابھی وہاں دبا ہوا ہے، مگر کسی وقت بھی ابھر سکتا ہے۔

مصر کے مرحوم صدر جمال عبد الناصر عرب ممالک کے قدامت پسند حکمرانوں سے کبھی دوستی کرتے تھے اور کبھی دشمنی، کبھی مخالفت کے بعد پھر مصالحت کر لیتے تھے۔ اس سے اس غیر یقینی صورت حال کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ صدر ناصر عمر بھر یہ طے نہیں کر سکے کہ مسلم حکومتوں کے سربراہ ان کے مسلمان بھائی ہیں یا طبقاتی دشمن، یہ ظاہر ہے کہ مذہبی جذبہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کے موافق فیصلہ صادر کریگا، بعث پارٹی کے کچھ متشدد لوگ اس مسئلہ پر ناصر کی بہ نسبت ایک قطعی فیصلہ کر چکے ہیں، مثلاً ڈاکٹر نور الدین العطاشی نے ۲۴ر مئی ۱۹۶۶ء کو اعلان کیا تھا کہ

> شام عربوں کی چوٹی کانفرنسوں اور عرب اتحاد کے معاہدوں کی مذمت کرتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر یہ کانفرنسیں جاری رہیں تو مسئلہ فلسطین کے حل کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح چوٹی کانفرنسیں ان حکمرانوں کو تقویت پہنچاتی ہیں، جنھیں عوام ناپسند کرتے ہیں۔"

عرب سوشلزم کے بارہ میں اسلامی اور سیکولر نظریات میں ٹکراؤ کا ایک سبب وہاں کے حکمرانوں کی حاکمانہ ذہنیت بھی ہے، یہ حکمران نظام حکومت کو قدیم طرز کے مطابق

چلانے کے عادی رہے ہیں، اور ان کی زیادہ تر توجہ اپنے ذاتی تحفظ اور پُرشوکت زندگی پر رہی ہے، اس سے ان لوگوں کو سخت مایوسی ہوتی ہے، جو حکومت کی مشنری کو انقلاب کا آلہ بنانا چاہتے ہیں، اس وقت اسلام ایک اصول اور طرز زندگی کے بجائے ایک خاص ذہنیت کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، عرب سوشلسٹ اس بات پر کتنا ہی زور دیں کہ اسلام میں انقلابی قوتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہبی جذبات و روایات ہمیشہ قدامت پرستی کی طرف لے جاتے ہیں، اور یہ چیز مارکس اور لینن کے اصولوں، نئے سائنٹفک تجربات اور عرب سوشلسٹوں کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، حاکمانہ ذہنیت اسلام کی پیدا کردہ نہیں ہے، دراصل آج کی عرب حکومتوں کے مسائل بڑی حد تک ویسے ہی ہیں، جیسے قدیم اسلامی سلطنتوں کے سامنے تھے، جب بازنطینی اور ساسانی حکومتیں مسلمانوں کے زیر تسلط آئیں تو ان کے طرز حکومت میں تبدیلی لانا مسلم حکمرانوں کے لیے ایک اہم مسئلہ تھا، آج کے عربوں کے پاس اسلامی نظام حکومت کا ورثہ موجود ہے، اسلام میں اہم سماجی مسائل کے حل کے لیے گذشتہ روایات پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی نیا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے تو اس طریقہ کے بانیوں کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ان کا طریقہ پرانے روایتی طریقوں سے بہتر ہے، اور اسکا اسلامی اخلاق سے ٹکراؤ نہیں ہوگا، مصلحین کی بہت سی نسلیں اصلاح کی کوششیں کرکے تھک چکی ہیں، لیکن مندرجہ بالا ثبوت کے بغیر عوام نے ان کی باتوں کو ہمیشہ رد کر دیا ہے، اور ان کے ذہنوں میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی، ایسی صورت میں نظریۂ حکومت کو بدلنا تو اور بھی مشکل کام ہے،

مولانا شاہ غلام مرتضیٰ جنونؔ

اور

ان کی تفسیر مرتضوی منظوم اردو

از جناب قاضی سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

مولانا شاہ غلام مرتضیٰ نسباً علوی اور وطناً بہاری ہیں، سنہ پیدائش اور وفات صحیح معلوم نہیں، سید عزیزالدین بلخی راز مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں کہ ۱۱۵۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے اور ۱۲۰۰ھ کے بعد وفات پائی، جائے پیدائش اور جائے وفات بھی صحیح معلوم نہیں، مشہور شاعر سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ سوداؔ نے ان کے ایک مصرع پر تضمین کی ہے ؎

اے جنونؔ مصرع ترا سوداؔ کی ہے زنجیر پا
قید سے تیرے نہیں ہونے کو اب آزاد ہم

ان کے والد محترم مولانا شاہ تیمور سہسرامی الہ آبادی ہیں، اور مولانا شاہ محمد برکت الہ آبادی سے تلمذ ہے، قرینہ غالب ہے کہ شاعری کے ساتھ علوم و فنون میں بھی ان سے تلمذ ہوگا،

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ صاحبِ دیوان تھے، مگر دیوان نایاب ہے، تفسیر منظوم اردو کی دو جلدیں تفسیر مرتضوی کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں، پہلی جلد مختلف سورتوں کی تفسیر ہے، اور غیر مطبوعہ ہے، مخطوطہ کا سنہ کتابت ۱۲۶۴ھ اور کاتب کا نام سید امجد حسن حسنی

ساکن مولانگر، بھاگلپور (بہار ہے)، یہ مخطوطہ مولانا شاہ مرتضیٰ حسن بلخی رحمۃ اللہ علیہ سابق سجادہ نشین خانقاہ فتوحہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے۔ دوسری جلد تیسویں پارہ کے کل سورتوں پر مشتمل اور مطبوعہ ہے، جو راقم کے پیش نظر ہے، اور مولانا ممدوح کے تبحر علم وفن عقل ونقل، تقدس وتصوف کی جامعیت کی بڑی سند ہے، الفاظ کی تحقیق، لغات کا حل، قرأت قرآن کا اختلاف، روایات اور راویوں سے استناد واستشہاد، اولیا وصلحاء کے روحانی نکات متداول اور غیر متداول تفاسیر کے حوالے مفسر کے وسعت علم کے شاہد ہیں،

پیش نظر تفسیر میں شیخ اکبر یا شیخ الاسلام کشاف، تفسیر ابن عباس، معالم زاہدی لباب کلبی اور دیگر مستند تفاسیر کے حوالے ہیں، تفسیر مذکور میں ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت اقدس میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے، اور آل عبا دوازدہ امام کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے، تو دوسری طرف حضرات شیخین صدیق اکبر وفاروق اعظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدح ومنقبت ہے، اس کے علاوہ خاتم الانبیاء کے ختم نبوت، شفاعت کبریٰ کا ذکر جمیل بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مسلک اہل سنت والجماعت ہی تھا، مگر اہل بیت رسول کی محبت میں غلو تھا، تفسیر کے اختتام پر خاتمۂ کتاب کے زیر عنوان ۵۴ اشعار کی ایک نظم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر منظوم اردو دو جلدوں میں ہے، اور اخلاف میں صرف ایک صاحبزادہ غلام حسین نامی تھے، یہ تفسیر اس دور میں تالیف ہوئی ہے، جب نظم اردو میں کوئی تفسیر عالم وجود میں نہیں آئی تھی، لہذا کہا جاسکتا ہے کہ تفسیر منظوم اردو کی اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہے،

تفسیر کی نوعیت | اول سورتوں کا شان نزول کلمات وحروف نیز آیات ورکوع کی تعداد بیان کی ہے، صرفی قواعد، نحوی تراکیب، تحقیق الفاظ، حل لغات اور اختلاف قرأت کو جابجا بیان کیا ہے، اور اس کے حوالے بھی دیے ہیں، سورتوں کے اختتام پر ان کے خواص وادعیۂ ماثورہ بھی تحریر کیے ہیں،

تفسیر مطبوعہ کے صفحۂ اول کی عبارتیں درج ذیل ہیں :-

تفسیر مرتضوی یعنی پارہ عم کی تفسیر نظم ہندی تصنیف مولانا شاہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ متخلص بہ جنوںؔ ابن حضرت سید شاہ مولانا محمد تیمور الہ آبادی کو خاکسار خواجہ عبدالصمد نے تصحیح کے بعد حافظ محمد صدیق صاحب اور مولوی محمد وجیہ صاحب مدرس مدرسہ کمپنی بہادر کے مطبع طبی میں مولوی عبدالماجد بن حکیم مولوی عبدالمجید خاں مرحوم نے واسطے فائدہ خاص وعام کے روز جمعہ ۱۲۵۹ھ میں چھپوایا۔

مصنف کے تفصیلی حالات اگرچہ نہیں ملتے مگر مختصر ذکر مختلف تذکروں میں ہے، صاحبِ تذکرہ طبقات الشعرا، قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں :-

جنوںؔ مردیست ذوفنون از خاندان عالی بہرۂ وافی از فقر و درویشی دارد از معاصرین مرزا رفیع سوداؔ موصوف کہ در حق او می گوید

اے جنوں مصرع تراسوداؔ کی ہوزنجیر پا　　　قید سے تیرے نہیں ہونے کو اب آزاد ہم

گویند مردیست مہذب، پاکیزہ، صورت نہایت خوش مذاق وقابل و در اکثر فنون کامل، دیوان ریختہ ترتیب دادہ و بسیار معانی تلاش در و نمودہ اما اشعارش باین راقم الحروف بہم نرسیدہ اگرچہ از چند روز در ظاہر اعمی و سلب بصارت او شدہ است اما این چند ابیات دال بر بصارت باطنی او

خوش فکری و خوش تلاشی اوست ''

از دوست

دشمنِ جاں ہو گئی آخر یہ بینائی مجھے — جو بلا کہئے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

گن کے قدم رکھے ہے یار اک دو سہ چار پنج شش — مر گئے ہم تھے غمگسار اک دو سہ چار پنج شش

ساقی تو اب اٹھالے آگے سے یہ گلابیاں — شیشہ ہی طاق سے لا اک دو سہ چار پنج شش

پھر کوئی جام لیکے بیٹھ تا کہیں ہوں سیاہ مست — دے مجھے بھر کے ایک ہی بار اک دو سہ چار پانچ شش

از دوست

پنجۂ تقدیر سے کیا بس چلے تدبیر کا — اے جنوں ہو گا وہی جو ہے لکھا تقدیر کا

مرشدِ کامل ہے در دِ عشق ہر مذہب کے بیچ — میں تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اس پیر کا

کھینچیں شکل عاشق و معشوق اب دیوار پر — اب یہ نکلا ہے رواج اس شہر کی تعمیر کا

تب جنوں کہنے لگا ہم تجھ سے فرمائش کریں — اے تصور سیکھ لے یہ طور ہے تحریر کا

مجھ گریباں چاک کو تو اس کا دامن گیر کر — اس طرح نقشہ اتارا اس نے مری تصویر کا

پہنچا کوئی کسو سے کوئی دیر سے پہنچا — تھی جس پہ تری مہر وہی خیر سے پہنچا

جوں قبلہ نما اپنے جنوں گرد پھرا پھر — واللہ مجھے کچھ نہ کسی غیر سے پہنچا

کب ماہ اس سمک میں ہم سنگ ہے تمہارا — حقا کہ حسنِ یوسف پا سنگ ہے تمہارا

آنکھیں مری تمہارے یوں رنگ میں رنگی ہیں — جو رنگ ہوں دکھاتا سو رنگ ہے تمہارا

لاکھوں ہی رنگ گل کے رنگ میں تمہارے دیکھے — دکھلانہ ہر کسو نے کیا رنگ ہے تمہارا

آنکھیں بھی چڑھ رہی ہیں منہ بھی اتر رہا ہے — کچھ رنگ ان دنوں میں بے رنگ ہے تمہارا

اک بوسہ ان لبوں سے دیجے جنوں کو بھی — اے غنچہ لب نہایت دل تنگ ہے تمہارا

تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشق مطبوعہ ۱۹۵۹ء،

تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشق کا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ لندن میں ہے اور تذکرۂ عشق کا دوسرا نسخہ قاضی سید عبدالودود صاحب کی ملکیت میں ہے، صاحب تذکرۂ شورش

لکھتے ہیں :-

جنون دیگر شاہ غلام مرتضیٰ الہ آبادی جنون تخلص ابن حضرت شاہ تیمور قدس سرہٗ شاگرد مولوی برکت الہ آبادی قدس سرہٗ کا ہے، فکر شعر فارسی گاہے گاہے ریختہ می فرمایند ازوست

کہیو خدا سے اے ملک الموت جا کے تو دیتا نہیں ہے جی کو جنوں شاہ کیا کرو

مصنف تذکرۂ عشق کا بیان ہے :-

جنون تخلص الہ آبادی موسوم بہ شیخ غلام مرتضیٰ، خلف شاہ تیمور سہسرامی از شاگردان مولوی محمد برکت جوانے طالب علم مستعد است و رسائی طبع و جودت رائے انصاف دارد می گویند از چندے بصارت چشمانش اغماض عین نمودہ آں بیچارہ از دیدِ دنیائے زماں معطل می ساخت ؛؛

شورش نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی، تذکرۂ عشق ۱۲۳۰ھ میں مرتب ہوا ہے، تذکرہ کی مذکورہ بالا تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جنون زندہ تھے۔

گلزار ابراہیم مخطوطہ، مولفہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل میں ہے :

جنون تخلص، شاہ غلام مرتضیٰ نام، شاگرد مولوی محمد برکت مقیم الہ آباد سہسرامی درویش تھے، آخر ایام میں نابینا ہو گئے تھے،

عبدالغفور خاں بہادر نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں :-

جنون تخلص، شاہ غلام مرتضیٰ ساکن سہسرام شاد آباد شاگرد برکت

تری چشم مست سے ساقیا یہ سیاہ مست جنوں ہوا

گرے دو آتشہ طاق پہ جو دھری تھی یونہی دھری رہی

اب تفسیر مرتضوی کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

سورۂ والشمس وضحٰہا کی آیت قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا کا

ترجمہ اور تفسیر ؎

بے گماں ناجی ہوا جس نے کیا
پاک نفس اپنے کو از شرک و ریا

یا ہوا ناجی بحق و جسم خاک
نفس کو جس نے کیا توبہ سے پاک

اور کیا تعلیم اخلاق نکو
تا نہ ہو اوصاف بد کے زشت خو

بالیقیں وہ شخص بے بہرہ رہا
جس نے اپنے نفس کے تئیں گم کیا

لذتِ فسق و معاصی میں تمام
مست لایعقل رکھا ہر صبح و شام

یوں روایت ہے کہ حضرت مصطفٰے
جب یہ آیت پڑھتے، پڑھتے یہ دعا

اللھم آت نفسی تقوٰھا وزکّھا
انت خیر من زکّٰھا انت ولیھا ومولٰھا

کہتے ہیں سارے محقق بے خلاف
تزکیہ سے نفس کے دل ہووے صاف

سورۂ کوّرت، آیت واذا الموٴدۃ سئلت بای ذنب قتلت ؎

اور جس دن دختران خوش لقا
زندہ خاکِ گور میں جن کو کیا

پوچھے جاوینگے کہ ایسا کیا گناہ
تم ہی سے واں صادر ہوا ناشام و پگاہ

جس گنہ کے واسطے مارا تمھیں
جیتے ہی جی گور میں گاڑا تمھیں

تھی یہ عادت جاہلی قوم عرب
لڑکی ان کے گھر میں پیدا ہوتی جب

خوفِ درویشی سے یا از ننگ و عار
زندہ در گور اس کو کرتے نابکار

حدیث قدسی "قال اللہ تعالیٰ انفاسک اینیائی کا ترجمہ ؎

حق نے فرمایا ہے کو جی سے قبول
کہ تیرے انفاس ہیں میرے رسول

حدیث قدسی اذ تنفّست بذکری فقد احییت انبیائی ؎

جب تو میرے ذکر میں لیتا ہے دم — ان رسولوں کو جلاتا ہے ہم

حدیث " واذا تنفست بغیر ذکری فعلیک دیتی فاین دیتی ؎

جب تو دم مارے ہے بے یادِ خدا — قتل تو کرتا ہے میرے انبیا
پس ہے تجھ پر خوں بہائے انبیا — پس کہاں ہے پاس تیرے خوں بہا

سورہ والنازعات غرقاً

آیت واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ ؎

پس ولی ہے جس کے دل میں ترس و بیم — ہے مجھے پیش خدا ہونا مقیم
ہے کھڑا ہونا مجھے بہر حساب — اور خدا کو اپنے دینا ہے جواب
اور رکھا اس نفس کو باز از ہوا — یعنی حرص و آز سے مانع ہوا
پس ہے جنت بے گماں جائے پناہ — ہے وہ جائے عشرت و آرامگاہ
پیرو فرعون ہے وہ خیرہ سر — نفس جس کا ہے امام و راہ بر
پیرو موسیٰ ہیں وہ مرد خدا — کہ رکھیں ہیں نفس کو باز از ہوا
مذکور ہے از مردان ذی عقول — دیکھ لے لکھتا ہے یوں اہلِ فضول
سن لے یہ آیت ہے اسکے شان میں — کہ خلاف نفس ہو اس آن میں
ہو شب تنہائی در جائے پناہ — پاس ہو محبوب رشک مہر و ماہ
واں رہے خوف خدا سے اپنے باز — جنتی بے شک ہے وہ اہل نیاز
از خلاف نفس و از خوف خدا — اپنے تئیں اس جرم سے رکھے بچا
روح شاہ و جسم نفس اس کی کنیز — دل وزیر شاہ ہے لے با تمیز

جان ہوا جب نفس امارہ کا رام — شہ ہوا تب لونڈی کا غلام
مت کہا کر نفس کا اے باتمیز — مصر دل میں نہو گا جیوں یوسف عزیز
دل میں رکھ یک صاحب دل کا کلام — دل سے سن تیرے بہت آئیگا کام
کہتے ہیں بالغ اسے مردان خاص — کہ ہوائے نفس سے پائے خلاص
نہ ہے بالغ جو ہے پابند ہوا — گرچہ ہو جوں چرخ پیری سے دوتا
مت تعجب کر کہ بالنفس ردی — جمع ہو ریش سفید و امردی
یہ سنا تو نے حکیموں کا مقال — کہ بزرگی ہے بعقل و نہ بسال
مرد بوڑھا ہو حرص ہو ہے جوان — پیر نابالغ ہیں اکثر مردماں
دیکھا ہو گا حال اس تجار کا — شیخ سعدی نے گلستاں میں لکھا
آں شنیدستی کہ وقتے تاجرے — در بیابانے بیفتاد از خرے
گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور
خلق اطفال اند جز مست خدا — نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا
اہل دل نے یہ حدیث مصطفےٰ — سن کے اس کو صحیفۂ دل پہ لکھا

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بئس العبد عبد الھویٰ یضلہ

بد ہے بندہ دل میں وہ بندہ نفس کا — جس کو حرص و آز نے گمراہ کیا
کوئی عمل اے سالک راہ خدا — نہیں تجھے انفع بجز ترک ہوا

سورۂ والنازعات غرقاً

فنادیٰ فقال انا ربکم الاعلیٰ ۵

پس بلایا پس کہا یہ آشکار — میں تمہارا ہوں بڑا پروردگار

پوچھتے ہو جو بتوں کو روز و شب   ربِّ اعلیٰ میں ہوں اور ادنیٰ ہیں سب
یہ لطیفہ ہے لطائف میں لکھا   یہ سخن ابلیس نے جس دم سنا
اس طرح کہنے لگا وہ راہزن   کہ میں سن سکتا نہیں ہوں یہ سخن
یوں لگا کہنے دکھا کر پیچ و تاب   کہ مجھے نہ اس سخن سننے کی تاب
جو انا خیرٌ وہاں میں نے کہا   اتنے پر تو اس طرح راندہ گیا
ماری ہے یہ لاف جو وہ آشکار   دیکھئے کیا اس کا ہو انجامِ کار
منہ پہ پت چھوٹا اور یہ کلمہ بڑا   رسجم الاعلیٰ جو کہتا ہے بڑا
روز و شب کہتا ہے یہ بیٹھے کھڑے   دیکھئے اس کے اوپر کیسی پڑے

فاخذہ اللہ نکال الآخرۃ

پس اسے پکڑا خدا نے منتقیم   در عذابِ آخرت لے در جحیم
یعنی ڈالا اسکے تئیں بیقال و قیل   آتشِ دوزخ میں بعد از غرقِ نیل

والاولیٰ

اور نکالِ دنیوی ہے یہ عذاب   کر دیا دریا میں اول غرقِ آب
یا یہ دو کلمہ جو کہتا تھا عیاں   حق نے پکڑا در عذابِ دو جہاں
پہلے تو کہتا تھا وہ کافر دنیٰ   یعنی میں ہوں ربِّ اعلیٰ از منیٰ
بعد ازیں کہنے لگا وہ نابکار   کون ہے میرے سوا پروردگار
یعنی یوں کہتا تھا وہ گم کردہ راہ   قبطیوں سے ما لکم غیری الٰہ
اپنی فوج کو کہا کہ "ما علمت لکم من الٰہٍ غیری"
اے میرے بندو نہیں میں جانتا   کوئی تمھارا ہے خدا میرے سوا

شیخ رکن الدین تھے والاصفات — اس میں فرماتے ہیں کیا عالی نکات
ایک دن مجھ پر عجیب حالت ہوئی — روح میری سیر علوی کو گئی
دل میں آیا عالم علوی میں جا — دیکھئے احوال کچھ منصور کا
جب میں علیین میں پہنچا تیز گام — اس کو پایا میں نے در عالی مقام
حق سے کی میں یہ دعا اور التجا — ہو علانیہ کہ اس میں بھید ہے کیا
یعنی میں ہوں رب کہا مغرور نے — اور انا الحق ہے کہا منصور نے
ایک ہی قول دونوں کا ہے بے ریب — ایک پر ہو رحمت اور یک پر غضب
روح ہے فرعون کی سجین میں — اور ہے منصور علیین میں
حیف ہے جباری لے پروردگار — جبر میں بندوں کا ہے کیا اختیار
اختیار بندہ کہتے ہیں غلط — یہاں تو ہے جبار جباری فقط
او وہیں گوش دل میں آئی یہ ندا — جان از خود رفتہ پر القا ہوا
تھی انا فرعون کی ظلمت فزا — کیونکہ خود بیں تھا نہ بینائی خدا
نور تھا چشم خود بیں سے نہاں — چشم خود بین میں خدا بینی کہاں
وہ خودی سے اپنے تئیں کہتا تھا رب — اس لیے میں نے کیا اس پر غضب
تھی انا منصور کی میری انا — کیونکہ تھا وہ پیش حق میں فنا
جب ہوا منصور خالی از خودی — نور حق سے بھر گیا وہ جسدی
رنگ سے جب پاک ہے آئینہ صفا — تو انا الشمس اس کو کہنا ہے بجا
دیدۂ منصور تھا بینا بحق — لے گیا فرعون پر اسے سبق
دیدۂ فرعون تھا بینا بخود — ہو گیا وہ اسی خود بینی سے رد

اے جنوں تو نفی ؟ سے ۔۔۔ تا کہ ہو اثبات حق اس بات سے

رکھ تو ایک آئینہ پیش آفتاب ۔۔۔ دیکھ عکس مہر تاباں بے حجاب

ایک انا تیری ہے ایک حق کی انا ۔۔۔ اس انا کو اس انا میں کر فنا

ایک انا باطل ہے اس میں ایک حق ۔۔۔ جب کہ آیا حق ہوا باطل زہق

عمّ یتساءلون

اصل میں تھا عمّ عنہا اے پسر ۔۔۔ نون کیتی کر میم پھر ادغام کر

کر الف کو حذف سن معنی یہاں ۔۔۔ پوچھتے ہیں کس چیز سے یہ کافراں

آیت وجعلنا اللیل لباساً

اور ٹھہرایا ہے ہم نے رات کو ۔۔۔ پردۂ کار بد کار نکو

شیخ اکبر کے سخن پر کر تو میل ۔۔۔ معنی شب ہے پردۂ اصحاب لیل

شب ملاتی ہے انھوں کو یار سے ۔۔۔ کر کے پنہاں دیدۂ اغیار سے

تا کہ اُس خلوت میں ان کو باحبیب ۔۔۔ لذتِ دیدار ہوتی ہے نصیب

ہوتے ہیں محبوب جاں سے ہم کلام ۔۔۔ پیتے ہیں جام حضوری کو مدام

در خور احوال واستعداد خویش ۔۔۔ ہوتے ہیں برخوردار ہر درویش ریش

یہ سخن سن لے تو شیخ اسلام کا ۔۔۔ ہے یہ نکتہ سالکوں کے کام کا

یعنی شب ہے پردہ دار سالکاں ۔۔۔ پردہ پوش کاروبار عاشقاں

شب ہے پردۂ گریۂ عشاق کا ۔۔۔ شب ہے پردہ عاشق بیتاب کا

شب ہے پردہ دیدۂ بیخواب کا ۔۔۔ شب ہے پردہ عاشق بے تاب کا

شب دل عشاق کی ہے رازدار ۔۔۔ عاشق و معشوق کی ہے غمگسار

کہتے ہیں اہل وصال دوست سب ۔۔۔ کاشکے تا صبح قیامت رہتی شب

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

اس تلون کا برا ہو کیا تھا اور کیا بن گیا
ایک ایمانِ وفا، کفر سراپا بن گیا

ترجمانِ حالِ دل پانی کا قطرہ بن گیا
اک لرزتا اشک شکووں کا خلاصا بن گیا

آدمی انسان بنتا اور انساں جانتا
زہد سے تو یہ بزعم خود فرشتا بن گیا

غیر جانبدار رہتا یہ مرے حالات پر
وقت بھی منجملۂ اہلِ تماشا بن گیا

میری عرضِ شوق کی تفسیر ہائے رنگ رنگ
مدعا لفظ و بیاں سے اک معما بن گیا

اسکا شاہد طور بھی، عرش بریں بھی، دار بھی
آپ نے جیسا بنایا عشق ویسا بن گیا

ہم نے موڑی ہے کلائی گردشِ ایام کی
اور یہ کردار دنیا کو نمونا بن گیا

اس کو دنیا اور ما فیہا سے کچھ مطلب نہیں
جو بھری دنیا کو ٹھکرا کر تمھارا بن گیا

یوں بھی نظریں اٹھ نہ پاتیں احترامِ حسن سے
تابشِ جلوہ سے خود جلوہ ہی پردا بن گیا

اس کی جرأت پر نچھاور راحتِ کون و مکاں
جو ترے دردِ محبت کا شناسا بن گیا

حسن کی فطرت میں نرمی ہی نہیں گرمی بھی ہے
گاہ شبنم ہو گیا یہ گاہ شعلا بن گیا

جیتے جی تو حرفِ ناگفتہ تھا میں لیکن عروج
موت نے جادو جگایا تو صحیفہ بن گیا

غزل

از جناب سید رفیع الدین احمد صاحب سالک رحمانی

جس غم سے ہم کو منصب لوح و قلم ملے
یارب اگر ملے تو ہمیں ایسا غم ملے

سب بھول جاؤں آپ کے روضہ کے سامنے
میری نوائے شوق کو باب حرم ملے

ہر منزل حیات تھی اپنا ہی نقش غم
ہر اک قدم پہ اپنے ہی نقش قدم ملے

جو پیچ و خم ہیں آج ہمارے مزاج میں
ایسے نہ راستوں میں کہیں پیچ و خم ملے

ان آنسوؤں کا دیکھنے والا کوئی تو ہو
جن آنسوؤں سے دامن پندار نم ملے

مہر و وفا کے نام سے کھاتے تھے جو قسم
وہ بھی اسیر شیوۂ جور و ستم ملے

وہ ہنس دیے کہ دولت کونین بخش دی
یوں بھی کبھی کبھی ہمیں اہل کرم ملے

اک آدمی جو بزم سرور و نشاط میں
ملتا تھا گاہ گاہ مگر اب تو کم ملے

سالک ہم اس مقام کی عظمت کو کیا کہیں
اس کی گلی میں آج تو شیخ حرم ملے

غزل

از جناب اسلم سندیلوی

کشادہ اتنا ہی چاک گریباں ہوتا جاتا ہے
فراواں جس قدر شوق فراواں ہوتا جاتا ہے

سوا ہر لحظہ ہوتی جاتی ہیں بیتابیاں دل کی
الٰہی خیر۔ ساحل نذر طوفاں ہوتا جاتا ہے

سحر سے دونوں وابستہ ہیں گل بھی اور شبنم بھی
یہ گریاں ہوتی جاتی ہے وہ خنداں ہوتا جاتا ہے

نگاہوں سے حجابات مجازی اٹھتے جاتے ہیں
دلوں پر منکشف راز گلستاں ہوتا جاتا ہے

سوا کچھ اتنی ہی ہوتی ہیں اسلم رحمتیں اس کی
کشادہ جتنا امیدوں کا دامن ہوتا جاتا ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

سید امیر علی ۔ مرتبہ جناب شاہد حسین صاحب رزاقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت ہشہ، پتہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، پاکستان۔

جسٹس سید امیر علی مرحوم نے انیسویں صدی کے مسلمانوں کی علمی وفکری، تہذیبی و معاشرتی اور قومی وسیاسی بیداری میں بڑا حصہ لیا، اور انگریزی زبان میں متعدد وبلند پایہ کتابیں لکھیں، جن میں یورپ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے لائق رکن جناب شاہد حسین رزاقی نے سید امیر علی کے خود نوشت حالات اور دوسری تصنیفات کی مدد سے یہ سوانح عمری مرتب کی ہے، جو تین حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں ان کے خاندانی حالات تعلیم، بنگال ہائی کورٹ میں پریکٹس اور انگلستان میں قیام وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرا حصہ ان کی قومی وسیاسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان کے عام امور ومسائل خصوصاً ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے اہم مسائل اور تحریکوں سے متعلق ان کی خدمات اور کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے، آخری حصہ میں ان کی دینی وعلمی خدمات کا بیان ہے۔ اس سلسلہ میں عورتوں کے حقوق، تعدد ازدواج، طلاق، غلامی اور غیر مسلموں سے رواداری وغیرہ کے متعلق اسلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جوابات اور مسلمانوں کی جدید تعلیم، اس کے اداروں اور تعلیم نسواں کی ضرورت

واہمیت اور رائج الوقت نظامِ تعلیم کے نقائص وغیرہ کے متعلق امیر علی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے، اور ان کی تصنیفات و مقالات کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے، آخر میں ان کے ان خطوط و مراسلات کی فہرست ہے، جو لندن کے بعض اخبارات میں ہندوستانی مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کے مفاد کے بارے میں لکھے تھے، یہ کتاب سید امیر علی کے حالات و سوانح، افکار و خیالات اور خدمات و کمالات کا مرقع ہے اور اس سے ان کی قومی، وطنی اور مذہبی و ملی خدمات کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اس عہد کی قومی و سیاسی تاریخ کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ دلچسپ، پر از معلومات اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے، مگر امیر علی کے بعض مذہبی و سیاسی خیالات مثلاً پردہ، تعدد ازدواج، غلامی اور جداگانہ قومیت کے نظریہ سے عام مسلمانوں کو اتفاق نہیں تھا، مصنف نے ان کے ان خیالات کی صرف ترجمانی پر اکتفا کیا ہے، اور ان کو بغیر کسی نقد و تبصرہ کے نقل کر دیا ہے۔

ترجمۂ قرآن ۔ از مولانا حمید الدین فراہیؒ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۲۰، قیمت عہ ۲ پیسے۔ پتے (۱) مکتبۃ الحسنات رام پور (یو۔پی) (۲) دار الحمید پھریہا ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ایک زمانہ میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنا چاہا تھا، مگر قرآن مجید سے متعلق دوسرے اہم کاموں نے اس کا موقع نہیں دیا، اس لیے وہ صرف آخر کے سوا پارے (سورۂ قیامہ تا ناس) کا ترجمہ کر سکے، عرصہ ہوا اس کا نمونہ دائرۂ حمیدیہ کے مرحوم مجلہ "الاصلاح" میں چھپا تھا، اور اب اس کے موجودہ ناظم مولانا بدر الدین اصلاحی نے جو مولانا فراہیؒ اور ان کی تصنیفات کے اداشناس اور گذشتہ

چند برسوں میں ان کی کئی مفید اور اہم قرآنی تصنیفات بڑے اہتمام سے شائع کرچکے ہیں، اس ترجمہ کو بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا، مگر ابن حمید صاحب نے ان کے اہتمام ونگرانی کے بغیر ہی اس کو چھاپا ہے، اس لیے اس میں ان کے مقدمہ کی کمی رہ گئی ہے نفس ترجمہ نہایت شستہ وشگفتہ، مختصر وبلیغ اور حشو و زوائد سے پاک ہے، ترجمہ سے پہلے فاضل مترجم نے قرآن کے ترجمہ کے متعلق مفید اور ضروری اصول بیان کیے ہیں، اور شروع میں انکے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک مضمون درج ہے، جو مولانا فراہی کے حالات وسوانح اور اوصاف وکمالات کا مرقع ہے، طلبۂ قرآن کو اس ترجمہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

دعوت مسلم یونیورسٹی نمبر۔ مرتبہ جناب محمد مسلم صاحب، اخباری سائز، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۶۸، قیمت عہ، پتہ دفتر روزنامہ دعوت، دہلی۔

مسلمانان ہند کے مشہور تعلیمی وتہذیبی ادارہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے ایکٹ سے سارے ملک میں جو اضطراب برپا ہے، یہ نمبر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں یونیورسٹی کے آغاز سے اب تک کے حالات وکوائف کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے قیام کی غرض وغایت اس کے بانیوں اور ذمہ داروں کے عزائم ومنصوبے اور اسکی گذشتہ روایات وخصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور ۱۹۲۰ء کا ایکٹ جب اس نے باقاعدہ یونیورسٹی کی شکل اختیار کی اور ۱۹۷۲ء کا نیا ایکٹ درج کرکے دونوں کا فرق اور موخر الذکر کے خلاف مسلمانوں اور ملک کی سیکولر وترقی پسند جماعتوں کے احتجاج وتشویش کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے، اور ۱۹۶۵ء کے عارضی آرڈیننس سے پیدا ہونے والی غیر اطمینانی حالت کے بارہ میں مسلمانوں کی اہم جماعتوں کی قراردادیں، اکابر کے بیانات اور اخباروں کے تاثرات کے علاوہ خود حکومت کی مقرر کردہ کمیٹیوں کی سفارشات اور تجویزیں بھی درج کی گئی ہیں۔

یہ نمبر مسلم یونیورسٹی کی گذشتہ تاریخ و روایات اور مقاصد و خصوصیات وغیرہ کے متعلق معلومات افزا مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک قیمتی دستاویز ہے، اور اس سے یونیورسٹی کے بارہ میں حکومت کے موجودہ موقف کا غلط، غیر آئینی، حکومت کی اپنی مقررہ کمیٹیوں کی سفارشات، اس کی ابتک کی یقین دہانیوں اور ۲۰۰۴ء کے کانگریس کے انتخابی منشور کے سراسر خلاف ہونا اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

ندائے ملت جائزہ نمبر۔ مرتبہ جناب محمد عبد القدوس، حکیم عبد القوی، نور عظیم ندوی و نذر الحفیظ ندوی صاحبان، بڑا اخباری سائز، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۰۰، قیمت ۱۰؍، پتہ دفتر ندائے ملت، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

ہفت روزہ ندائے ملت کو خاص نمبروں کی وجہ سے بھی شہرت و امتیاز حاصل ہے، اس سال اس نے آزادی کے جشن سیمیں کے موقع پر یہ ضخیم نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان حالات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، جن سے آزادی کے بعد عموماً پورا ملک اور خصوصاً مسلمان دوچار ہیں، یہ نمبر تین درجن مفید اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین خوش سلیقگی سے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں "ذکر دار و رسن" کے زیر عنوان آزادی کی جد و جہد کی مختصر سرگذشت، اس میں مسلمانوں کا حصہ اور ان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں، "روداد چمن" کے عنوان سے ہندوستان کے آئین و جمہوریت کی خصوصیت وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد جمہوریت کو لاحق خطرات، مسلمانوں کے آلام و مصائب، ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی پسماندگی، اور ملک کی سیاسی و معاشی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے، "تعمیر نشیمن" کے عنوان سے مفید، حوصلہ افزا اور تعمیری مضامین درج ہیں نظموں اور طنزیہ مضامین کی چاشنی نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کے چند کابر رہنماؤں

اور اصحاب علم و قلم شلاً راجگوپال اچاریہ، جے پرکاش نرائن اچاریہ کرپلانی، ملراج مدھوک، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا محمد عثمان فارقلیط کے افکار و مضامین بھی ہیں، لیکن بعض مضامین میں لب و لہجہ جذباتی اور شکایت کا انداز تلخ ہے، گو حکومت سے مسلمانوں کی شکایتیں بجا ہیں، مگر ان کو خود بھی اپنے حالات و مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اس قطع نظر یہ نمبر ہر حیثیت سے قابل قدر ہے، ندائے ملت ملکی خصوصاً مسلمانوں کے مسائل پر بڑا جرأتمندانہ تبصرہ کرتا ہے، یہ نمبر خصوصیت سے اس کا نمونہ ہے، امید ہے کہ مسلمان اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور اکثریت کے سنجیدہ اور ذمہ دار لوگ بھی انصاف اور حقیقت پسندی سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

امریکہ کے کالے مسلمان ۔ از ڈاکٹر مشیر الحق صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۰، قیمت عہ، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

امریکہ کے تقریباً ۲ کروڑ حبشیوں میں عیسائیوں اور یہودیوں سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد ہے، ان میں سنی، شیعہ اور قادیانیوں کے علاوہ ایک بڑا اور منظم طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کالے مسلمان کہلاتے ہیں، ان کی تحریک مذہبی و دینی سے زیادہ قومی، سیاسی اور عالمی ہے، اردو خواں طبقہ کو ان کے بارہ میں بہت کم واقفیت ہے، اس لیے لائق مصنف نے اپنے کناڈا کے قیام کے دوران میں اور اس کے بعد انگریزی کتابوں کی مدد سے ان کالے مسلمانوں کے بارہ میں معلومات حاصل کرکے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں حسب ذیل پانچ ابواب ہیں:

(۱) کالی قومیت (۲) کالا ایمان (۳) کالا اسلام (۴) کالے لوگ (۵) کالا دیس۔

ان ابواب میں کالے مسلمانوں کے مخصوص عقائد و مزعومات، سیاسی و سماجی رجحانات، اور دوسری سرگرمیوں کے متعلق ان کی صحت و عدم صحت کا ذکر کیے بغیر جو معلومات حاصل ہوئے ہیں

ان کو قلمبند کر دیا گیا ہے، اردو میں امریکہ کے کالے مسلمانوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں اس لحاظ سے یہ کتاب بہت مفید ہے،

تین دیوانے - از جناب م، احمد ایم اے صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۹۲ قیمت عہ ۲۵ پیسے، پتہ الجمعیۃ بکڈپو، گلی قاسم جان، دہلی

اس مزاحیہ کتاب میں آزادی کے بعد کی سیاسی و اخلاقی حالت اور ملک میں ہونے والے ان کے شرمناک فرقہ وارانہ فسادات کا خاکہ کھینچا گیا ہے، اس سے سرکاری محکموں کی بدعنوانی، رشوت دفتری کاموں سے لاپروائی، حکام اور پولیس کی فرض ناشناسی، اور سیاستدانوں اور حکام کی ذاتی نفع اندوزی اور منافقانہ کردار وغیرہ کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، چند مضامین میں پاکستان کی ابتر سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حالت کی عکاسی بھی کی گئی ہے، آخر میں فسادات سے تباہ حال اور خانماں برباد لوگوں کے ہمت وحوصلہ کو بڑھانے والے چند مضامین دیے گئے ہیں، یہ کتاب گو زمانہ سازی اور مصلحت کیشی سے ناواقف سچے محب قوم و وطن تین دیوانوں کی باہمی گفتگو پر مشتمل ہے، مگر یہ دراصل ملک کے ابتر حالات پر بلیغ اور معنی خیز تبصرہ ہے، کاش ''فرزانے'' بھی اس پر توجہ دیتے۔

چلم نامہ - از جناب محمد یوسف صاحب پاپا، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۸ قیمت عہ پتہ اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جناب محمد یوسف پاپا استاد فزکس جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کو سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی شاعری کا ذوق ہے، چلم نامہ انکی طنزیہ شاعری کا نمونہ ہے، اس میں ان لوگوں کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے جن کی عزت وشہرت اور وجاہت واعزاز خوشامد اور تملق کا رہین منت ہوتا ہے، یہ مجموعہ سماج کے نااہل اور خوشامدی لوگوں پر ایک گہرا طنز اور پاپا صاحب کی دوربینی اور انکے مشاہدہ کی وسعت وگہرائی کا نتیجہ ہے، شروع میں اردو کے مشہور مزاحیہ نگار شاعر و ادیب جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے شاعر اور اسکے کلام کا دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں تعارف کرایا ہے، (ض)